آدمی غنیمت ہے

سید انیس شاہ جیلانی

جیلانی
آباد

محترم

"آدمی غنیمت ہے" حاضر ہے "خالی جگہوں کو پُر" کر دیا گیا ہے،

اسے کام میں لانے کے بعد ذیل کے پتے پر بھجوا دیجئے گا،

۳/مارچ دو ہزار چودہ

Letter of Anis Shah Jeelani
to Rashid Ashraf
Dated: 3 March, 2014

مبا

سیّد انیس شاہ جیلانی
محمد آباد تحصیل صادق آباد

برادرم راشد اشرف صاحب زاد لطفہٗ

"سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان" کی کتابت کی غلطیاں میں نے ٹھیک کر دی ہیں۔ اب آپ اس کی نقل یا عکس دوبارہ تیار کریں، وہ کیا سکین کرنا کہتے ہیں یا کیا کہتے ہیں، یہ کتاب ہمارے ادارے "مبارک اردو لائبریری" کی طرف سے شائع ہوئی مالی تعاون ضیاء اللہ کھوکھر صاحب نے کیا تھا۔ فکشن ہاؤس پر برائے فروخت رکھوا دی گئی تھی اور بس۔ آپ اسے جس طرح استعمال میں لائیں آپ کو اجازت ہے۔ فروغ کتب میں آپ کی کوشش بار آور ہوگی ان شاء اللہ

اندرون سرورق کو بھی استعمال میں لائیے گا

خاکسار

انیس

۱۷ اپریل دو ہزار تیرہ

مبارک اردو لائبریری
کیتے ہتھیکی کرینداپیاں
نیازمند
۲۶ / ۱۹۹۹

آدمی غنیمت ہے

مرتبہ

سیّد انیس شاہ جیلانی

یکے از مطبوعات
مبارک اردو لائبریری
محمد آباد تحصیل صادق آباد
پاکستان

یکے از مطبوعات

مُبارک اُردو لائبریری

محمد آباد تحصیل صادق آباد

طبع اوّل ——— جنوری ۱۹۹۴ء ۔ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ

تعداد ——— ایک ہزار

مطبع ——— طاہر امان پرنٹنگ پریس نزد گورنمنٹ ہائی سکول خانپور

کاتب ——— اسحاق فیصل آباد

باہتمام ——— منیر احمد دھریجہ قادری چشتی صابری

طاہر امان پرنٹنگ پریس خان پور

قیمت ——— پچاس روپے

اصحابِ تسلیم و رضا

عمرؓ کی حق گوئی نے کوئی ان کا دوست نہ باقی رکھا

حکیم الامت از عبدالماجد دریا بادی ص۲۰۴

اباّ مرحوم

سید مبارک شاہ جیلانی

کی رائے عالی

○ آپ کا مضمون غور سے مطالعہ کیا گیا بعض غیر متعلق باتیں بھی آگئی ہیں۔ لیکن یہ بہت کام کی ہیں۔ ان کو اسی حالت میں رہنا ضروری ہے۔

○ آپکا مضمون پختہ ہے لطف ادب سے خالی نہیں ایک دو جگہ میں نے لکیریں کھینچ دی ہیں۔

○ ان کی مزید صحت کی جائے ○ آپ نے مداحانہ لکھا ہے کیا مادحانہ صحیح ہے مداحانہ مادح مدح کرنے والے کو کہا جاتا ہے شائد آپکا لفظ بھی یہاں درست ہو لغت میں دیکھ لیجئے

وقت کے گذرنے کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ وقت اللہ تعالیٰ کے پاس واپس چلا گیا اور
وہیں سب ذخیرہ ہوتا جاتا ہے، حشر میں حکم ہوگا کہ وقت کی تجدید از سرِ نو ہو، بس
جب وقت آئے گا تو مافی الوقت کا بھی اعادہ بعینہٖ ہو جائے گا۔

اکبر الٰہ آبادی

انتساب کی بات

نچلی سطح کے لوگوں میں گھرے رہنا اچھا ہے، اسے برا کیوں کہیئے، ذرا بھنک آپکی ناسازی مزاج اور دماغ کی کیا پڑی کہ بس امڈ پڑیں گے، حشرات الارض اور اکثریت کا یہی تو خاصا ہے، یلغار کی سی کیفیت۔ دلجوئی اور بے لوث مزاج پرسی کا حق ادا کرنا کوئی ان سے سیکھے، کسی معزز مہمان کی آمد ہو تو مجھ سے زیادہ میزبانی کے شدائد اور لطف اٹھانے میں پیش پیش بلکہ بالکل ہی صدقے میں واری، بچا کھچا کھایا اور فیل مست، غریب فی الواقع امیر ہوتا ہے۔ متوکل، بے نیاز، دل و دماغ کا غنی بری اور جاں نثار، سادہ مخلص اور خوب غور کر لیجئے، بڑی قدر کرنے اور پہچاننے والا، آپکے وجود کی نفی نہ کرنے والا، رسمی صاحب سلامت سے معرا، ابن الوقت بھی نہیں ہوتا، معاشرتی اعتبار سے بھی میرا رہن سہن اور قارورہ انہی نیچ اور ہیچ و پوچ لوگوں سے ملتا ہے۔ میرے ہمدم اور دمساز ہیں یہ لوگ، جنہیں میرے ہونے کا پاس بھی ہے اقرار بھی اور احترام بھی، دکھ سکھ کے ساتھی، سچ مچ کے سچے ہمدرد میں طبعاً مسکین ہوں، مساکین کی برادری سے نکل کر ہنس کی چال کیونکر چلوں۔ کبوتر با کبوتر باز با باز مثل مشہور ہے اور وہ "اے اللہ مجھے مسکینوں میں سے اٹھانا۔

میری کچھ حرکتیں روش عام سے ہٹ کر ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے عیب و ثواب کے چرچے کوچہ و بازار میں کیوں ہوتے۔ میں زمانہ ساز ہوں، میں زمانے سے ساز باز رکھتا ہوں، یہی تو وہ ہنر ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ عام ملنے والے ہوں برسوں بلکہ پشتوں کے جاننے والے۔ بدظن خواہ کوئی ہو، میں نے اپنی صفائی بہت کم پیش کی ہے، مجھے یہ زعم ہے، میں تو جیسا ہوں اچھا ہوں۔ برا ہوں جہاں ہوں۔

وہ اِدھر اُدھر کی دور پار کی نہیں سامنے کی بات ہے، پھر کیسا رگڑا اور کیا جھگڑا ہے اپنے حال اور خصوصاً کھال میں مست رہتا ہوں۔ مجھ میں کیا خوبی ہے کیا خرابی ہے دشمنوں سے زیادہ زباں پہ یار و دوست اچھالتے ہیں، تجربے کی بات اور خدا لگتی تو یہی ہے، دوستوں سے بچ بچا کر ہی نکل جاؤ تو اچھا، مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، وہ مضمون کسی نے خوب لکھا تھا اور سچ سمجھ کر لکھا تھا بہتوں نے پڑھا ہوگا، دوستوں کا ظرف، کچھ سوکنوں سے ملتا جلتا تو نہیں یہ دشمن ہے وہ دوست اتنی تمیز تو آتے آتے آتی ہے اور اب تو خیر آئے گی ہی کیا، زبان سے اعتراف کون کرتا ہے لیکن اندر ہی اندر مسکوٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے کون کھیتوں کو سیراب کرتا پھر رہا ہے، کون بازار سے سودا سلف لا رہا ہے ٹریکٹر کی دیکھ بھال کیونکر ہو رہی ہے ہل بیلوں سے بھی چلائے جاتے ہیں، موٹر کا تیل پانی بیش و کم نہ ہو، دفتری معاملات کس طرح نپٹ رہے ہیں، جوتے کس طرح پالش کئے جاتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع بھی ایک فن ہے، تواضع زگردن فرازاں نکوست، سعدی کا معروف مصرع ہے یہ سب تماشے میرے سامنے ہوتے رہتے ہیں، یاران زیست کا مداح اور ثنا خواں نہ بنوں تو ضمیر کی خلش جینے کیونکر دیگی۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے بڑے لوگ ہیں جنکے دم قدم سے میرا اور میری سیادت اور شخصیت کا بت تراشا گیا ہے، اٹھ کے پانی پی لوں، تنکا دوہرا کر دوں کرسی جھاڑ دوں، یہ ممکن ہی نہیں حتیٰ کہ نسیم صبح جو چھو جائے تو میں سمجھتا ہوں کتاب کا رنگ ہو میلا، اس نازک مزاج صنف کی جھاڑ پھونک ترتیب و تہذیب سجانے سنوارنے میں بھی یہ ان پڑھ مجھ پڑھے لکھے کے محمد و معاون اور رقیب باصفا میرے چشم وابرو کے اشاروں پر اپنی بیٹھک کے احاطے ہی میں ناپے تو میلوں کا سفر روزانہ طے کرتے ہیں یہ رفیقان کار مال و دولت کی فراوانی کے آثار ہوتے تو بھی ایک بات تھی، دال روٹی اور کپڑے لتے کی حد تک آسودگی ماشاءاللہ خوب ہے۔ بس اس کے باوجود راحت آرام اور سکھ چین کی بانسری جو بج رہی ہے وہ سب کچھ مرہون منت میرے گمنام ساتھیوں اور چاہنے والوں کا ہے۔

میرے ہی گاؤں کا ایک چھ فٹ کا جوان سال تفاوتِ سن وسال کے باوجود میرے حلقۂ ارادت اور مہر و محبت اور فکر و عمل میں در آیا۔ شرفائے محمد آباد کی آنکھ کا شہتیر وہ سولہ

خادم حسین کوری



۱۹۷۷ء

ایبٹ آباد

اٹھارہ سال کی عمر ہی میں بن گیا تھا، جب جب سنے اس کی تحقیر اور تذلیل کے قصے سنے "گالی گلوچ طنز و استہزا کا نشانہ ہی رہی اسکی ذات' رفتہ رفتہ طمانچوں اور باقاعدہ گن کر سو سو جوتوں سے بھی اسکی درگت سرِراہ بنتے گاؤں والوں نے سادات کی بارگاہ میں دیکھی' چاقو چھریوں کا کھیل بھی اسکے مٹتے ہوئے چہرے پر کھیلا گیا لیں بھی کب پیچھے رہا' ایک مرحلے پر میں نے بھی دو ایک کوڑے اسکی پیٹھ پر برسائے وہ تو گھٹ کر رہ گیا' اسکی ماں کے' واویلے کو خاطر میں کون لاتا اور کیوں لاتا یہ سب کچھ تھا مگر اس "گم کردہ راہ" کی آنکھوں کی چمک' دمک اور چال ڈھال کا بانکپن جوں کا توں رہا اور یہاں رفتار و گفتار جبہ و دستار پر پہرے بٹھانے کی ذہنیت کارفرما' کوئی پستی کا حد سے گذرنا دیکھے' اسکی ذہنی ساخت میں تضحیک اور تذلیل کے یہ حربے بظاہر کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ کر سکے' وہ ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہوا بردوش نظر آیا آوارہ اور بے لگام' بے جا یورش سے ہٹ دھرم تو ہونا ہی تھا کسی کو خاطر میں نہ لانے والا اچکا سا، لترا، بڑبولا، ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جانا' اکثر فنون اور فنون فان حسن اسکی کمزوری اور اس پر جابرانہ تسلط کے من گھڑت دعوے اور دست درازیوں کے خیالی منصوبے' فاسقانہ وارفتگی میں بھی کہیں کہیں پیش پیش کھیل کود اور زور آزمائیوں میں بھی پیچھے پیچھے نہیں آگے آگے' رسوائیوں کا نہ اسے ڈر نہ خوف، گوشت اور چربی کہاں بس چوڑی ہڈی کے بل بوتے پر جسمانی تشدد کے ہر وار کو بزرگوں کی عمر رسیدگی کے حقوق اور جرم ضعیفی کی سزا جان کر جھیل جانا کھیل جانا "جرم" اور تعزیر کے اس دیہاتی مسئلے کو اس ناخواندہ نے احساس' شعور اور تاسف کی کسوٹی پر بھی میں جانتا ہوں کہ پرکھا۔

گاؤں کے ڈڈیرے اور پیر ڈڈیرے کا تو کہنا ہی کیا، کریلا اور نیم چڑھا، کوئی موقع ذوقِ حکمرانی کی تسکین کا یاروں نے کبھی ہاتھ سے جانے ہرگز نہیں دیا' اچھا ہو آدمی تو ایسا تو ہو ایک بے ضرر انسان کو جو معاشرتی اعتبار سے کسی شمار قطار میں نہ ہو' اپنی جھوٹی انا اور کھوکھلی امارت کا بھرم قائم رکھنے کیلئے گاؤں کی کنجینیوں کے کہے سنے اور لگائی بجھائی سے اپنا مدمقابل بنا لینا، سازش اور شقاوت کا دریچہ کھول دینا پیروں اور پیرزادوں کا سرمایہ فکر اور حاصل حیات ہے' ذہنی افلاس کی اس فراوانی میں ایک مفلس اور نادار کی یہ ثابت قدمی حیرت انگیز ہی رہی۔

سپاہی کی زندگی

جب میں گوالٹر گار میں رہا تو وہاں ایک خوب دیکھی
ایک کمرے میں پچیس آدمی رہتے تھے تو اُن کا حال یہ تھا
کہ کمرے میں روٹی بھی کھاتے تھے تو اسی کمرے میں پاخانہ اور
پیشاب وہاں کرتے تھے خدا جانے وہاں کیسے لوگ رہتے ہیں
مجھ جیسے خادم حسین کوری

22-8-84
محمد آباد

گاؤں کا سردار اور آبادی ایک کنبہ ہی تو ہوتا ہے۔ اس چھوکرے نے کمال توصلہ مندی سے سب مظالم کو اسی ذہن اور قبائلانہ پس منظر میں لیا اور دل بس یونہی سامیلا کر کے اپنے آپ میں مگن رہنے میں کوشاں رہا۔ ذلت اور خواری کو ظلمت کی تاریکیوں میں شمار کیا روگ نہ بننے دیا، اس گھٹی گھٹی سی متعفن فضاؤں سے دور نکل جانے ٹل جانے کی پہلی کوشش میرے موضوع نے کی تو تھی، فوج میں بھرتی ہوا، پریڈ اور فوجی رہن سہن کی صعوبتوں کو برداشت کیا، فوجی صوبیداروں کے ٹھڈے اور "کوارٹر گارڈ" کے بھگتان بھگتے، زمانے بھر کی سخت کوشیوں کو تو وہ خاطر میں نہ لایا، لیکن خدائی فوجداروں نے بہن بیوی پر زبان دراز اور دست اندازی کی ٹھانی تو وہ دل ہار بیٹھا قلب کی سیاہیوں اور نیتوں کے ایسے فتور اس نے سنے تھے دیکھنے کی تاب کہاں سے لاتا، اس نے اپنے مولد اور مسکن اپنے گاؤں محمد آباد کو لاکھ میں نے روکا خیرباد کہہ کر ہی دم لیا، اب وہ اپنے دادا پردادا کے ویرانوں میں کوٹ سبزل جا آباد ہوا ہے، کہتا ہے وہاں جا کر عزت نفس اور اپنے گھر اپنے در کا علم ہوا، اس کی ہر بات بقول میر تقی میر اک مقام سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہے،

گاہے بن بلائے گاہے بیگار میں، کبھی کسی ضرورت کے تحت وہ آتا رہا جاتا رہا اس کا غیر مرئی وجود اپنا رنگ دکھاتا اور جماتا رہا، میں نے اس کی خودسری میں بغاوت کا عنصر قریب کا مطالعہ یہ ہے کہ کم اور مدافعت کا مادہ زیادہ شمار کیا، اجڈ اور گنوار وہ نشست و برخاست کی حد تک بھی نہیں پایا گیا، محض نام کا گنوار، سرشت میں عجز و نیاز، غیرت و حمیت شیفتگی اور شرافت کی آمیزش کم نہیں بہت زیادہ پائی گئی، اور اب وہ میرا چلی ہوئی اصطلاح میں دست و بازو ہے جو ہر کھلتے جاتے ہیں، خمیر میں اس کے بھولپن سادگی و ہوشیاری فروتنی اور جاں نثاری انکسار اور دلیری جرأت بے باکی ایثار پیشگی سبھی کچھ گندھا ہوا ہے۔ میری چاکری جسمانی راحت روحانی تسکین کی بھینٹ تن من دھن بیوی بچے سبھی کچھ تیاگ رکھا ہے اس نے۔

لمحہ لمحہ تغیر پذیر حضرت انسان کا مطالعہ بھی ایک کائنات میں سما جانے کے مترادف ہے میں نے ایک غزال وحشی کو زمانے اور زندگی کی یورش سے نبرد آزما رہتے اور

دامِ فریب میں الجھ کر جی جانے کا سلیقہ اور سوجھ بوجھ ہی کیوں نہ کہوں کہ بخشا ہے، اپنی نیٹر لو تجھ کو پرائی کیا پڑی ہے، یہ کلیہ اور یہی قاعدہ کلی طور پر نہ سہی جزوی اعتبار سے اپنا رکھا ہے اور اسی کا پرچارک ہوں میں تو، مجھے اس کی نادانیوں کے چرکے بھی شب و روز سہنا پڑے، اپنی شخصیت اور وقار تک کو داؤ پر لگے رہنے دیا۔ اصلاح حال اور رسم الفت کے تقاضوں اور دوئی کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے لیے کیا میں اتنا کچھ بھی نہ کرتا، جان جاتیے کہ امیر اور غریب پیر و فقیر محمود و ایاز محبت اور انسانیت کے لازوال رشتوں میں ایک ہیں۔ میری والہانہ سرخوشی اور اس کی خود فراموشی سے لبریز بود و باش ہی زندگی بھر کی کمائیوں میں سے ایک کمائی ہے، میں اس مجموعہ نگارش کو سعودی عرب کے لئے پر تولنے اور اپنے دل میں بسنے والے

. خادم حسین کوری

کے تعلق خاطر کی یادگار چھوڑے جاتا ہوں

انیس

ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ ہجری

۲۵ر اگست ۱۹۸۴ء عیسوی

محمد آباد تحصیل صادق آباد

سوا گیارہ شب

طومار

لکھنے لکھانے کا کسی کو وہم ہی کہاں تھا، ذوق و شوق اور دو دن کی لینا تو رہا ایک طرف میرے فرشتوں کے گمان میں ہو تو ہو، اپنا تو بس اتنا ہی مقدور رہا کیا کہ ناول پڑھ لئے افسانے سونگھ لیے، جاسوسی قصے کہانیاں چاٹ گئے، شبلی اور محمد حسین آزاد، غالب اور خصوصاً مولوی عبدالحق، مہدی افادی، سید سلیمان، ابوالکلام، رشید احمد صدیقی یہ سب خدا جانے کہاں کہاں سے گھستے چلے آئے نیاز فتحپوری تو گھر کی مرغی تھے ہی، ۱۹۲۵ء سے ابا کا ان سے سابقہ تھا، رہ گئے سرسید تو بھائی وہ سپاٹ تھے اور مصلح اور مسلح بھی بہت تھے، یونہی دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ دو تین سو صفحے کی ایک کتاب روزانہ پڑھی جائے گی، کچھ سمجھ میں آئے نہ آئے، پلے پڑے نہ پڑے، پڑھیں گے ضرور، فسانہ لندن مقدمہ ابن خلدون اور علی بلگرامی کی تمدن عرب اور دوسری تمدن، تمدن ہند وغیرہ بھی نظر سے گذر گئیں، ابا مرحوم کو یقین ہی نہیں آیا، کتب خانے کی چابیاں بڑے بڑے طوفان اٹھے تب ہمارے قبضے میں آئیں، اسد علی انوری کی قتیل اور غالب بھی کہیں ان پڑھ دیہاتی لڑکوں کے پڑھنے سمجھنے کی چیز کوئی بتائے کہ ہے، وہ بھی پڑھی گئی اور تعجب یہ ہے کہ جی کو لگی، اور دواوین کا تو پوچھنا ہی کیا، حالی غالب اقبال تو گھسے پٹے لوگ اور گھسی پٹی چیزیں ہیں، ہم نے میر تقی میر، میر مہدی مجروح، جان صاحب، یگانہ ولی دکنی، امیر مینائی، مظہر جانجاناں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کس کس کے انتخاب کر ڈالے، اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" آج تک نہیں بھولتی، کیا رگ جاں سے قریب کا شاعر تھا۔ آزاد شاعری سے خود انگریز بہادر تک نالاں ہے۔ ہم

کیوں نہ ہوتے، ہمیں کسی باؤلے کتّے نے تھوڑی کاٹا ہے، نسیم حجازی کے ناول اپنے گذشتہ کارناموں کی حسرتوں کا ماتم تو ہیں لیکن نوعمروں کی حمیت کو تقویت پہنچائے بغیر نہیں رہتے، یہ بھی کھُلا کہ نسیمؔ حجازی کے ہاں یکسانی بہت ہے، امراؤ جان ادا پر تبصرے اور تعریفیں تو بعد میں پڑھے کتاب دل میں اسی وقت اتر گئی تھی، زمانہ وہی اچھا تھا کتابیں پڑھ کر خالص اپنی رائے قائم کی جاتی تھی، تبصرے پڑھ کر کتابیں خریدنا اور پڑھنا یہ تو ہمیں اب آیا۔ منٹوؔ کا بُرا ہو نیندیں اس نے بھی حرام کر دیں، لیکن آگے چل کر معلوم ہوا تاثراتی افسانہ کسے کہتے ہیں، غلام عباس کا اوورکوٹ پڑھ کر حزن و ملال کا پیکر بن گیا تھا میں تو اچھی غزل' کافی' دوہا مجھے دل گرفتہ اور کہیں کہیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں' المیہ ڈرامے افسردگی خاطر کا سبب بنتے ہیں، میں بے حد رقیق القلب واقع ہوا ہوں، اوورکوٹ جیسی کہانیاں پڑھنے والے پر طاری ہو کر مسلط ہو جاتی ہیں، قلم پر گرفت ہو تو ایسی ہو، رئیس احمد جعفری اور ایم اسلم نے جتنے طومار باندھے تازہ بہ تازہ ہاتھ کے ہاتھ کہہ سکتا ہوں کہ سبھی ناول پڑھ ڈالے دت بھارتی، نسیم انہونوی اور وہی دہانوی کے پردے میں شوکت تھانوی کے لذت خیز جنسی تگڈم' ایک منصوبہ کچے ذہنوں اور اٹھتی جوانیوں کو خستہ اور خراب کرنے کا وہ بھی تھا' ہم نے بھی مزے لوٹے' لذتوں کو سمیٹا، اپنے ہی ہاتھوں صحتوں کو تباہ و برباد کیا، تیرتھ رام فیروزپوری کو خدا بخش ہی دے، کیا سلیقے سے ترجمے کئے ہیں، انگریزی جاسوسی ناولوں کے، شرلک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن اردو کردار بنا کے چھوڑے' ہمارے ہاں انکا ذکر ہی نہیں آتا اب تو کسی کی زبان اور قلم پر اور وہ ابن صفی کی فریدی حمیدی سیریز بھی بہت چلی، خوب پھلی اچھی خاصی پھولی۔

دھوم صرف غالب کے خطوں اور ابوالکلام کی غبار خاطر کی مچی ہوئی' ابوالکلام ثقیل بہت تھے، غالب بڑی آسانی سے ہضم کئے گئے، شبلی نعمانی کا معاملہ واقعہ تھا اس لئے ان کے خطوط اردو زبان کا زیور کہلائے' ایک انکشاف دبیر حسین رضوی نے حال ہی میں یہ کیا ہے، عطیہ فیضی کے فریب خوردہ تنہا شبلی اقبال اور ابوالکلام ہی نہیں تھے نیاز فتحپوری بھی تھے، روزنامہ انقلاب لاہور کا گھر میں آنا اور کڑوے تیل کے دیئے کی ٹمٹماتی ہوئی لو میں

پڑھنا بھی یاد ہے، ظفر علی خاں کے زمیندار کے پرچے بھی محمد آباد کے ویرانوں میں پائے جاتے تھے۔ اب تو روزنامہ جنگ کراچی گلے کا ہار بن چکا ہے، پورے تیئس سال کے پلندے انبار کے انبار میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں، جس طرح بلاناغہ چھپ کر آتا ہے بلاناغہ محفوظ بھی کر دیا جاتا ہے، سعدی کی گلستان بوستان سبقاً سبقاً پڑھ کر بھلا دی، اب ترجموں سے کام چلاتا ہوں، خواجہ شیراز کی غزلیں استاذی مولوی قادر بخش دل پر افتاد پڑی تھی ایک زمانے میں تو گنگنایا نہیں گایا کرتے تھے، کیا پرسوز ترنم تھا، چند ایک مجھے بھی حفظ ہو گئیں، فردوسی اور رومی کو پڑھنے سمجھنے کیلئے وقت ہمت اور خصوصاً عقل چاہیئے۔

جس کا اپنے یہاں چنداں گزر نہیں، کچھ پڑھ ڈالو کچھ کر گذرو، ولولہ اٹھا ہی تھا کہ ناگہاں بیمار پڑے، ایسے ویسے نہیں خوب اچھے خاصے تگڑے بیمار، امیرانہ مرض غریبی میں تپ دق مفلسی میں آتا گیلا ماں باپ بہنوں اور بیوی کے ہوش کیا اڑتے اپنی جان بھی نکل گئی، جیتے رہنے کا خیال آیا، زندگی کا احساس پہلی بار ہوا، سانس سینے میں نہ سماتے، خون تھوکنا پڑا۔ جب ہوا و ہوس کا قحط شدید پڑا تب جا کر کہیں یاراں فراموش کردند عشق تک بات پہنچی جانثاری کے دعوے باطل ہوئے، اپنی ہی جان کے لالے پڑ گئے، تو خدا اور اعادہ صحت یاد آیا، مئی جون کی گرمی اور پورے پانچ مہینے پلنگ کی پٹی سے لگے بلکہ چپکے رہنا کچھ کھیل نہ تھا، تیمارداروں کے لیے آزمائش، خدا ابا مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی کا بھلا اور غریق رحمت کرے، بجلی اور بجلی کے پنکھوں وغیرہ کی کمی کو خس کی ٹٹیوں سے پورا کر دیا، صبر و ضبط کی کشاکش نے روح کو پامال نہیں تو نڈھال ضرور کر دیا تھا، جسم کو توانائی بخشی گئی، صبح کرنا شام کا واقعی جوئے شیر لانے سے کیا کم تھا، صبح کے اوقات تو اڑدس پڑوس کی بچیوں کو پڑھانے میں صرف کیئے جاتے، باقی پہاڑ سے دن اور ہجر کی راتیں مطالعے اور مکتوب نویسی کے حوالے ہوئے، خط نویسی بھی مرض بن کر چمٹ گئی، یاروں نے یہ کہہ کر اور گویا قلم کو گویائی دی کہ میں نے ایک انداز پیدا کر لیا ہے خط گھسیٹنے میں، خط میں نے طرح طرح کے بے شمار لکھے ہیں، ادبی تو قطعاً نہیں، ذاتی قسم کے خط، ویسے سیاسی مذہبی نہیں نیم مذہبی خط لکھے عاشقانہ بھی بے حد و حساب۔ اسی کا ہم قافیہ فاسقانہ

بھی ہے، جنسیات پر میرے خطوط کا گڈ کا گڈ میرے ہی ہاتھوں آتش رسید ہوا۔ اس
کا ملال ہے اب تک، وہ بلا شبہ معرکے کی چیز تھی مگر ایک یونہی سی بے معنی سی خلش
نے سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا، شوق کی بلندیوں اور ہمتوں کی پستی کا عجیب و
غریب مرقع تھا وہ۔

مطالعے کی لت کچھ ایسی بڑھی کہ بات رفتہ رفتہ خدا رسول قرآن تک بھی پہنچی، عربی یہاں
کون جانتا ہے، ترجمہ اور تفسیر سے کام چل ہی جاتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ سب سے مزے
کی کتاب قرآن ہی ہے، لگی لپٹی رکھے بغیر اگر کسی نے لکھا ہے تو کاتب تقدیر نے، کوئی
تکلف کوئی تصنع نہیں، درخت کو پلنگ اور کرسی کو جھاڑ نہیں بتایا گیا، حتیٰ کہ انسانی
اعضاء کے نام تک بلا تامل نقل ہوئے ہیں، پاکستانی اگر بے خیالی میں بھی ایک بار پڑھ
ڈالے تو مسلمان ہو جاتے، پوری انسانی تہذیب و ثقافت ہی نہیں تاریخ بھی بھری
پڑی ہے، زندگی کرنے کے گُر الگ یہ کتاب حرف آخر ہے، یہ میرا ایمان ہے، پختہ۔

پہلے پہل میرا قلم حرکت میں مولوی عبدالحق کے نام سے آیا، برگ گل کا بابائے
اردو نمبر دیکھ کر باسی تو نہیں تازہ کڑھی میں ابال کچھ ایسا آیا کہ مرحوم کے اپنے نام آنے والے
چار خطوں کی آڑ لے کر ادھر اُدھر کے مواد کا ردا جما ایک مضمون سا تیار کر دیا۔ خاکہ چیز
دیگرے است، میں تو اسے مضمون ہی کہتا ہوں، طرفہ یہ کہ وہ نیاز فتحپوری کی نگاہوں
میں جچ کر نگار میں چھپا بھی، شورش کاشمیری نے نگار سے حوالہ دیئے بغیر اپنے ہفت روزہ
چٹان میں نقل کیا، داد دلی سے نثار احمد فاروقی نے بھی دی، یہ ان کی ادیبانہ سخاوت
کے علاوہ یہ بھی تھا کہ دیدہ دلیری اور دیدہ ریزی سے مولوی عبدالحق کی خشونت مزاج
کے قصے اس سے پہلے ادھر اُدھر یہاں وہاں بیان اور نقل تو ہوتے رہے، یکجا میں نے
کر دیئے میں نے مولوی صاحب کے مذہبی مسلک پر بھی لکھا تھا، وہ نہیں چھپا۔
مضمون آرائی کے لیے میرے پاس کیا رکھا تھا، البتہ مختلف چیزیں نظر سے
گزرتی رہیں، نقوش کے شخصیات نمبر وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں، شخصیت نگاری
کا سلسلہ نیا نہیں، اچھا بھلا پرانا ہے، بہت دنوں سے چلا آ رہا ہے۔ ڈاکٹر شاہ

علی نے اردو میں سوانح نگاری عنوان باندھ کر کتاب چھپوا ڈالی اردو میں خاکہ نگاری کی جگہ خالی پڑی ہے، نذیر احمد کی کہانی ۱۹۴۴ء میں ابا نے خریدی، میرے کتب خانے میں محفوظ اور موجود، اقتباس اس کے اُن کے مضامین میں نظر انداز ہوتے رہے، پورا خاکہ درجن بھر خاکے خود لکھ لیے تو پڑھا اور محظوظ ہوا، یہ تو سب کچھ تھا اور ہے لیکن عصمت چغتائی کا دوزخی جسے بد قسمتی سے رشید احمد صدیقی نزاکت مزاج کی جھونجھ میں ناپسند کر چکے ہیں پڑھ کر کچھ کچھ میرا دھیان خاکہ اور خاکہ نگاری کی طرف گیا جائزہ اور ذرا گہری نظر سے لیتا ہوں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بھرپور احساس خاکہ نگاری اور خاکے کا دوزخی ہی پڑھ کر ہوا، ویسے مجھے خاکہ نگاری کا لطف سب سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ کس کے ہاں آیا، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، مولانا ئے دریاباد اشرف صبوحی، محمد طفیل نقوش، اخلاق احمد دہلوی، عبدالمجید سالک، نظیر صدیقی، لالہ دولت داس شعلہ، جلیل قدوائی، جس کو جہاں پایا دبوچ لیا، پڑھے بغیر نہ چھوڑا۔

خاکہ کیا ہے اپنے یہاں سبھی کہتے ہیں یہ ولائتی مال ہے سات سمندر پار سے سفر کرتا ہوا آیا ہے، یہ رسم عام بھی ہے، ہر اچھی چیز پر مغرب کی مہر ہمی آپ لگا دیتے ہیں، اچھائیاں ہم میں بھی تھیں، انہیں اجاگر کرنا تو کجا الٹا شرماتے ہوئے ملتے ہیں یاران طریقت، محمد الدین جو ہر مصر ہیں انگریزی ہی سے ذہن کھلتا اور چودہ طبق روشن ہوتے ہیں، انگریزی ثقافت پناہ اور عزت مآب ہے۔ اس میں کیا شک ہے، موجدوں کی زبان ہے وہی ترقی یافتہ بھی ہو گی مالدار بھی، سنا ہے روسی اور ایک ارب چینی بھی انگریز اور انگریزی ہی کا مطیع اور فرمانبردار ہے یہ سب کچھ ہے، لیکن دلنشین اور دلپذیر اور رہزن ہوش و ایمان ہونا دوسری چیز ہے۔ اردو کی ہندی برج بھاشا کے علاوہ عربی فارسی سے بھی آشنائی ہے۔ اس کے لوچ اور بانکپن کے کیا کہنے، دل میں کھبی جاتی ہے کوئی کیسے نظروں سے گرا دے دل سے نکال دے، یہ علیحدہ بحث ہے، نجانے سعدی شیرازی کو کیا گھوٹ کر پلایا گیا تھا، انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود ایسا کچھ بک گیا جس کا کوئی جواب نہیں، علم و ادب کی حد تک تو روا ہونا ہی چاہیئے، تہذیب و ثقافت کے طور پر اپنا لیا انگریزی کو یہ کیا ہوا۔

خاکے کی مختصراً تعریف یہ ہونی چاہیئے کہ لفظوں کے سہارے کسی چلتی پھرتی شخصیت میں صفحۂ قرطاس پر جان ڈال دینا، یہ کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ہے، بے حد مشکل اور دار و رسن کی آزمائش والی بات ہے، خاکہ اچھا لکھا گیا، خاکہ کمزور پڑ گیا، ڈھیلا ڈھالا نظر آتا ہے، یہ سب منحصر شخصیت سے تعلق خاطر اور جان پہچان پر ہے برسوں کا ساتھی دغا دے جائے یہ بھی ہوتا ہے، گھنٹوں کی خصوصیت کھلی کتاب بن جائے، یہ بھی دیکھا ہے چہرے ہی نہیں رفتار و گفتار بھی فریب دے جاتے ہیں، فریب کھانا انسانی سرشت کا ایک خاصا بھی ہے، ظلم کمانے میں ایک کیفیت ہوگی لیکن جور و جفائے یار پر دل کو نگاہ نہ کرنے کی تلقین اور اپنی طرف سے ہوسکے جہاں تک نباہ کرنے کی ہدایت سے کرب ذات اذیت کوشی اور جفا پسندی کا لطف و قرار بہر حال ٹپک ہی پڑتا ہے، اردو خاکے کا مزاج کیا ہے مجھے اس سے بحث نہ یہ میرا منصب، تاہم اچھی اچھی پیاری پیاری اور روح فرسا اور دلآویز یادوں کو تھوڑا سا رائیگی کر دینے کا نام بھی خاکہ ہوسکتا ہے اور وہ صدیوں کا احاطہ کرنے والی زندگی کے مختصر ترین خاکے لکھنے والا تو خدا ہی ہے جس کا کام اسی کو ساجھے۔

خاکہ میرا محبوب اور مرغوب موضوع ہے پڑھنے کا جنون کم نہیں ہوتا خاکہ نگاری سے مجھے خاص شغف ہے، لکھ نہیں سکتا لیکن اٹکل پچو جوڑ جاڑ کر شہیدوں میں نام لکھوانے میں ہرج ہی کیا ہے، مجھے دعوئ سخنوری نہیں ہے، سنی سنائی باتوں کو ضبط تحریر میں لانا عیب نہیں ہنر ہے، راوی معتبر ہونا چاہیئے، خاکہ تاریخ کی کتاب نہیں ہوا کرتا جس میں جگہ جگہ حوالہ اور صفحہ نمبر حاشیے میں درج ہوتا رہے یہ اور بات کہ اقتباسی خرابی سے میرے لکھے ہوئے خاکے بھی لبریز ہیں، خاکہ اڑانا بھی تو ایک محاورہ ہے، اپنے یہاں تو سنی سنائی کیا مروت یہ ہے کہ آنکھوں دیکھی کو بھی لکھنے کی ہمت بہت کم پڑا کرتی ہے، یہ گویا ہمارا طرۂ امتیاز ہے، صاف گوئی کو عیب جوئی کہہ کر پہلو بچایا اور خاطر میں نہیں لایا جاتا، میں تو اپنی والی کوشش یہی کرتا ہوں جیسا جس کو پایا گھسیٹ دیا مرنے والے کی خوبیوں کو یاد کر داس کی بشری خامیوں کمزوریوں اور خرابیوں نے لاکھ معاشرتی فساد برپا کئے ہوں پی جاؤ۔

چرکین کا ذکر کھلے بندوں نہیں ہوگا۔ نجی محفلوں میں بزرگانِ ملت رفیع احمد خاں کو کیا کیا لطف سے گنگناتے ہیں، قلم کو ان کے ذکر سے آلودہ کیوں کروں یہ عام مزاج ہے، میں تو کھری کھری سننے سنانے کا قائل ہوں شخصیت خیر و شر کا مرقع اور مجموعہ اضداد نہ ہو یہ کیونکر ممکن ہے، میں نے خرابیوں کو شامل کرنے کی جستجو نہیں کی، چوریاں پکڑنے کا لطف بات میں بات نکلنے میں پایا گیا ہو تو اس کیلئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں جس کی تصویر کھینچتا ہوں وہ میں بھی تو ہو سکتا ہوں میں خود بھی بہت نظر آؤں گا، اسے آپ خود نمائی نہیں موضوع سے والہانہ ربط اور انکشاف ذات سے تعبیر اگر نہ کیجئے گا تو میرا ممدوح میرے پہلو سے نکل بھاگنے میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے میں اگر نہ ہوں گا تو کون ہوگا۔ آڑی ترچھی تصویریں وہ لوگ اتروا تے ہیں جن میں آئینے کے مقابل ہونے کا ظرف نہیں ہوتا، اسی لئے مجھے کتابی اور اترے ہوئے سیاہ چشموں والے چہرے زیادہ بھلے لگتے ہیں۔

لکھنے والے کا اپنا ایک ضمیر ہوتا ہے خمیر بھی، میں نے یہ خاکے بے ساختہ لکھے ہیں مُردوں کے کفن میں نے نہیں پھاڑے، تاہم ضرورت پڑے تو اس میں قباحت بھی کیا ہے، زندوں سے خوفزدہ میرا دل ہو سکتا ہے قلم گردن ناپنے میں بہت بیباک ہے، خدائی فوجدار بننا مجھے منظور نہیں، اس کے باوجود میں تو یہی کہوں گا جو کچھ کتابِ دل پر مرقوم ہے یہ اس کا پاسنگ بھی نہیں۔

انیس

۲۸ مئی سنہ ۱۹۸۴ء

سنہ ۱۴۰۴ھ

مریضِ غم کا قصۂ مختصر

خونِ دل ہوتا رہا خونِ جگر ہوتا رہا
یوں مریضِ غم کا قصۂ مختصر ہوتا رہا

برصغیر پاک وہند کی عظیم اکثریت یقیناً حیرت آشنا نہ رہی ہو گی بلکہ میں تو یہ کہوں گا بہت سے اہل قلم اہل علم بھی ایسے ملیں گے جنہیں بتانا پڑے گا کہ حیرت کیا تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے بہاولپور کے مشہور شاعر جناب محی الدین شان کو مجھے ایک ملاقات میں بتانا پڑا کہ دنیائے ادب کا ایک آفتاب نیاز فتحپوری بھی ہے اور "نگار" اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔ نیاز و نگار یک جان اور دو قالب رہے ہیں۔

حیرت خان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اب یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ کئی تھے یا کچھ اور، دادا میرٹھ سے ہجرت فرماتے شملہ ہوئے والد نے بھی شملہ ہی کو ترجیح دی، یہ شملے میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے ابتدائی تعلیم بھی شملے ہی میں حاصل کی، جس کی بسم اللہ قرآن مجید سے ہوئی، میٹرک کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیج دیئے گئے۔ جہاں سے بی اے کر کے نکلے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا لیکن والد نے یہ سن گن پا کر کالج سے اٹھا لیا کہ بیٹا علی برادران کی لپیٹ میں آ کر "خلافتی" ہو چلا ہے اور سیاسیات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ علی گڑھ کا وہ زمانہ قومی تحریکوں سے متاثر تو تھا ہی انکے ساتھ ساتھ بقول حیرت صباحتوں اور ملاحتوں کا زمانہ عشق نہیں خلل دماغ کا دور جسے وہ "خطرناک زمانہ" سے تعبیر کرتے ہیں واقعی دلچسپ رہا ہو گا اس لحاظ سے اور کہ فی الواقعی مستقبل کے معمار بھی اس زمانے میں زیر تعلیم تھے۔ رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ سے حیرت کی یاد اللہ کالج ہی سے چلی آ رہی تھی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

والد ملازمت سے پنشن حاصل کرنے کے بعد چھوٹا موٹا پانی اور جوتے کا کاروبار کرنے لگے، کالج سے فارغ ہونے کے بعد حیرت کچھ عرصے تک تو والد کا ہاتھ بٹاتے رہے لیکن چل نہیں سکے، کچہری شملہ میں ایک وکیل سے نتھی کر دیئے گئے یہ بھی ان کا میدان نہ تھا یہاں سے دامن جھاڑ کر نکلے ہیں تو فوجی اخبار شملہ میں "پروف ریڈر" ہو گئے یہ اخبار انگریزی میں چھپتا تھا، یہاں سے خاصی تگ و دو کے بعد مرکزی سکرٹریٹ دہلی میں ملازم ہو گئے مجلس دستور ساز میں ترجمان کے فرائض سر انجام دیئے، دفتر میں ایک شعبے کے ناظم بھی بنا دیئے گئے۔ اسد ملتانی، پرویز صاحب وغیرہ حیرت کے ساتھ ایک ہی میز پر مہینوں کام کرتے رہے ہیں۔

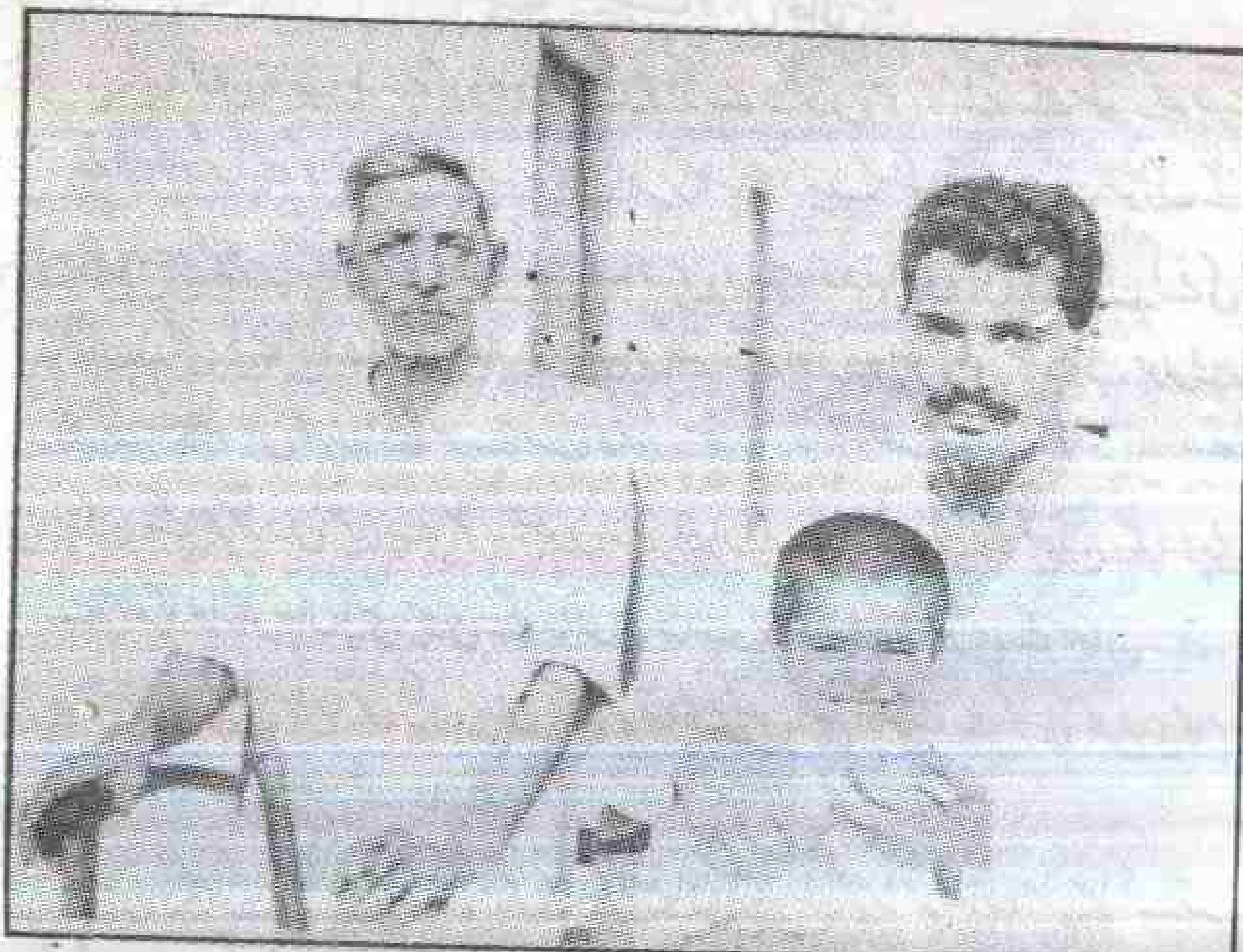
دلّی منتقل ہونے کے بعد خوشگوار زندگی کی بنیاد پڑتے ہی لگی تھی کہ آرزوؤں اور تمناؤں کا خون فالج نے کیا، یہ نہ تو فالج تھا اور نہ اسے فالج سے الگ کوئی مرض کہا جا سکتا تھا دلّی میں ایک سے ایک یا بقول عوام بڑا بڑا پڑا ہوا تھا لیکن کسی معالج کے دستِ شفا نے بگڑی بنا کے نہیں دی، بستر پر پڑے ہیں تو مرتے دم تک پڑے ہی رہے اور یہ مدت ایک دو نہیں پورے بیس برس کا احاطہ کرتی ہے۔ نچلے دھڑ میں دم نہیں رہا تھا، ناچار قبل از وقت سبکدوشی کی درخواست دینا پڑی اور ایک سو چھبیس روپے چار آنے پر زندگی کی مہم سر کرنے گئے۔

والد کی رحلت کے بعد کاروبار میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ساتھیوں سے طویل مقدمہ بازی رہی جس نے اور نڈھال کر دیا۔ مقدمات کی پیروی جناب غلام بھیک نیرنگ مشہور شاعر و ادیب قلیل معاوضے پر کرتے رہے اور پھر تو شملے سے رسمی تعلق ہی رہ گیا تھا بلکہ نام کا تعلق۔ بیمار پڑنے کے بعد بیوی کے عزیزوں کے یہاں موڑک راجستھان بہ مردہ بدست زندہ کی سچی تصویر بن کر پہنچے اس وقت جب دلی لٹ رہی تھی، دلی جسے مسلمانوں کے خون سے نہلایا جا رہا تھا، یوں کہہ لیجیے "غسل صحت" دیا جا رہا تھا یہ اس کا حق بھی تو تھا۔ اپنے پیاروں کے خون سے رنگ کر وہ زندگی جاوید اور اس بات کی متمنی تھی کہ اس کے پیارے کہیں اور نہ جا بسیں، اس نے اپنوں کو اپنے ہی سینوں میں چھپا لیا کہیں جانے نہ دیا یعنی

ع پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

حیرت بایں حالت زار قلعہ بند رہے بھلا ہو ایک ہندو دوست کا جس نے حق

سنہ ۱۹۰۴ء سنہ ۱۹۶۴ء



سید انیس شاہ جیلانی، سید ابوالکلام شاہ جیلانی، عبدالمجید حیرت شملوی

دوستی ادا کیا اور ثابت کر دکھایا کہ دنیا صرف درندوں ہی نہیں انسانوں کی بستی بھی ہے۔ یہ اور بات کہ کبھی کبھار یا اکثر و بیشتر فطرت نے باگ ڈور چنگیزیت کے ہاتھوں میں دے دی ہو زمانہ بہرحال رنگ بدل کر ہی دم لیتا ہے" آزادی ملتے ہی حیرت دلی بدر ہوئے زبان پر اپنا ہی شعر تھا۔ ؎

رہ کے دلی میں کیا کہیں حیرت
کیا مصیبت وہاں اٹھائی ہے

گمان غالب یہ ہے کہ وہ دوست جو اڑے وقتوں میں کام آئے تھے سکھ تھے حیرت نے ان کا ذکر اپنے کاغذ میں کیا ہے نام یاد پڑتا ہے دلیپ سنگھ تھا۔ حیرت موٹرک گئے وہاں سے رام پور پہنچے اور پاکستان آنے تک وہیں رہے، روز اول ہی پاکستان آنے کی ٹھان لی تھی اپنے ارادوں کی تکمیل پر ایمان رکھتے تھے اور وہ اس میں کامیاب ہو کر رہے اواخر ۱۹۶۲ء میں سر دیاتے ہوئے جب لاہور پہنچے ہیں تو بدر حسن قریشی کے مہمان ہوئے یہ ان کے عزیزوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے باصرار ایک ہفتے سے زیادہ مہمان رکھا۔ لاہور سے سکھر کو نوازا، یہاں اپنی بیوی کے ماموں جناب یوسف جھالاواڑی کے مہمان بنے۔ چاہتے تھے یہیں رہ جائیں لیکن یہاں آرام تو تھا کام نہیں۔ کسی ادارے سے کوئی تحریری کام مل جاتا تو مرحوم یہیں ٹک جاتے۔

سکھر کے دوران قیام میں، میں جب اشتیاق دید کے زیر اثر آمادہ سفر ہوا تو والد محترم سید مبارک شاہ جیلانی نے میرا ساتھ دیا۔ ادھر مشہور سندھی شاعر شیخ محمد فاضل اور ماسٹر غلام حیدر سکھر میں ہمارے منتظر تھے۔ جب یہ "چار یار" در حیرت پر پہنچے ہیں تو وہ منظر دیدنی تھا دونوں طرف سے جذبات کی فراوانی، کچھ کہا کچھ سنا، کچھ کہہ نہ سکے کچھ سنا نہ گیا۔ ہماری خاطر چائے سے بھی کی گئی ملفوظات عالیہ اور گفتار عالمانہ سے بھی۔ ذکر خیر جناب جوش ملیح آبادی اور ان کے ساتھ اکبر علی خاں ابن جناب امتیاز علی خاں عرشی کا اس لیے آیا کہ نگار رامپور ان کے زیر مطالعہ تھا جسے اکبر علی خاں نے نیاز صاحب کے پاکستان چلے آنے کے بعد جاری کر دیا تھا۔ فرماتے تھے اکبر کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ جیسے باپ ہیں ویسا بیٹا نہ ہوا۔ میں یہ کہتے کہتے رہ گیا ایسا ہوتا کب ہے۔ مرحوم ہمیں غزل بھی سنانا

چاہتے تھے۔ ہم لوگوں نے فرمائش ہی نہیں کی اس لیے انہوں نے خط میں لکھ کر بھجوائی۔ کراچی میں ایک مرتبہ چلتے چلتے مجھے روک لیا تھا، غزل سن کر جاؤ۔ یہ اس مرحوم کی محبت اور شفقت تھی ورنہ من آنم کہ من دانم۔ غرض وہ پہلی ملاقات ہر لحاظ سے تر رہی اور منت کش اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں، نہ رہی۔ سکھر سے کراچی تشریف لے گئے جب جب جانا ہوا حاضری کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ وہاں احباب کی کوششوں سے محکمہ اوقاف میں درگاہ عبداللہ شاہ غازی، بخاری علیہ الرحمۃ میں بطور مدرس جگہ مل گئی تھی مشاہرہ نوے روپے ماہانہ۔ دل پر قیامت گذر گئی، علیگڑھ کا گریجویٹ بلند پایہ ادیب و شاعر یوں نوے روپلی کیلئے بے دست و پا پڑا ہوا ہو۔ اگر وہ "جیتا" ہوتا تو اپنے ساتھیوں کی طرح کسی ملک کا گورنر ملک غلام محمد کی طرح نہ سہی صوبے کا گورنر ہوتا، چلئے گورنر نہ سہی اپنے اکثر دفتری ساتھیوں کی طرح کسی محکمے کا منتظم اعلیٰ تو ضرور ہوتا یہ بھی ممکن تھا اپنے پرانے یار جناب پرویز کی طرح کی کوئی تحریک ہی کھڑی کر دیتا غرض وہ سبھی کچھ بن سکتا تھا اگر اس سے اس کا نچلا دھڑ چھین نہ لیا گیا ہوتا۔

طویل علالت نے مرحوم کے قوائے جسمانی کو تو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، لیکن دماغی توانائی کا کیا کہنا، تقریر و تحریر، شعر و ادب میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ہمیشہ منتظر و مضطرب رہے، زندگی سے فرار ان کی سرشت میں قطعاً نہیں تھا وہ زندگی کو زندگی سمجھتے تھے جو ہر دم جواں اور پیہم رواں دواں رہتی ہے انہوں نے اسے پیمانہ امروز و فردا سے کبھی نہیں ناپا، ایک سو چھبیس روپے چار آنے ماہانہ پنشن اور دو چار ٹیوشنیں وہ بھی حد پانچ دس کی۔ اس بے سر و سامانی کے عالم میں جب کوئی اپنا پاس نہ ہو، چلنے پھرنے کی توفیق نہ ہو، بیوی بچے دس میل دور ناظم آباد میں اقامت گزیں ہوں مرحوم جس صبر و ضبط، خودداری، عزم اور استقلال سے جی گئے وہ انہی کا حصہ تھا۔

ایک بچے کے والد نے ماہانہ معاوضہ دس روپے نذر کیا، مرحوم نے پانچ روپے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ جتنا کچھ میں نے اس بچے کو پڑھایا اس کا معاوضہ پانچ سے زیادہ نہیں بنتا

دینے والے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اسے اپنی سماعت میں فرق آجانے کا احساس ہوا بھلا اس ایٹمی دور میں گھر آئی مایا کو یوں کون ٹھکراتا ہے۔ لیکن اس مرد غیور نے زبردستی بچے کی جیب میں یہ کہہ کر ٹھونس دیئے "لو بیٹا یہ ہماری طرف سے ہیں" میں تو یہی کہوں گا مرحوم کو یہ خیال رہتا تھا کہ لوگ میری ظاہری حالت کو دیکھ کر ترس کھاتے اور دو چار روپے زائد دے کر ممنون کرتے ہیں۔ شاعر حساس ہوا کرتا ہے ٹھیس لگتی ہوگی تبھی تو وہ کسی سے ایک دھیلے کے روادار نہ تھے۔ احباب سے قرض لیتے، دینے والا بھول جاتا وہ برابر یاد رکھتے اور اس قرض سے ادا ہونے کیلئے کوشاں رہتے۔

میرے چچازاد بھائی کراچی جارہے تھے میں نے تاکید کردی تھی کہ حیرت سے ملنا اور کچھ سلوک بھی کردینا موصوف نے بیس روپے نذر گزرانے۔ دس روز بعد کیا دیکھتا ہوں ایک منی آرڈر چلا آرہا ہے اس تنبیہہ کے ساتھ کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔

مرحوم جب درگاہ بخاریؒ سے منسلک ہوگئے تو مستقل اور قدیم ساتھی تنہائی اور یکسوئی سے بھی بیزار ہو چکے تھے وقت کاٹنے کیلئے اخبارات و رسائل احباب سے طلب کرتے رہتے سکھر میں کچھ کتابیں میں نے بھی بھیجی تھیں، بہت سے پرچے اعزازی طور پر بھی آجاتے تھے ان میں "حریت" کراچی بھی تھا "جنگ" کو بھی لکھا تھا وہاں شنوائی نہیں ہوئی عرصہ جنگ میں ہوتی بھی تو کیونکر۔ روزنامہ "حریت" درگاہ بخاری پر بطور پھولوں کے پڑھایا جانے لگا۔ ردی کا ڈھیر دیکھ کر ایک دن میں نے کہا، اسے بیچ دیا جائے تو اچھا ہے، فرمایا اس "مال غنیمت" کو بیچ کر رقم کسی مستحق کو دے دوں گا۔ حالانکہ سب سے بڑھ کر مستحق وہ خود تھے۔ فرماتے تھے اعزازی طور پر آنے والی چیزوں پر میرا حق نہیں۔

ع تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میرا مرحوم سے قلمی تعارف جس نے جلد ہی قلبی تعلق کا روپ دھار لیا رحلت سے تین ساڑھے تین سال پہلے ہوا، راز و نیاز شفقت بزرگانہ اور سعادت خوردانہ کا عالم یہ رہا کہ اس تین سالہ دور وصال میں تین سو دو محبت نامے میرے نام آئے جنہیں عزیز جاں بنا کر رکھنے میں مجھے کوئی کراہت محسوس نہیں ہوتی کراہت اس لیے کہ بعض "بزرگ" ایسے بھی ملے جنہوں

[illegible]

[illegible] (۱) [illegible]

[illegible]

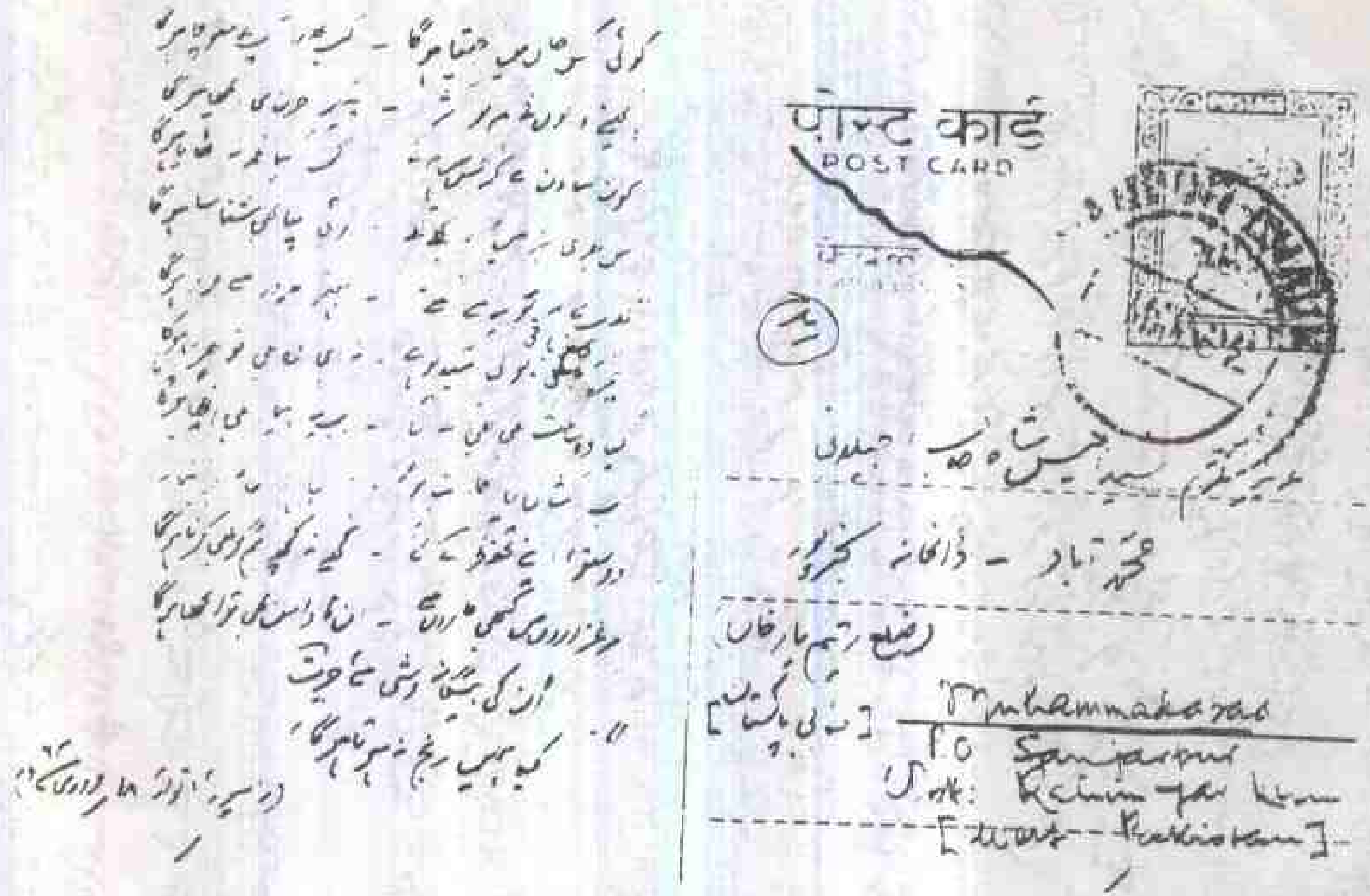
آپ کا [illegible] ۱۹/۲/۶۲ — میں میرے پہلے خط [illegible]
[illegible] سطر تھا [illegible] آج مل گیا

[illegible] کو [illegible] اقدام
[illegible] — تعجب ہے
[illegible] شاید [illegible]
[illegible]

[illegible] نقوش (لاہور) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] —— [illegible]
[illegible]

[illegible]
دعاگو [illegible]


पोस्ट कार्ड
POST CARD
(۲۱)
عزیز محترم سید حسین شاہ صاحب جیلانی
محمد آباد - ڈاکخانہ
ضلع رحیم یار خان
[مغربی پاکستان]
Muhammadabad
To Sanjarpur
Post: Rahim yar khan
[West Pakistan]

نے خطوط حیرت ضائع کر دیئے اور بعضے ایسے بھی جنہیں آج بھی مجھے حیرت پر کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مرحوم ہمیشہ کارڈ لکھتے تھے لفافہ اس وقت استعمال کرتے جب اس کے بغیر کوئی اور صورت نہ رہ جاتی۔ کارڈ پر لفافے کا مضمون کھپا دینے کا انداز بڑا پیارا اور فنکارانہ تھا کیا مجال آپ کہیں اٹک جائیں، گنجان ہونے کے باوجود صاف اور روشن لکھائی ایسی کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی، ایک ایک لفظ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی پڑھ لے۔ حاشیہ چھوڑ کر لکھتے تھے خط مکمل ہو جانے کے بعد کوئی بات یاد آجاتی تو پس نوشت کے عنوان سے لکھ ڈالتے "پس نوشت" ان کے خطوط کا نشانِ امتیاز بن کر رہ گیا تھا۔ پین سے شاذ ہی لکھتے تھے اس وقت جب قلم دوات دستیاب نہ ہو۔ میرے نام پین سے صرف ایک کارڈ ہے یہ انہوں نے جناح ہسپتال سے لکھا تھا، ان کے کولہے پر ایک پھوڑا نکل آیا تھا یہ ابھی پوری طرح بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ہسپتال سے چلتے کئے گئے حالانکہ مریض کی خواہش یہ بھی تھی کہ اپنے پرانے مرض از قسم فالج کی بھی تشخیص کرا لے۔

نب جرمن استعمال کرتے تھے جس سے اردو انگریزی ہر دو زبانوں کا حسنِ کتابت نکھر کر قریب نظارہ دکھاتا۔ اردو کے ساتھ ساتھ احتیاطاً پتہ انگریزی میں بھی لکھتے، بستر نشین تھے سوائے لکھا پڑھی کے کوئی کام نہ تھا۔ خطوط نویسی مطالعہ ترجمہ محبوب مشغلے تھے بسا اوقات ماہانہ خطوط نویسی ڈیڑھ سو سے بھی بڑھ جایا کرتی تھی جس کا وہ باقاعدہ ریکارڈ رکھتے تھے یعنی آج اتنے خط آئے اور کتنے خط گئے۔ کس کس کے آئے کہاں کہاں بھجوائے۔ خطوط میں مشترک احباب کے سلام و پیام کے تبادلے کے فرائض تندہی سے انجام دیا کرتے تھے۔ اور وضعداری کا یہ عالم کہ بچوں بوڑھوں سب کو یاد رکھتے اور ہر خط میں ٹیپ کے بند کے طور پر سلام دعا و پیار لکھتے میں نے اس پر ٹوکا تو فرمایا، آپ عزیز ہیں تو آپ کے بچے کیوں نہ ہوتے، ایک بار ایک پیٹلی جس میں تھوڑا سا گھی بھجوا دیا تھا ان کے یہاں رہ گئی، وہ تو میرے لیے عذاب بن گئی اس کی واپسی کو مرحوم نے اس قدر اہمیت دی کہ مسلسل چودہ خطوں میں اس کا ذکر آیا۔ اپنا پتہ ہر خط میں لکھتے، روشنائی کبھی ہلکی کبھی تیز اور ان کی معذوری پر دال۔

تریسٹھ چونسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی لیکن سر کے بال سلامت تھے۔ گھنے اور برش، داڑھی صاف مونچھیں ہلکی۔ داڑھی منڈواتے تو تھے لیکن ضمیر کی ملامت پر گوش بر آواز بھی رہتے خلیفہ نہ ملتا تو داڑھی بڑھ جاتی اور بھلی لگتی۔ پیر حسام الدین صاحب راشدی جب ممتاز حسن صاحب کی معیت میں حیرت سے ملنے گئے ہیں تو اس ملاقات کی یادگار کے طور پر دو تصویریں حیرت کی لے لی تھیں، وہ دونوں مرحوم نے مجھے بھجوا دی تھیں، سر پر رومال اس طرح باندھا ہوا ہے جیسے بچے باندھتے ہیں یعنی گرہ ٹھوڑی کے نیچے لگی ہوئی ہے اور داڑھی بڑھی ہوئی جوانی کی تصویروں سے بھی اندازہ یہی ہوتا ہے کہ پہلوان نہ رہے ہوں گے۔ بیس سالہ علالت نے اور کس بل نکال دیئے تھے۔ نحیف الجثہ اور بالکل دھان پان، شب و روز کی بستر نشینی اور درد و کرب کی وجہ سے ہفتوں نہانے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ نہانا تو دھی پسند نہیں کرتے تھے یوں کہہ لیجئے اتفاق ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کچھ زیادہ صفائی پسند بھی نہ رہے تھے، ہمت کر کے رہ جاتے۔ بستر ناصاف رہتا تو قباحت محسوس نہ فرماتے ناخن بڑھ جاتے۔ میرے اور مرحوم کے محب صادق پیرزادہ لطیف الرحمٰن صدیقی زبردستی نہلا دھلا دیا کرتے تھے جب وہ پندرہ روز تک بزرٹا لائنز کراچی میں ان کے مہمان رہے تھے یہیں سے درگاہ بخاری رحؒ کلفٹن منتقل ہوئے۔ اس وقت بڑا دکھ ہوا جب مرحوم کے کمرے میں پلنگ کے نیچے کھلے منہ کا پیشاب کا برتن رکھا ہوا تھا، جس سے عفونت پھیلی ہوئی تھی، بدبو کے بھبکے مشام جاں کو "معطر" کر رہے تھے، وہ کسی لڑکے بالے سے کہہ کر ہٹوا بھی سکتے تھے، میرے احباب تو تاب نہ لا سکے باہر نکل کر ٹہلا کئے اور میں اس بدبو کو دماغ میں رچا بسا کر گل افشانی گفتار کے مزے لوٹتا رہا۔ مرحوم تیز تیز بولتے تھے چل پھر نہ سکنے کی تلافی کی ایک صورت یہ بھی تھی، انداز بہر حال پیارا ہی تھا۔ "ٹب باتھ" پر تو بے تکان اور گھنٹوں سنائی ہوئی باتوں کا اعادہ کرتے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اور مالی کمزوری کے سبب ٹب باتھ کو اپنا واحد نفع بخش علاج تصور کرنے لگے تھے۔

میں نے دیکھا تکیے پر مچھروں کا ڈیرہ ہے اور وہ ان سے بے خبر حالانکہ بجلی کا پنکھا بھی محرام تھا، کھٹمل بھی بے شمار، جونہی آپ کرسی پر براجے سوئیاں چبھنا شروع ہو جاتی تھیں۔

لیکن حیرت پر بے بسی غالب تھی، کون دل ہے جو ایسی بے کسی پر بہہ نہ نکلے۔

آنکھیں غلافی تھیں، تصاویر میں اور یوں بھی مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے بینائی جاتی رہی ہو۔ مرحوم کی ایک تصویر دیکھ کر جناب رئیس امروہوی نے بھی چھوٹتے ہی یہ دریافت فرمایا کیا ان کی بینائی جاتی رہی، کمانی دار چشمہ لگاتے تھے، سماعت میں فرق نہیں آیا تھا گھنٹوں بیٹھے لکھا کرتے پڑھا کرتے، دونوں طرف سے سہارا ہو تو گھسٹ بھی لیتے ایسے میں ازدواجی وظائف کا کیا ذکر۔

مرحوم نے شادیاں دو کیں، پہلی بیوی والدین کی پسندیدہ تھیں، یہ نالاں رہے، تان طلاق پر جاکر ٹوٹی۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی، پسند انہیں دوسری بیوی بھی نہیں تھی، کوشش تو بہت کی گئی کہ ایک جھلک شادی سے پہلے دیکھ لیں مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ دلہن گھر آگئیں، شروع میں اچھی نبھی، گو وہ برملا اپنے روزنامچوں میں رونا اس کا بھی روتے رہے کہ فلاں عورت اے کاش میری بیوی ہوتی۔ جس کیلئے خاصی بھاگ دوڑ کی گئی لیکن رشتہ مقدر نہ ہوا۔ پہلی بچی کی پیدائش پر بہت خوش ہوئے اور اس ننھی سی جان جو اب ماشاء اللہ خود صاحب اولاد ہیں اور ایک نیک سیرت شوہر کی پاک طینت بیوی کا باقاعدگی سے مہینوں کیا برسوں کا احوال روزنامچہ قلم بند فرماتے رہے۔ میاں بیوی کے مزاج نہیں مل سکے، کوتاہیاں دونوں طرف سے سرزد ہوا کیں۔ اتنا ضرور کہا جائے گا، پلہ بہر صورت بیگم ہی کا بھاری رہا، میاں کا نہیں، بیوی کو یہ شکائت رہی کہ میاں تو بس شاعر آدمی ہیں، شام کو آئے منہ لپیٹ کر پڑ رہے۔ گھر کے اخراجات میں کمی پڑ جانے پر بیوی کا پارا چڑھنا ظاہر ہے۔ بچے اگر زنجیر نہ بن گئے ہوتے تو ممکن تھا۔ علیحدگی اختیار کر لیتے۔

اولاد میں تین لڑکیاں ہیں۔ شادیاں تینوں کی ہو چکی ہیں اور ایک لڑکا ساجد علیخان جس نے والد کا صدمہ اٹھانے کے باوجود دوسرے درجے میں بی ایس سی پاس کر کے مرحوم کی روح کو سکون پہنچایا واقعی لائق مبارکباد ہے، ساجد سے پہلے بھی اولاد نرینہ ہوتی لیکن ان کا آنا تمہید جانے کی ثابت ہوتا رہا مرحوم نے اپنی تین بہنوں اور دو بھائیوں کو جس طرح پالا پوسا تھا اسی طرح اپنی اولاد کیلئے بھی سچ مچ تن من دھن کی بازی لگا رکھی تھی۔

جسے بالآخر وہ جیت کر ہی رہے۔ بیٹیوں کو دو کی شادیاں ان کی زندگی ہی میں ہو گئی تھیں چھبیس چھبیس تولے سونا دیا، خود پڑھایا لکھایا، انگریزی میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔

رام پور میں تو صبح سے شام تک طلبا آتے جاتے رہتے اور استفادہ کرتے، آپ نے جو کچھ دے دیا انہوں نے صبر و شکر سے قبول کر لیا اور بیٹے کے علیگڑھ کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے رہے اکثر و بیشتر قرض دام سے کام چلاتے، اعزہ و اقربا میں قریب تر بھائی تھے دونوں گردش روزگار کا شکار، لے دے کے خسر تھے یہ بہر حال اپنی بیٹی بقول حیرت کو کچھ نہ کچھ ماہانہ دیتے تھے اور اب بھی وہی کفیل ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ حیرت خسر کی اس توجہ کو صرف اسی قدر اہمیت دیتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو دیتے ہیں مجھے اس سے کیا، تو بھائی وہ آپکی بیوی بھی تو ہیں خسر ان کی شاعری سے ہمیشہ نالاں رہے۔ اس پر بیمار پڑ گئے تو اور بے تعلق ہو گئے، ایک زمانے میں مرحوم کے والد بھی شاعر سے بیزار رہ چکے تھے۔

عنفوان شباب میں حیرت ایک ہندو دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے، چوری چھپے کی ملاقاتوں سے بات ہجر و وصال کے مزے لوٹنے تک پہنچی اور سودا جیون ساتھی بنا لینے کا سوار ہوا، والد کی خشونت مزاج کے ڈر سے اپنی والدہ کو رازدار بنایا اور والد کو ہموار کرنے کی تحریک کی، بات باپ تک تو کیا پہنچتی، ماں نے ہی کھٹ سے سوال کر دیا، بیٹا شادی تو میں کرا دوں گی پہلے یہ تو بتاؤ تم دونوں اس وقت تک عفت مآب بھی ہو، حضرت بغلیں جھانکتے ہوئے گھر سے نکل گئے، اور پھر اس دوشیزہ سے شادی کا نام نہ لیا، مرحوم کے دوست مولوی مجنوں زبانی راوی ہیں کہ حیرت کئی سال بعد شملے ہی میں ایک بنگلے کے سامنے سے گذر رہے تھے، وہ حسینہ چمن کی بہار بنی بیٹھی تھی، آنکھیں چار ہوتے ہی ان کے قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھنے لگے۔ اور اس وقت تک بڑھتے چلے گئے جب تک اس کو باہوں میں تھام نہ لیا ہوش آیا تو نظر ایک کھلونا سے بچے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں پانچ کا نوٹ تھما کر برق رفتاری سے بنگلے سے باہر نکل آئے یہ آخری ملاقات تھی۔ اور کیسی معصومانہ۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجھ سے پہلے میرے چچازاد بھائی سید ولی محمد شاہ جیلانی

اور یارِ عزیز سید اسلم شاہ حیرت کی دید سے مشرف ہوئے۔ ان لوگوں کو سکھر جاتا اور "ٹیپ ریکارڈر" دردست دیکھ کر ترغیب میں نے مرحوم سے ملنے کی دی، یہ پہنچے اور دو غزلیں مقید کر لائے۔ بتایا گیا کہ جب پہلی غزل بآوازِ حیرت فیتے میں بند کرکے انہیں سنوائی تو ہم یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے، جھڑی لگی ہوئی ہے جب یہ طوفان تھما اور دل کی بھڑاس نکال چکے تب دوسری غزل "ٹیپ" کرائی اور یہ پیغام بھی کہ اپنی آواز سن کر نہ جانے کیوں رو پڑا۔ وہ کیوں رو پڑے، میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ برس ہا برس کی بیماری نے انکی امنگوں اور آرزوؤں کو جس طرح پامال کر رکھا تھا اس کی مثال شاذ ہی کہیں ملے گی دوسرے یہ کہ وہ اپنا دکھ کسی سے کہتے نہ تھے، مرض کے کرب و اذیت کا ذکر کم ہی کرتے تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ خوگرِ حمد ہی رہے شکوہ سنج کبھی نہ ہوئے البتہ اپنے خاص دوستوں کو لکھتے وقت بے اختیار کاغذ پر رکھ دیتے تھے کلیجہ نکال کے اور بات اس سے آگے نہ بڑھتی کہ اپنا ہی شعر دہرا کر رہ جاتے۔

حد سے گذری ہے ابتلا میری
اب تو سن لے مرا خدا میری

اسی گھٹن کا نتیجہ تھا جو سیل رواں بن کر نکلا،

مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ موضوع کی کوئی قید نہ تھی۔ مذہبی، ادبی، سیاسی تاریخی، قرآن حدیث غرض ہر چیز دیکھ لیتے تھے اور اس دقتِ نظر سے کہ اشتہارات تک پر حاشیہ چڑھا دیتے یا زیرِ قلم کر دیتے، پڑھنے کی رفتار بھی بے پناہ تھی، کتابیں رسالے جمع کرنے کا شوق نہیں تھا، عاریتاً لے لوا کر پڑھتے اور اعزازی چیزیں کتب خانہ جماعت اسلامی رام پور کی نذر کر دیتے۔

لاہور کا تو مجھے علم نہیں سکھر اور کراچی میں مرحوم کو رہنے کا ٹھکانہ دوسری منزلوں پر ملا، سیڑھیاں اترتے چڑھتے وقت (اور اس کی نوبت کم ہی آتی تھی) بقول ان کے دن میں تارے نظر آتے تھے، وہ مردانہ نشست و برخاست کے آدمی اور عادی تھے زنان خانے گویا قیدِ بامشقت سے کم نہ تھے مگر سوائے صبر کے چارہ ہی کیا تھا، ایک خط میں بڑی حسرت سے لکھا تھا، آج آسمان کھلا ہے دھوپ کھڑکی سے چھن چھن کر آ تو رہی ہے لیکن میرا پلنگ اس سے

دور ہے اور کوئی بندہ خدا ایسا نہیں جو پلنگ اور مجھے وہاں دھوپ میں ڈال دے۔

حیرت کی رحلت کی خبر ان کے صاحبزادے نے ایک کارڈ سے مجھے دی۔ گو وہ ایک مدت سے بستر نشین تھے اور اب تو یہ علالت انکی صحت بن کر رہ گئی تھی۔ نڈھال یا مضمحل تو وہ کہیں سے کہیں تک نظر نہ آتے تھے اور اب تو انہوں نے کراچی پہنچ کر نئی زندگی شروع کر دی تھی۔ کراچی تیرتھ رام فیروز پوری کی زبان میں شہر غدار ہے یہاں لاکھوں کے وارے نیارے منٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ یہاں حیرت کے پرانے یاروں کا اچھا خاصا مجمع تھا اور ہے، ہر شخص اپنی بساط بھر ان کی مشکلیں آسان کرنے کی فکر میں تھا۔ آثار کچھ اس قسم کے نظر آرہے تھے کہ ماہانہ آمدنی پان سات سو تک باآسانی پہنچ جائے گی۔ ریڈیو نے بھی قدر افزائی کی دو بار بلایا اور معقول حق المحنت ادا کیا، لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے، کوئی خوں شدہ دل ان کے کام نہ آیا۔ مجھے تو ہفتوں اس خبر نے از کار رفتہ رکھا، بارے ہوش آیا تو جی چاہا کیوں نہ مرحوم کے وقتاً فوقتاً میرے نام آنے والے خطوط مرتب کر کے چھپوا دوں، یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور یہ جواہر ریزے محفوظ بھی ہو جائیں گے، مرحوم سے مجھے جو قلبی لگاؤ تھا، وہ تھا تو شعر و سخن کی راہ سے لیکن سکھر میں ان کو بے دست و پا اور معذور دیکھ کر انسانی ہمدردی کا بے ریا جذبہ بیدار ہو چکا تھا، اب وہ میری نظر میں صرف شاعر و ادیب ہی نہیں ایک صابر و شاکر راضی برضائے الٰہی متوکل غیور خوددار عظیم آدمی کے روپ میں سمائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کسی کو لولا لنگڑا دیکھ کر لوگوں پر خوف یہ طاری ہو جاتا ہے، کہیں ہم پر اس مرض کا حملہ نہ ہو جائے، یہی خوف محرک خلوص، محبت اور ہمدردی ہوا کرتا ہے، علم نفسیات کی رو سے بلاشبہ یہ بات حقیقت سے قریب تر ہے لیکن حیرت کو دیکھ کر سوائے محبت کے کچھ اور سوچنا حماقت لگتا تھا۔ انسانی دماغ خیر و شر کی پناہ گاہ بھی ہے آماجگاہ بھی، اگر ہمیں فکر معاش سے آزاد

؎ مرحوم نے دورانِ قیام دہلی میں ایک بار آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہونے کی کوشش کی تھی لیکن بخاری کو حیرت زیادہ کام کے آدمی نظر نہ آئے اور غلام محمد (سابق گورنر جنرل) کی سعی و سفارش بھی بیکار گئی۔

کر دیا جائے اور قید تنہائی میسر آجائے تو ایسے میں بڑے بڑے عالی دماغ بھی کسی نہ کسی حد تک بہہ جائیں گے، بہک جاتے ہیں اور حیرت کو تو ایسی تنہائی بھی نصیب ہوئی ہے کہ بیوی بچے موٹر کی سیر دیکھتے رہے اور حضرت صرف خربوزے کھا کھا کر دن گذارتے رہے، اس معذوری کی تنہائی نے ان میں جہاں ضبط و تحمل پیدا کر دیا تھا وہاں خرابیاں بھی چند ایک در آئی تھیں۔ مثلاً وہ بات بے بات بھی لوگوں سے شاکی رہنے لگے، رامپور میں دو دوست بیک وقت ان کے یہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ایک کو تو سگریٹ لانے کے بہانے باہر بھیج دیتے اور دوسرے سے کہتے یار اس سے کسی طرح پیچھا نہیں چھوٹتا، تمہاری بھی برائیاں کرتا ہے، میری بھی کوئی خدمت نہیں کرتا، غرض دونوں سے الگ الگ اسی قسم کی باتیں کرتے یہاں تک کہ پڑھانا ترک کر دیا، اور جب تک ماہانہ طے نہ کر لیا نہ پڑھایا، حالانکہ انہی دونوں کے اصرار پر مرحوم نے پڑھنے والوں سے معاوضہ لینا شروع کیا تھا ورنہ پہلے مفت پڑھاتے اور اگر یہ لوگ معاوضے کا نام لیتے تو فرماتے، استغفر اللہ معاذ اللہ حاشا للہ بھائی اس بدنصیب قوم کی میں کچھ خدمت نہ کر سکا کیا اتنا بھی ایثار نہ کروں، نہیں بھائی اس کا سودا میں نے اپنے خدا سے کر لیا ہے، شائد عاقبت بخشوا دے۔

ہاں تو بات خطوط کی اشاعت کی ہو رہی تھی، خطوط نقل کرنے بیٹھا تو میں تو یہی کہوں گا، غیب سے اشارہ کچھ ایسا ہوا کیوں نہ مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میں ہی چھپوا کے محفوظ کر دینے کی سعادت حاصل کروں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ رحلت کی خبر مارے باندھے سے دس پندرہ روز بعد اخبارات (جنگ، حریت) کے کونوں کھدروں میں نکلی۔ فاران۔ ساقی۔ نقوش وغیرہ رسمی ماتم کر کے رہ گئے البتہ "کتابی دنیا" نے مسلسل چار اشاعتوں میں مرحوم کا ماتم کیا، ماتمی شذرہ چونکہ جناب ملّا واحدی کے قلم سے تھا۔ لہذا "جنگ" کو بھی چھاپتے ہی بنی۔ قطعہ تاریخ کیلئے مشہور قطعہ نگار جناب رئیس امروہوی سے لاکھ کہا لیکن ان کا عذر یہی رہا کہ بھائی میں کہہ تو دوں لیکن "جنگ" میں چھپے گا، کیونکر میں اپنی اس عمومی بے حسی پر ماتم کناں رہا۔ "قومی زبان" نے بھی اپنی ایک اشاعت میں حیرت کو یاد رکھا۔ بہر حال ان سب رسائل کا شکریہ۔ نگارش حیرت کی اشاعت

کے بعد ہی دنیا کو جو ہر کامل کے اٹھ جانے کا احساس ہو گا اور حسب معمول کف افسوس ملنے کے علاوہ ان کی قبر پر چراغاں کر کے خوش ہو لیں گے، زندگی تیرہ و تار گزری اس کا کیا ہے ہم تو ٹھہرے مردہ پرست، زندگی میں دھرا ہی کیا ہے جو ہم اس کی طرف لپکیں۔

میں نے اپنا مدعا ابن حیرت ساجد علی خاں سے بیان کیا دوسری ہی ڈاک سے انہوں نے اپنی آمادگی کا اظہار فرما دیا، موصوف نے مرحوم کے تمام کاغذات میری تحویل میں دے کر جس اعتماد کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ادھر میں نے حیرت شملوی اکادمی۔ کا ڈول ڈال دیا اور شب و روز حیرت کیلئے وقف ہو کر رہ گئے کوئی دو تین ہفتوں کی چھان پھٹک کے بعد چار سو سے زیادہ پتے درج رجسٹر ہو چکے تھے جن سے مرحوم کی گذشتہ بیس سال میں مراسلت رہی تھی۔ کاغذات میں مجھے اس پھل والے کا کارڈ بھی ملا جس نے ساجد میاں کے قرض ادا کئے بغیر رامپور چلے جانے کا ذکر کیا ہے۔ ساجد علی گڑھ ہائی اسکول کے طالب علم رہ چکے ہیں، اس سے مجھے خطوط حیرت کی فراہمی میں بڑی مدد مل رہی ہے، اب کیا تھا ہر طرف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کاغذی گھوڑے دوڑائے جانے لگے، دو سال کی پیہم خط و کتابت ستره سو خطوں کی شکل میں رنگ لائی اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اس کے علاوہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت منتشر مواد زیر ترتیب ہے۔

۱۔ دیوانِ حیرت شملوی کا عنوان ہو گا "آئینہ حیرت"۔

۲۔ کلیات حیرت (مکمل مجموعہ کلام)

اس کا ایک حصہ مرتب کر چکا ہوں اور یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ یوں تو ایک مجلد بیاض بھی موجود ہے جس میں منتخب یعنی نوک پلک سے درست کیا ہوا کلام منقول ہے لیکن میں ان بیاضوں اور چھوٹی چھوٹی کاپیوں، سگریٹ کے پیکٹوں کو کیا کر دوں جنہیں "متروک" کر دینے کے باوجود شاعر نے اپنے ذخیرۂ کاغذ میں محفوظ رکھا، ان سے صرف نظر کرنا میرے بس کی بات نہیں اس لیے کلیات کا دوسرا حصہ

(پہلا اور دوسرا حصہ ایک ہی جلد میں ہوگا) ان عنوانات پر مشتمل ہونا ضروری ہے
"محذوفات" ۔ "ترمیمات" ۔ "متروکات"

۳۔ مکتوباتِ حیرتؔ (اردو)

مرحوم نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی سادہ و پرکار اسلوب بیان رکھتے تھے زائد لفظ مشکل ہی سے ملے گا ان کی تحریر میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس وقت تک سترہ سو خط فراہم ہو چکے ہیں اور یہ صاف نقل بھی ہو چکے۔ آمد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ توقع ہے کہ ایک ہزار خط اور مہیا ہو جائیں گے ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سترہ سو خطوط تقریباً سبھی علالت کے بعد کے ہیں، ۱۹۴۴ء اور اس سے پہلے کے صرف دو خط ہیں۔

۴۔ مکاتیب حیرت (انگریزی)

محدود تعداد ہے لیکن انداز تحریر شستہ و رفتہ ہے، فوجی اخبار شملہ کی پروف ریڈری نے اور انگریز افسر کی نگرانی میں ادارت نے خاص رنگ پیدا کر دیا تھا۔

۵۔ خطوط مشاہیر پاک و ہند بنام حیرتؔ شملوی

خاصی بڑی تعداد موجود ہے اور زیر ترتیب

۶۔ بنی اسرائیل کا چاند از رائیڈر ہیگرڈ ترجمہ حیرتؔ شملوی (ناول)

فوجی اخبار کی ادارت اور اسمبلی میں بحیثیت مترجم کام کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ ترجمہ بھی انگریزی سے اردو میں اچھا کر لیتے تھے، اس ناول کا کوئی نسخہ اس وقت تک مجھے دستیاب نہیں ہو سکا، پاکستان کے چیدہ کتب خانوں سے جواب اثبات میں نہیں آیا۔ صولت لائبریری رامپور میں ایک نسخہ موجود ہے احباب حیرتؔ خصوصاً دہلی کے لالہ دوارکا داس شعلہؔ اگر توجہ کریں تو اس کی نقل مہیا ہو سکتی ہے تاکہ میں اسے مکرر شائع کر سکوں۔

۷۔ ٹیگور کی کہانیاں — ترجمہ حیرتؔ شملوی

۸۔ ملفوظات حیرت — منتشر زیر ترتیب

۹۔ مضامین حیرت — (انہیں بھی ترتیب دینا ہوگا)

۱۰۔ منتخب اشعار — (اردو) از حیرتؔ شملوی

۱۱۔ منتخب اشعار (فارسی) از حیرتؔ شملوی

یہ شعری مجموعے میرے خیال میں کچھ زیادہ وقت لیں گے، ترتیب کہیں سے کہیں تک نہیں ہے۔

۱۲۔ حاشیے از حیرتؔ شملوی

مرحوم کتب و رسائل پر بوقت مطالعہ حاشیہ آرائی کے عادی تھے اور یہ حاشیے بڑے پیارے اور کام کی چیز ہیں، ایسے رسائل کی خاصی تعداد محفوظ ہے، کوشش کی جا رہی ہے کہ کتب خانہ جماعت اسلامی رامپور سے بھی کہ جہاں ایسے بے شمار رسائل موجود ہیں، یہ حاشیے نقل کرلئے جائیں۔

۱۳۔ تذکرہ الشعرا

مرحوم عصر حاضر کے مشاہیر کا ایک مکمل تذکرہ مرتب کرنے بیٹھے تھے لیکن اس انداز میں کہ پورا تذکرہ اوراق پریشان بن کر رہ گیا یہ بالکل سرسری سا ہے۔ اسکی اشاعت بھی بہرحال ضروری ہے۔

۱۴۔ بنیادی اردو قاعدہ

"بونس" سگریٹ کے خالی پیکٹوں پر پورا قاعدہ لکھ ڈالا، جسے بہ ہزار خرابی بسیار ترتیب دیا جا چکا ہے۔

۱۵۔ انتخاب کلام حیرتؔ

یہ کسی مشہور نقاد سے کرایا جائے گا۔

۱۶۔ حیرتؔ مشاہیر کی نظر میں۔

احباب حیرتؔ اور مشاہیر ہمعصر سے اپیل کی جاتی ہے کہ اس عنوان کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹائیں۔

۱۷۔ حیرتؔ تصویروں میں

اس سلسلے میں بیگم صاحبہ حیرتؔ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔

۱۸۔ تبصرے بر کلامِ حیرتؔ شملوی

۱۹۔ یادش بخیر

مرحوم حیرتؔ کے قلم سے یہ مجموعہ جس کا عنوان والد محترم نے تجویز کیا ہے۔ مختلف

بیاضوں اوراق پریشاں اور منتشر کاغذات ہی نہیں، پرزوں سے دس روزہ جاں کاہی اور کان کنی کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ حیرتؔ اپنی پسند کے جملے یا فقرے ہی نہیں پورے پورے صفحے نقل کر لیتے تھے اور کہیں کہیں اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے جاتے تھے جو گڈمڈ ہو کر رہ گئے، یہ تاثرات کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں لکھے گئے، انہیں اگر خاکوں کی بجائے اجمالی نظر سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، اس میں تقریباً برصغیر کی ۲۷ مشہور سیاسی و ادبی شخصیتوں کا ذکر آ گیا ہے (یہ خوبصورت نام "یادش بخیر" بدل کر "در محفلے دیدم" تجویز کرنا پڑا، اس لیے کہ یہ عنوان پہلے کہیں بندھ چکا تھا)

۲۰۔ اپنے پرائے

یہ بھی ایک تذکرہ ہی ہوگا، غیر معروف و نیم معروف حضرات کا بلکہ قلمی تصویریں کہیے تو بجا ہوگا۔ اس میں انسانی سیرت کے عزیب عجیب دلچسپ اور لذیذ پہلو دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی بکھرے ہوئے ہیں یکجا کرنا ہوں گے۔

۲۱۔ سوانحعمری حیرت شملوی

یہ سعادت جی چاہتا ہے میرا مقدر بنے۔ اس کے علاوہ بھی دو ایک عنوان اور نکل آئیں گے۔ مثلاً فارسی ضرب الامثال کا اردو ترجمہ وغیرہ۔

خدا شاہد ہے میں نے یہ کام کسی مالی منفعت کی امید پر ہرگز نہیں شروع کیا، جہاں اچھی سے اچھی علمی و ادبی کتاب کے صرف اور صرف ایک ہزار نسخے سالہا سال تک نہ نکل سکتے ہوں وہاں حیرتؔ سے غیر معروف شاعر سے یہ توقع عبث ہے، مقصود اصلی نگارشِ حیرتؔ کا مطبوع و مشہور کر دینا ہے، ورنہ تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے ذرائع اللہ کے فضل سے موجود ہیں اور یہ ایک انسان کیلئے بس کرتا ہے، میں تو مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ شائع کر کے متمنی اس بات کا ہوں کہ غالبیات اقبالیات کی طرح اردو ادب میں ایک موضوع حیرتیات بھی چل نکلے۔ بحالت موجودہ اسے خوش فہمی پر ہی محمول کیا جائیگا لیکن یہ فیصلہ وقت اور تاریخ پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے یہ الفاظ لکھتے وقت اپنے ہیرو کی محبت زیادہ کارفرما ہو۔ لیکن میں تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کا عادی تو خیر کیا

البتہ پسند ضرور کرتا ہوں تاریک اور روشن دونوں رخ سامنے ہوں کہ زندگی عبارت ہی نیک و بد سے ہے۔ عیب و ثواب کا چولی دامن کا ساتھ ہے، نہ تو آپ مکمل فرشتہ ہو سکتے ہیں نہ شیطان، اسی طرح مرحوم نہ تو غالبؔ تھے نہ ابن صفیؔ، وہ حیرتؔ اور صرف حیرتؔ تھے اس میں زیادہ سے زیادہ آپ شملوی ہی کا اضافہ کر سکتے ہیں، ان کے یہاں اچھے سے اچھے اشعار بھی مل جائیں گے اور پست سے پست بھی۔ طویل گوشہ نشینی نے بجا ہے کہ شہرت کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا لیکن اس چوٹ سے دماغ کچھ اور جلا پا گیا تھا، ذہنی بالیدگی اور شاعرانہ رفعتِ خیال کا پوچھنا ہی کیا، ہم بے تکلف حیرتؔ کو جگرؔ، اصغرؔ، ساغرؔ، حسرتؔ اور دیگر مشاہیر عصر کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں۔ پروپیگنڈہ بڑی چیز ہے جو حیرتؔ کو میسر نہیں آیا، چھوٹی بحر میں تو غزل کے استاد تسلیم کر ہی لئے گئے تھے بلکہ امتیاز علی عرشیؔ تو یہاں تک لکھ چکے ہیں "آپ اس وقت کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں"۔ سادگی و پرکاری مرحوم کا حصہ تھی۔ پہلی غزل جس نے شملوی دلوں کو گرمایا اور چہار سو ان کی شعریت کا ڈنکا بج گیا یہ تھی۔

اس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی
کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثار ہستیٔ پروانہ ہو گئی
یا تھی وہی نگاہ کی تھی چارہ سازِ دل
یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہو گئی
صد شکر کچھ تو ان سے ہوئی آج گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی
اللہ رے اشکباریٔ شمعِ شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

(شملہ اپریل ۲۲ء)

حیرت کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو آئندہ چل کر ضرب المثل کا درجہ حاصل کئے بغیر نہ رہیں گے، یہاں چند اشعار اور دو ایک غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔ دھو ہذا

گزرا یونہی وقت ہمیشہ
یہ اندیشہ، وہ اندیشہ

کوئی خوش رہا یا مکدر رہا ۔۔۔ جو ہونا تھا آخر وہ ہو کر رہا

صبح چلے گا شام چلے گا
ہمت ہی سے کام چلے گا

کسی کو اگر آپ سے دکھ نہ پہنچے ۔۔۔ یہی آپ کی مہربانی بہت ہے

یہ بھلا ہی ظرف ہے حیرتؔ
سن رہے ہیں بری بھلی سب کی

متفرق اشعار کے بعد غزلیں کیسی رہیں گی۔

غزل

ایک تو خود اپنی غمگینی
اس پر ان کی نکتہ چینی

اپنی شیرینی بھی تلخی ہے! ۔۔۔ ان کی تلخی بھی شیرینی
کھل جائے گا یہ بھی اک دن ۔۔۔ کس نے کس کی راحت چھینی
کافی ہے کیا یہ کہہ دینا ۔۔۔ سب حالات کی ہے سنگینی
کر نہیں سکتی ہم کو قائل ۔۔۔ صرف عبارت کی رنگینی
ہے یہ دغا وہ جرم محبت ۔۔۔ ہے جس کی پاداش یقینی
کیا معلوم کسی کی شکل ۔۔۔ خودداری ہے یا خود بینی

اپنے دامن کو بھی دیکھیں ہو منظور جنہیں گل چینی
اچھے اچھوں کو اے حیرت
لے ڈوبی ہے، بے آئینی

(رامپور منگل ۴ ستمبر ۵۶ء)

غزل

آؤ غور کریں دل کیا ہے
حق کیا شے ہے باطل کیا ہے

ایک لطیفہ ایک کرشمہ ایک معمہ ہے دل کیا ہے
جی تو رہے ہیں ہم بھی لیکن اس جینے کا حاصل کیا ہے۔
چل تو رہے ہیں چلنے والے لیکن ان کی منزل کیا ہے
حال نہیں تو قال سے حاصل رقص نہیں تو بسمل کیا ہے
تن آساں دنیا کیا جانے آسانی میں مشکل کیا ہے
غم کے مقابل دل کی حقیقت موج کے آگے ساحل کیا ہے
برپا ہو بھی گئی تو شب بھر عیش کی محفل محفل کیا ہے

کس سے پوچھیں کون بتائے
حیرت کا مستقبل کیا ہے

(سکھر بدھ ۱۰ جنوری ۶۲ء)

حیرت نے اپنی زندگی ہی میں بڑے چاؤ سے اپنا منتخب مجموعہ کلام مکتبۃ الحسنات رامپور کی شرکت سے چھپوا دیا تھا جس کو تقریباً سبھی رسائل نے سراہا۔ اختر شیرانی کے یہاں جب بھی حیرت کی غزل اشاعت کیلئے پہنچی انہوں نے عنوان آئینۂ حیرت ہی باندھا۔ حیرت اس پر ایسے ریجھے کہ اپنا منتخب مجموعہ کلام بھی اسی عنوان سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ پبلشر کے تساہل کی وجہ سے زیادہ تعداد میں اہل ذوق حضرات کے ہاتھوں میں نہیں پہنچ پایا۔

ترنم سے پڑھتے تھے اور مجھے اس سے بڑھ ہے، گلے باز شاعروں کو سننے سے بہتر ہے چھوٹے صالح محمد قوال یا۔ حبیب بینٹر کو سن لیا جائے لیکن حیرت کے ترنم میں ایک خاص قسم کا سوز و گداز پایا جاتا تھا۔ دفورِ جذبات سے آواز نغمۂ غمگین بن کر رہ جاتی تھی اور دلوں میں اترتی چلی جاتی تھی لیکن ایسا ہر غزل کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ خالق دینا ہال کراچی کے مشاعرے میں جو ریڈیو پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا ان کی غزل ناکام رہی وہ مشاعرے میں پڑھنے کی چیز بھی نہیں تھی۔ یعنی سنانے کے نہیں پڑھنے کے قابل صرف اس شعر پر تھوڑی سی داد ملی

کیا ہم دو کلیوں کی خاطر
گلشن میں دامن پھیلاتے

احباب کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور جھانسے میں آجانا کوئی مشکل نہ تھا دہلی مرحوم میں حیرت خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "اردو مجلس" کی ماہانہ ادبی نشست کے روحِ رواں تھے مرحوم فرمائشی اشعار کہنے کے اہل نہ تھے اور نہ طرح میں غزل کہنے کے شائق۔ نعت، حمد، سہرا، قصیدہ میں تقریباً بند تھے ان کا محبوب میدان غزل اور صرف غزل تھا چھوٹی بحر میں سہل ممتنع سادگی و پرکاری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے آپ کو کلام حیرت میں بغیر کسی تجسس کے مل جائیں گے، مفلوج ہونے کے بعد مرحوم کی ہر غزل اور بیشتر اشعار کسی نہ کسی سانحے واقعے یا گھریلو اور اپنوں کے کچوکوں کی یادگار ہیں۔

شاگرد کسی کے نہیں تھے اور نہ کوئی ان کا شاگرد تھا یوں وہ میکش اکبر آبادی، حامد حسن قادری، جوش ملسیانی اور دیگر احباب سے بے تکلف مشورہ سخن فرماتے اور احباب کی اصلاح بغیر کسی ناگواری کے قبول کر لیتے تھے اس میں ترجیح کسی کو نہیں تھی، ایک عام آدمی اگر ڈھنگ کی بات کہتا تو ان کی جبیں شکن آلود نہیں ہوتی، ہاں سلطان اشرف کا اوسط درجے کا شاعر لکھنا کھل گیا تھا۔

ایک آدھ غزل فارسی میں بھی موجود ہے۔ مزاحیہ بھی کہتے تھے اور زبید لاہوری کے "نمکدان" میں چھپتے تھے، بعض اوقات مہینوں قلم و کاغذ سے دور رہتے تھے اور یہ قبض

کسی نہ کسی اندرونی چوٹ مثلاً گھر میں طعن و تشنیع سے ہی ٹوٹتا تھا۔

غزلوں کا معاوضہ بھی لے لیتے تھے مگر اکثر احباب کو بلا طلب غزلیں بھجوایا کرتے تھے۔ واحدی صاحب نے پچاس روپے منی آرڈر کر دیئے یہ بلا طلب غزلیات کا معاوضہ تھا منی آرڈر واپس کرنا بد تہذیبی تصور کیا، وصول کیا اور اپنی گرہ سے منی آرڈر فیس ادا کر کے کوپن پر لکھ دیا۔ آپ سے کیسا معاوضہ، وضعداری کا یہ عالم کہ کلفٹن سے نارتھ ناظم آباد جناب واحدی کے یہاں جاتے تو دو دو چار چار گھنٹوں کی نشست میں سگریٹ کی للک تک محسوس نہ کرتے واحدی صاحب کے احترام میں کہ وہ ان چیزوں سے دور ہیں حالانکہ حیرت بلانوش تھے جی ہاں سگریٹ تک ہی رہے۔ جگر سے عقیدت کی حد تک محبت کرنے کے باوجود سراپا حیرت ہی رہے جگر نہ بن سکے پیتے چاتے بھی تھے اور بے پناہ، بشرطیکہ ملتی رہے، بیچارے تھے بھی تو ہر بات میں دوسروں کے رحم و کرم پر۔

گھر کی عافیت نصیب ہو تو سگریٹ پر حقے کو ترجیح دیتے تھے، میں نے انکو سگریٹ پیتے دیکھا ہے۔ اپنی تحریروں میں رامپور کے دوران قیام میں "چار مینار" کا ذکر کیا ہے میں نے "نیلو" سے جی بہلاتے ہوئے پایا، اس طرف اشارہ کیا تو سمجھ نہ سکے، وضاحت کی گئی تو فرمایا یہ کسی فلم ایکٹریس کا نام ہے تو آج سے الفقط، اس کے بعد "بولس" پینے لگے، بیس سگریٹ دن بھر میں ضرور پی جاتے ہونگے۔ یہ کوئی اعلیٰ تو کجا درمیانے درجے کے سگریٹ بھی نہیں تھے منہ سے لگی ہوئی کہتے ہیں کبھی چھٹتی نہیں، ہمارے حیرت بھی ناچار کم درجے کے سگریٹ پی کر اپنا جی جلاتے رہے، سگریٹ کے خالی پیکٹ جمع کر کے مضامین لکھا کرتے تھے۔

درگاہ بخاری میں تو لنگر سے جو کچھ مل جاتا تھا کھا لیتے تھے اور لوٹ پوٹ کر ہضم بھی کر لیتے، لیکن کریلے، گوشت، پائے، پالک، کھچڑی، کباب وغیرہ پسندیدہ غذا تھی۔

کھیل جب وہ جیتے تھے، ہاکی اور فٹ بال سے شغف تھا بلکہ کھیلتے بھی رہے موہن بگان اور انگلستان سے آئی ہوئی ٹیموں کے مقابلے بڑے شوق سے دیکھتے، ایک بار ہاکی کھیلتے ہوئے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹی اور ٹوٹ کر جڑ بھی گئی۔

ایامِ شباب میں انگریزی دفتر کی نوکری کی رعایت سے سوٹ فرماتے تھے، کبھی کبھار

اچکن پہن کر تصویر اتروا لیا کرتے۔ شکن بستر بننے کے بعد تہبند اور بغیر کالر کی قمیض لباس تھا۔ ملنے والوں کی تواضع چائے سے ضرور کرتے۔ ایک بار ایک نووارد درگاہ بخاری پر پہنچے اور اس کے بعد سیدھے حیرتؔ کے حجرے میں آئے، فرمایا شملے میں آپ کو دیکھا تھا۔ جب یہ سنا کہ آپ کراچی آگئے ہیں تو جی چاہا آپ سے ملوں، ملے اور چلتے وقت سو روپے نذر کر گئے۔ حیرتؔ آخر تک پہچان نہ سکے، اور یہ واقعہ بھی تھا کہ یہ غائبانہ تعارف تھا بھی یکطرفہ شملے میں پلے بڑھے، جوان ہوئے۔ لیکن وہاں کی سردی اور برف باری سے ہمیشہ گھبرا جاتے تھے۔ حیرتؔ شملوی کبھی کبھار اس انداز میں دستخط فرماتے ورنہ عام طور پر عبدالمجید حیرتؔ ہی لکھتے۔

جناب ضیاء الدین احمد برنیؔ اور حیرتؔ جب آتش جوان تھا رقیب رہ چکے تھے، ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا تھا، برنی صاحب نے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا تو میں موصوف کو کلفٹن لے گیا اور حیرتؔ سے ملایا، دو گھنٹے پرانی یادیں تازہ کی جاتی رہیں، رقابت کا قصہ یہ ہے کہ کسی سرکاری عہدے کے لئے حیرتؔ شملے سے اور بمبئی سے برنیؔ صاحب امیدوار تھے، برنی صاحب کی سفارش سروجنی نائیڈو تک کر چکی تھیں لیکن وٹھل بھائی پٹیل کے استعفیٰ نے پانسا پلٹ دیا اور حیرتؔ شادکام ہوئے اس ملاقات میں برنیؔ صاحب نے غزل کی فرمائش کی نہ نہ شعر و سخن کی طرف آئے، مرحوم نے مجھ سے کہا، برنی صاحب نثری ہیں شعری نہیں۔

پاکستان آنے کے بعد احباب کے کہنے سننے اور حالات کی مسلسل اور نامنتا ہی یورش سے عاجز آکر اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ "ادارہ مصنفین پاکستان" سے صدر مملکت کے حکم سے ماہانہ وظیفہ جاری ہو جائے، تحریک کر دی گئی تھی لیکن،

ع کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

مرحوم نے اس پیشکش کو بکراہت قبول کیا تھا۔ جبھی تو اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی چل دیئے۔

اس مردِ غیور نے جس تنگدستی اور مفلوک الحالی میں زندگی گزاری اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب رامپور میں پنشن حاصل کرنے کیلئے ڈاک خانہ رکشا میں لد کر پہنچے

تو وہاں ان کو ایک پرانے رفیق نجم الحسن نقوی، نظر پڑے، مرحوم نے ہاتھ کے اشارے سے متوجہ کرنا چاہا۔ وہ بھکاری سمجھ "معاف کرو بابا" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ نقوی صاحب کو جب اصل واقعہ کا علم ہوا تو گھر پہ آ کر معذرت طلب ہوئے۔ یہاں ایک لطیفہ اور نقل کرتا چلوں، آنے والوں میں تنک مزاج شاعر شاد عارفی بھی رہا کئے ہیں، یہ بزرگ جب بھی آتے رکشا کا کرایہ حیرت سے دلواتے۔ یہ مروت میں دے دیتے لیکن بعد میں ہر ایک سے شکایت کرتے۔

وظیفے کی طرح حشر پنشن کا بھی وہی ہوا، دو سالہ جدوجہد کے بعد پاکستانی شہریت اور پنشن کے کاغذات مکمل ہوئے لیکن حیرت رخصت ہو چکے تھے، توقع تھی کہ یہ روپیہ سوگوار متعلقین کے کام آئے گا، لیکن مرحوم کے وہ دوست جن کی تحویل میں کاغذات تھے اللہ کو پیارے ہوئے اور متعلقہ فائل نہ جانے کون لے اڑا۔

ع رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مرحوم سنی العقیدہ تھے، مذہبی مسائل پر آزادانہ گفتگو کے قائل تھے لیکن دلیل کا جواب دلیل چاہتے تھے، لاٹھی کلہاڑی نہیں، اقبال اور مولانا مودودی کے مداح تھے فرماتے تھے دین اگر کہیں ہے تو مولانا مودودی کے یہاں یعنی ان کی تحریر و تقریر میں، مولانا ابوالکلام کو گاندھی زدہ فرماتے تھے۔

نماز بھی پڑھتے تھے، خالد جاوید شمسی راوی ہیں کہ میں کچھ سالن وغیرہ لے کر پہنچا تو نماز پڑھ رہے تھے اس انہماک سے کہ نہ تو انکو میرے آنے کا علم ہوا نہ جانے کا پتہ چلا۔

جب کراچی کے ادبی حلقوں میں حیرت کی آمد کی خبر عام ہونے لگی تو نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، ممتاز حسن، پیر حسام الدین راشدی، زیڈ اے بخاری، ماہر القادری، نخشب، تابش دہلوی، ضیاء الدین احمد برنی نے جا جا کر مرحوم کا جی بہلایا، واحدی صاحب کے یہاں کے آخری پھیرے میں مرحوم نے فرمایا تھا، آج میں اپنا کلام نہیں کلام الٰہی سناؤں گا اور پھر قرأت شروع کر دی جو انہوں نے علیگڑھ میں سیکھی تھی، کیا یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ سفر کا اشارہ الہام ہو چکا تھا۔ آخری غزل بھی حسب سابق سادگی اور پرکاری کا مرقع ہے۔ یہ غزل سگریٹ کی ڈبیہ کے اندر استعمال کئے جانے والے چمکدار کاغذ پر موت سے چند گھنٹے پہلے لکھی گئی تھی۔

اس کے تیور قابل دید ہیں۔

غزل

پہلے بیج تو بونا ہوگا
پھر جو کچھ ہے ہونا ہوگا

جب تسبیح بننا ہو گی — دانہ دانہ پرونا ہوگا:
پیتل سے دھوکا مت کھانا — یہ نہ سمجھنا سونا ہوگا
سورج نکلے گا تو روشن — گھر کا کونہ کونہ ہوگا:
شبنم کو ہاں شبنم ہی کو — پھولوں کا منہ دھونا ہوگا
دنیا ہے یہ اس میں خوشی کو — غم کے ساتھ سمونا ہوگا
فطرت کا قانون یہی ہے — پانا ہے تو کھونا ہوگا
موجیں ناؤ ڈبو ہی دیں گی — جب منظور ڈبونا ہوگا
کس کو خبر تھی دو دن ہنس کر — اک مدت تک رونا ہوگا
ہو جائے گا ان کی نظر میں — جس کو اونچا ہونا ہوگا

کام کئے جاؤ تم حیرتؔ
ہوگا جو کچھ ہونا ہوگا

(بدھ ۹-۹-۶۴)

مرحوم اس غزل کو بیاض میں نقل نہیں کر پائے تھے، اصلی کاغذ جناب جلیل قدوائی نے نمبر اور دستخط فرما کر "پن" کر دیا ہے۔ یہ بیاض جلیل صاحب اور واحدی صاحب کے مطالعے میں رہ چکی ہے۔

"جب وہ مرنا چاہتے تھے مرے نہیں
جب جینا چاہتے تھے مر گئے"

کیسی پتے کی بات حیرتؔ کے باب میں شاہد احمد دہلوی مرحوم کے قلم سے نکل

گئی تھی، واقعی حیرت ابتدائے ایام علالت میں بیزار ہی رہے ہوں گے۔ لیکن کراچی اگر ان کی خواہش یہ تھی کہ ساجدان کی زندگی میں بی اے کر لے دوسرے عافیت کا مکان ہو اپنی اپنی ذہنی کاوشوں کو ترتیب دے کر چھپوا ڈالیں، کسی کیا کئی علمی اداروں سے منسلک ہونا چاہتے تھے بعض اداروں کا تو ادبی کام کرنے بھی لگے تھے لیکن۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حیرت کی موت جس کسمپرسی میں واقع ہوئی وہ بڑی عبرت انگیز ہے۔ اپنا کوئی پاس نہ تھا بیوی کہیں بچیاں کہیں، بھائی ایک بمبئی میں دوسرا دہلی اور تیسرے ٹھٹھہ میں اقامت گزیں۔ اکلوتا بیٹا جس کے چہرے پر پھنسی دیکھ کر بوڑھے اور لاچار باپ نے محسوس کیا گویا پھنسی بیٹے کے نہیں باپ کے چہرے پر ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ روح کی پرواز سے چند گھنٹے پہلے بیٹا باپ سے مل گیا تھا۔ روایت ہے کہ مغرب کے بعد بیٹھے اپنی تازہ غزل گنگنا رہے تھے کہ دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا، غلط خوراک کی وجہ سے وہ سمجھے پیٹ کی خرابی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ سوڈے کی بوتل بطور علاج کے منگوا کر پی حالانکہ عام طور پر ان مشروبات و ماکولات سے مرحوم کو پرہیز ہی رہا، سوڈا پینے کے بعد دو چار ڈکار آئے اور وہ یہ کہہ کر لیٹ گئے 'اب میں ٹھیک ہوں'، تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ روح تن سے جدا ہو گئی اور وہ سکھ کی نیند سو گئے۔ دوسروں کی تو بہت کچھ سن گئے لیکن اپنے دل کی لگی کو وہ سینے میں دبائے چلے گئے روح کی پرواز کا مرحلہ جس آسانی سے طے ہوا زندگی کی بے پناہ اور لرزہ خیز سختیوں کا ازالہ تو ہو ہی گیا ہوگا بدھ کا دن تھا شام کے آٹھ بجے تھے ستمبر کی نویں تاریخ سنہ ۱۹۶۴ء

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۲/دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء

ڈپٹی صاحب والے

عروس البلاد کراچی میں مجھے ۱۹۴۹ء کے آخر میں ڈال دیا گیا تھا۔ سرپرستی جناب سید رئیس احمد جعفری کی حاصل۔ بڑی محبت، ہتھیلی کے پھپھولے اور بالکل اپنے بچوں کی طرح گھر میں رکھا، بڑے گھروں میں آمد و رفت بھی خواص ہی کی رہا کرتی ہے۔ آنے جانے والوں میں یہ کون ہیں، شاہد احمد دہلوی کی صاحبزادی ہیں، دھوم ان کی انگریزی زبان میں مہارت کی مچی ہوئی تھی۔ مارٹن روڈ، پیر الٰہی بخش کالونی سے ملحق محلہ ہے، شاہد صاحب کا اشتیاق دید کشاں کشاں مجھے وہاں لے گیا۔ نذیر احمد کے پوتے، بشیر احمد کے بیٹے دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے والے صاحب طرز ادیب ماہنامہ ساقی کے مدیر، جس نے خود تو چند ترجموں پر اکتفا کرکے بہتوں کو قلم پکڑنا سکھا دیا، ایک تجربہ کار ناشر اور بلند پایہ موسیقار شاہد احمد دہلوی گویا اک قیامت کا سامنا، نہ دل دھڑکا نہ گھبرایا، عمر ہی ایسی تھی، ایک کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، مجھے قریب پاکر چشمے کی گہرائیوں سے جگمگاتی ہوئی سوالیہ نظریں مجھ پر گاڑ دیں، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مدعا بیان کیا بہاولپوری ہونے کی رعائت سے زراعت وہاں کی آب و ہوا، تعلیمی سلسلے وغیرہ کی پوچھ گچھ فرماتے رہے باتیں تو یونہی سی اور ادھر ادھر کی رہیں، لیکن لکھا میری بیاض میں مرحوم نے اردو کے حق میں۔ ملاحظہ فرمایئے

اردو کو پاکستان میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اگر اردو نہیں تو پاکستان کیوں

شاہد احمد دہلوی ۲۸-۶-۶۵۳

سودا مرحوم سے سلسلہ مراسلت قائم کرنے کا سوار ہوا۔ کچھ لکھنے لکھانے کہنے سننے کی تمیز ہی کیا تھی، بحثیت ایک دوست کے لکھ مارا، ظاہر ہے وہ مجھے پہچان نہیں سکے۔

تب اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ معذرت خواہانہ لکھا کہ محض آپ کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بیہودہ حرکت سرزد ہوئی ورنہ میں تو آپ کا خوشہ چیں ہوں اور خورد، اجنبی الگ، صبر و تحمل سے برداشت کر گئے۔ صرف اتنا لکھا کہ تعارف حاصل کرنے کیلئے اس قدر پر اسرار بننے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بعد گاہے گاہے خط داختار ہا، وہ نیاز فتحپوری کے پیرو تو نہیں تھے، مگر خطوں کی رسید کا انداز تقریباً وہی تھا۔ مختصر یک سطری "گنجینۂ گوہر" چھپی میں نے قیمتاً طلب کی، جواب آیا "میں نے نہیں چھاپی۔" اختر علی خاں زبردستی جعفری صاحب کو ادارت سونپ چکے تھے یہ گویا "زمیندار" کا سنبھالا تھا، ساقی کا جوش نمبر چھپ چکا تھا رئیس احمد جعفری مرحوم کے قلم سے چند اداریئے میرے ہاتھ لگ گئے وہ میں نے اشاعت کی غرض سے پیش کرنا چاہے جواب ملا "جوش صاحب کے متعلق مضامین کا سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔" مولوی عبدالحق پر لگی لپٹی رکھے بغیر اگر کوئی لکھ سکتا تھا تو یہی شاہد صاحب مگر مصلحت کی دراندازی نے ان کے بھی ہاتھ کہنا چاہیئے کاٹ کر رکھ دیئے۔ اس پر احتجاج کیا گیا تو ٹکا سا جواب آیا "مولوی صاحب مرحوم کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ بے تکلفی نہیں برتی جا سکتی" نجانے وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ایک بھاری بھرکم نمبر جوش ملیح آبادی کی مذمت میں مرتب کرا دیا تھا۔ غالباً اس لئے کہ جوش نے براہ راست ان کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اصل یہ ہے کہ شاہد صاحب کی جبس شاہانہ کروفر، عزت اور وقار، ٹھاٹ باٹ، اعزاز و تکریم سے گزری تھی، اس کا سرسری جائزہ لینا چاہیئے۔ دادا نذیر احمد بقول ان کے "مارا بدارا لڑکا کسی نے نہ پوچھا تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں" بجنور سے دلی آئے تو اللہ میاں کے مہمان کی حیثیت سے مسیت ہی میں ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر سو جاتے، صبح آنکھ دیر سے کھلتی تو ملاجی کی دولتی سے صف بھی کھل جاتی اور آنکھیں بھی، دکھ اٹھا کر سکھ یہاں تک سمیٹے کہ نذیر احمد سے ڈپٹی نذیر احمد کہلائے، یہ آخری بڑا عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی کالے کو مل سکتا تھا، پھر وہ ڈپٹی زیادہ نذیر احمد کم مشہور ہوئے، حاکم ضلع رہے، اسلام دوست ہوئے تو دنیائے علم و ادب میں حکمت کے موتی رولنے لگے، حکومت یہاں بھی ہاتھ سے نہ گئی۔

سربلند رہے، ادبی حلقوں میں خوب نام پایا۔ زبان و بیان پر وہ عبور کہ قرآن کا با محاورہ ترجمہ کر ڈالا، معنویت برقرار رکھنے کیلئے احتیاطاً واوین میں جملے بڑھا بھی دیئے، مگر مذہبی حلقے ٹھنڈے پیٹوں کسی کی کب سنتے ہیں یلغار اس حد تک بڑھی کہ نذیر احمد کے رُدّ میں مولانا اشرف علی تھانوی بھی موجود ہیں۔ نذیر احمد نے ایک عیسائیؔ کے ہفوات کے جواب میں "امہات الامہ" لکھی تو نوبت بہ آتش زنی رسید۔ آج وہی تفسیر اور دوسری چیزیں ترزجان بنی ہوئی ہیں، پندرہ سو پنشن کے آتے تو نذیر احمد ردیوںؔ کا چبوترہ بنا کر بچوں کو اس پر بٹھاتے اور کہتے اتنی تو تمہاری تنخواہ بھی نہ آوے گی، سر سیدؒ آنے کو تو لاہور آگئے، نیچری نیچری کے شور سے فضا کچھ ایسی بگڑی کہ شاہی مسجد میں مٹھی بھر سامعین کبھی سر سیدؒ اور کبھی وسیع و عریض دالان اور در و دیوار کو حسرت بھری نظر سے تکتے تھے، رائے عامہ کو ہموار اور ہمنوا کرنے کیلئے نذیر احمد علیگڑھ سے لاہور پہنچے، ایک ہی معرکے میں مشکل آسان کر دی، باد سموم کو نسیم صبحگاہی میں بدل دیا۔

دادا کے بعد باپ بھی حاکم ضلع بنے، رہنے کیلئے اعلیٰ درجے کا سجا سجایا مکان، پہننے اوڑھنے کو اتنے جوڑے کہ ایک بار کا پہنا ہوا جوڑا دن پھرنے کا منتظر پڑا رہے، سینکڑوں جھتے کتابوں سے پٹے ہوئے کمرے، سواری کیلئے بگھیاں، کئی لاکھ روپیہ پس انداز کیا۔ تین چار ہزار ماہانہ کی یافت، بقول بیٹے کے "دلی کے نام نہاد نوابوں سے زیادہ ٹھاٹ کی زندگی گذارتے" سرکار میں بات بنی ہوئی تھی، استغنا کا یہ عالم کہ خان بہادری کا خطاب تجویز ہوا، انکار کر دیا، آنریری مجسٹریٹی یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ علمی مشاغل میں فرق آتا ہے، گھر پہ کاتب مقرر تھے، بیمار پڑتے تو ڈاکٹر انصاری بلائے جاتے، مردانہ اور زنانہ مکان الگ الگ، پردے کی یہ سختی کہ بارہ برس کا لڑکا زنان خانے میں نہیں جا سکتا تھا، مرے تو تیرہ وارثوں میں بٹنے کے بعد شاہد صاحب کے حصے میں پچاس ہزار روپے نقد اور ڈھائی سو ماہانہ کے کرائے کے مکان آئے غرض علم و عمل دین و دنیا سے ہر طرح سرفراز۔

خود شاہد صاحب کا حال سنیئے۔ باپ کے ساتھ چار برس کی عمر میں دکن سے آئے دادا کے سلام میں اشرفی پائی، لڑکپن میں ماسٹر ناظر حسن اور عزیز الحسن لڑکوں کو بے دردی

سے مارتے مگران پر خاندانی وجاہت کی وجہ سے ہمیشہ نظر کرم ہی رہی، کانونٹ اسکول میں بٹھائے گئے، جہاں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا، اور شاہد کا شمار گوروں میں کبھی نہیں ہوا" شاہد رعنا" کی تہمت سے یکسر آزاد، ماں مری تو انگریز نرسیں تربیت اور نگہداشت کیلئے مقرر کی گئیں علیگڑھ پہنچے تو نگرانی بطور خاص ڈاکٹر ضیاء الدین کی تھی، بورڈنگ میں ذاتی ملازم اور پرائیوٹ ٹیوٹر دونوں حاضر، بلیس بیس روپے ماہانہ جیب خرچ، ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا، رستم ہند اور گونگے کی کشتیاں دیکھیں، بڑے غلام علی کو سنا، پنجابیوں میں رہ کر پنجابی سے نابلد رہے۔ اقبال سے بھی ملے، یہاں سے بدکے تو دلی جاکر بی اے آنرز کیا، دولہا بنے تو والد کی روشن خیالی کے سبب طوائفوں کے مجرے دھوم دھام سے ہوتے۔ بچپن میں بائیسکوپ بھی ابا کے ساتھ دیکھے، کچھ کرنے دھرنے کے دن آئے تو کام کا کام کوئی سامنے ہی نہ تھا لگی بندھی جائیداد کی آمدنی، محنت مشقت کا کیا سوال، البتہ اس اقتباس سے کاروبار شوق اور انسانی سیرت کے چند پہلو ضرور جگمگا رہے ہیں۔

بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو خیر میرا فرض تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا اور بڑے بڑے خیالات دل میں لاتا تھا تو شائد اللہ میاں مجھے اس لئے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المریض بیوی کو سوکن کا دکھ نہیں پہنچایا، حالانکہ دو نہیں بیسیوں لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں، میں ان سب کو بہلاتا رہا اور ان سے محبت جتاتا رہا مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کی اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہ روی اختیار کی ویسے دس سال کی عمر سے میں افلاطونی عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں حلیہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد بعض شادی شدہ سابقہ محبوبائیں اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔

ایسے میں پیٹ بھر کے نہ بگڑنا کردار کی بلندی کا پتہ دیتا ہے، وقت گزاری اور

لاہوریوں کی ریس میں "ساقی" کا ڈول ڈالا اور جوں اس وقت رنگی جب ماموں نے بتایا پیارے بھانجے چونتیس ہزار تو خالصے لگ چکا آئندہ کیا ارادے ہیں، ذاتی دلچسپی یہیں سے شروع ہوئی اور قدم ادارت سے نکل کر کوچہ نشر و اشاعت اور طباعت میں جا پڑے۔ کام اپنے ہاتھ میں لینا تھا کہ دو ہی چار برسوں میں ایک ڈھرے پر آ گیا۔ ضخیم و عظیم نمبر نکلنے لگے پھر تو یہ حالت تھی کہ کبھی میراجی بار بار کے تقاضوں اور بلا طلب سودوں کے نذرانوں کی بنا پر دھتکارے جانے لگے، منٹو نے پہلی ملاقات میں دو دن کی لی تو باتوں میں اڑا دیئے گئے کرشن چندر کشمیر کی وادیوں میں بیٹھ کر ناول لکھنے کی آرزو سینے میں لیے پھرتے تھے، ایک ہزار روپیہ ان کے خوابوں کی تعبیر بن کر جھولی میں گرا شوکت تھانوی کو معاوضے منی آرڈر سے جاتے رہے، پیشگی لے کر ہضم کر گئے تو تقاضا نہ کیا، عظیم بیگ چغتائی کے ابتدائی تیرہ مضامین مختلف رسائل نے ناقابل اشاعت قرار دے دیئے تھے۔ نیرنگ خیال اور ساقی میں چھپے اور چمکے چغتائی کے تقریباً سبھی ناول مکتبہ ساقی نے شائع کئے، مرتے مرتے بھی بے حساب و کتاب دو سو لے مرے، شاہد نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بیوہ کو سب کتابوں کے حقوق لے جا کر واپس کر دیئے، وضعداری کی یہ کیفیت منٹو کی موت پر بھی باقی رہی، جھٹکے سے لاہور گئے نہ جانے کا علم نہ آنے کی خبر اور یہ سب کچھ گویا برے حالوں میں تھا، کبھی کبھار لاہور والوں سے بھی ٹھن جاتی تھی، شلوارانِ ادب اسی زمانے کی لاہور والوں پر یادگار پھبتی ہے۔

مولانا صلاح الدین سے بھی الجھ گئے، اس مردِ شریف نے وہ عنوان ہی "ادبی دنیا" سے اڑا دیا۔ بمبئی سے فلمی بلاوے آتے رہے مگر وہ اپنی دلی کے گلے کا ہار بنے رہے، چند روزہ دوری آتش شوق کو بھڑکاتی ہے، گرمیوں میں چیل انڈا چھوڑتی تو یہ دلی چھوڑ دیتے۔ گاہے مسوری اور کبھی ڈیرہ دون چلے جاتے۔ جس محلے میں رہتے تھے بزرگوں کا بھرم اس طرح قائم رکھا کہ تقسیم ہند تک پورا خاندان ڈپٹی صاحب والے کہلاتے رہے۔ دلی میں ترقی پسند اور جدت پسند ادیبوں کے مڈ سمجھے جاتے تھے، اتنی انجمنوں کے صدر ممبر اور سیکرٹری رہے کہ یاد بھی نہ رہتا، ہر شخص مکتبہ ساقی میں چھپنے کا تمنائی، پاکستان بنا ہے تو اسکی بنیادوں میں مکتبہ ساقی کا دو لاکھ اور ادیبوں کو پیشگی دیئے گئے پندرہ ہزار روپے کام آئے۔

ان حالات میں کہ شاہد صاحب کو ہر طرح کا آرام میسر تھا، عزت شہرت صحت جسمانی و روحانی دنیا بدلتی ہے بھرا پرا گھر رسا بسا گھر دنیاوی سازوسامان کے علاوہ بہت بڑا علمی خزینہ چھوڑ کر ہجرت فرماتے پاکستان ہوئے، پہلا مرحلہ قلعے میں گویا نظر بندی کا تھا چلے تو پٹیالہ کے قرب دجوار میں وحشیوں نے ریل گاڑی روک کر آدھی تو کاٹ کر رکھ دی، یہ بقول خود سخت جان تھے بیمار بچی کو سینے سے لگائے دبکے بیٹھے رہے، انہتے اور شریف لوگ اور کرتے بھی تو کیا، کیسا ہیجانی اور جنون خیز دور ان پر گذر گیا۔ لاہور وارد ہوتے سال چھ مہینے سے زیادہ نہ ٹک سکے یہ عجیب بلکہ عزیب اتفاق ہے، لاہور مدت سے اردو کا گڑھ ہی نہیں سرپرست بھی رہا ہے، ظفر علی خاں جیسا اخبار نویس اور زود گو، اقبال سا مفکر طناز سالک، غلام رسول مہر بھی یہیں پلے بڑھے پھلے پھولے، سینکڑوں نام اور بھی گنوائے جا سکتے ہیں، محلوں کے محلے ادیبوں اور شاعروں سے آباد، حکیم احمد شجاع "لاہور کا چیلسی" کے عنوان سے نشاندہی کر چکے ہیں، مگر اردو والوں کی پناہ گاہ کیا زرعی اور کیا شعری ہر اعتبار سے بنجر اور خشک سرزمین کراچی نامی فردوس بر روئے زمیں ست کا مصداق بنی۔ ہاتھ پاؤں مار کر شاہد صاحب یہاں ساڑھے چار سو روپلی پر ریڈیو میں ملازم ہو گئے جس سے دو وقت کی روٹی مشکل سے جڑتی تھی، ش ق کی درستی کا امتحان روزنامہ حریت کے نصر اللہ خاں نے لیا اور حفیظ جالندھری نوحہ خواں تھے کہ سنتے ہو اظہر پاکستان میں شاہد نوکری کر رہا ہے۔ دو مہینے بیمار پڑے تو تنخواہ کٹ گئی، معلوم شد کہ دنیا میں کوئی کام بے کار کبھی نہیں گیا، وہ ذوقِ موسیقی اور موسیقی بھی کلاسیکی، جس پر آوازے ابتدائے عشق میں "گانے بجانے" کے کسے گئے ہوں گے، گانا سیکھے ہوئے تھے ایسا ویسا نہیں، استادوں میں شمار ہوتا تھا، پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے وہی کام آیا، سر چھپانے کیلئے تنگ و تاریک بغیر نل اور بجلی کے دو کمروں میں چوبیس آدمی بھر گئے، اللہ اللہ کہاں وہ لق ودق حویلیاں اور کہاں ایک کابک نما کوارٹر، دفتر (جن کے کبھی ذاتی دفتر تھے) جانے کیلئے چرمراتی ہوئی سائیکل اور پھر شمس زبیری کے اشتراک سے موٹر سائیکل جس سے ایک روز شاہد صاحب تو کہیں لڑھک گئے، زبیری یہ جا وہ جا پلٹ کر جو دیکھا تو نشست خالی، بدحواس

شاہد احمد دہلوی



۱۹۰۶ء ——— ۱۹۶۷

الٹے قدموں دوڑے حضرت کو تلخیٔ حیات پر خندہ زن پاکر جان میں جان آئی، موٹر کا کھڑاک مرحوم نے کبھی کھڑا ہی نہیں کیا، دلی میں ٹرام کا اجازت نامہ بنوا لیا تھا اسی سے کام چلاتے رہے، ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے علاوہ مضمون نگاری کے صلے میں معاوضے بھی ملنے لگے، کبھی خود دیا کرتے تھے، ساقی کو حیاتِ نو بخشی اور مرتے دم تک خونِ جگر سے سینچتے رہے، اشتہار ساقی میں اکا دکا ہی دیکھنے میں آئے، ساقی اور شاہد، شاہد اور ساقی یک جان دو قالب تھے، عزتِ نفس کا پاس تھا ورنہ اشتہاروں کی کیا کمی تھی، وہ صحیح معنیٰ میں گرم سرد زمانہ چشیدہ ہی نہیں گزیدہ تھے، خودداری عزم و عمل اعلیٰ ظرفی اور حسن کارکردگی سے جی گئے، اس پس منظر اور زمانے کی ناقدر شناسانہ یورش کو دیکھتے ہوئے شاہد صاحب کی نازک مزاجی میں جھلاہٹ کا عنصر حیرت انگیز نہیں عبرت آموز ہے، یاد ماضی عذاب جان بنی ہوئی تھی لے دے کے باپ دادا کا نام رہ گیا تھا۔ جب اس پر بھی ایک ایسے آدمی نے نام دھرا جس نے اس قسم کی بھکیڑیں نہیں اٹھائی تھیں بلبلا اٹھے شاہد صاحب۔ مثل مشہور ہے نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ جوش صاحب کے دوستوں کا حال یہ تھا کہ ”مرتا کیا نہ کرتا احباب نے ضد کی آنکھیں نکال نکال کر ضد کی کہ میں اس مضمون کا جواب دوں اور ضرور دوں“، وہاں کیا دیر تھی الفاظ پرا باندھے تو کھڑے ہی رہتے ہیں، خوب جلی کٹی سناتے چلے گئے۔ جلے دل کے پھپھولے کس لب و لہجے میں پھوڑے گئے، دیکھ لیجئے۔ ”مفت کی وہ پیتے ہیں جن کی جیب میں خاک اڑتی ہو، جن کی غیرت مفلوج ہو کر رہ گئی ہو اور بوٹ پونچھئیے خاندانوں یا سود خوار ملاؤں یا غاصب حاکموں کے پٹھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لیتے اور وہیں تربیت پاتے ہیں“ وہ جو ناک پر نذیر احمد کی کتابوں میں لفظی تغیر و تبدل کی مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے اس طومار سے تو تلوؤں سے لگی اور تالو سے نکل گئی، شاہد نے حق تو یہ ہے خاکہ نگاری کا حق ادا کر دیا تھا، محظوظ تو جوش بھی ہوئے ہوں گے مگر اس لطف کو یاروں نے باقی ہی کہاں رہنے دیا، وہ جو رہ نوردانِ کوچۂ عشق سے پیر آسماں کو رہا ہے جوش اور ان کے دوستوں کا بھی معاملہ کچھ اس سے ملتا جلتا سا ہے، حضرت جوش نے تو لوٹ پیٹ کر ایک ہی مضمون لکھا تھا

وہاں شاہد صاحب قبلہ نے جواب الجواب کے طور پر ایک پورا نمبر دھر گھسیٹا، اردو دنیا میں میں تو یہی کہوں گا، ساقی ایک اچھا اضافہ کر گیا، اس بیاباں میں کوئی اور ایسا مجنوں نظر نہیں آتا جس نے شخصیت کے تمام پیمانے اس بری طرح سے توڑ ڈالے ہوں کہ داستانوں کے ڈھیر لگ جائیں، یہ سہرا بھی شاہد صاحب کے سر رہا۔

بات مرحوم کی خطوط میں مختصر نویسی سے چلی تھی، حیرت شملوی مرحوم کے خط طلب کئے وہی سو کی ایک بات " میں کسی کے خط محفوظ نہیں رکھتا " اور اس محفوظ نہ رکھنے کی علت میں نجانے کیا کیا نوادر ردی کی نذر ہو گئے ہوں گے۔

" رگِ تاک " کے نام سے ایک ماہنامے کے اجرا کی جی میں سما گئی، اجازت نامے کی درخواست اعلیٰ سرکاری دفاتر میں کہیں طاقِ نسیاں پہ دھری ہو گی، مضمون کیلئے لکھا گیا تو عدیم الفرصتی آڑے آئی مشورہ تو خیر نہیں کہہ سکتا انتباہ یہ کہ " یہ تو گھاٹے کا سودا ہے کر کے دیکھ لیجئے " میں نے ساقی کی زبان پر بزعم خود اعتراض جڑ دیا تھا، جواب " مفصل " آیا " سب لکھنے والے ٹھیٹ اردو نہیں لکھتے نہ ہم ایڈیٹر اس کا مطالبہ کسی سے کرتے ہیں کہ سب دِلّی کی ٹکسالی زبان لکھا کریں جو کچھ آج کل کے ادیب اور شاعر لکھ رہے ہیں ساقی انہی کا آئینہ دار ہوتا ہے اردو میری ہی زبان نہیں ہے آپ سب کی بھی ہے میں تو اپنی زبان پر ساری عمر " رحم " کرتا چلا آرہا ہوں بقول آپ کے " خالص " پاکستانیوں کو اپنی قومی زبان پر رحم کرنا چاہیئے۔ اب یاد نہیں پڑتا یہ خالص یا بناسپتی پاکستانی کی اصطلاح خود میں نے گھڑ لی تھی یا کہیں سے نقل ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ زبانیں نہ کسی کے بنانے سے بنتی نہ بگاڑے سے بگڑتی ہیں، اور نہ کسی زبان کو مٹتے دیکھا ہے، شاہد صاحب خطوط میں فضولیات کو بہت کم جگہ دیتے تھے۔ کام کی باتیں، دور سے اکل کھرے اور کرارے لگتے تھے، شنید ہے کہ نرم دل تھے۔

مرحوم کو خاکہ نگاری میں جو کمال حاصل تھا، " گنجینۂ گوہر " پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے، محاورے ضرب الامثال وغیرہ بڑی چستی سے کھپاتے اور دلّی کی بولی ٹھولی کا مزہ اب تو بس انہی کے دم سے رہ گیا تھا۔ یہ ان کا ایک طرح سے تحفظ زبان کیلئے منصوبہ

اور مشن بھی تھا، ناکام خاکہ اپنا ہی لکھا، اپنے آپ سے انصاف نہ کر سکے، سچ ہے۔

ع سرگزشت اپنی جو لکھے تو قلم رکتا ہے۔

مشہور ناول نگار ایم اسلم پر غیر ضروری طوالت سے کام لیا، جذبات کی فراوانی اور احساس ممنونیت کا عمل دخل نمایاں ہے، پاکستان میں پہلی پناہ گاہ چونکہ ایم اسلم کی حویلی تھی اس لئے وضعدار آدمی کیلئے یہ تھی بھی بڑی آزمائش، ساقی میں ایک خاکہ مشکل گو عبدالعزیز خالد پر بھی نکلا اور وہ حق دوستی کی حد سے آگے نہیں بڑھتا، شاہد صاحب نے خالد کی پارسائی کا ڈھونگ باانداز دگر رچایا ہے۔ یوں وہ بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے تھے، اقبال کو نجانے پیغمبر خودی اور علامہ اقبال مرحوم کس رواروی میں لکھ گئے۔ کامیاب اور لاجواب خاکے میری نظر میں دو ہیں جوش ملیح آبادی اور عظیم بیگ چغتائی۔

شاہد صاحب نے مسلسل اور عبادت سمجھ کر کام کیا اس لئے پاکستان میں بھی تقریباً وہی مقام حاصل کر لیا جو دلّی میں تھا، غیر ممالک میں جا جا کر پاکستان کی نمائندگی کی جہاں صوبائی گورنروں تک نے استقبال کئے، اپنی جیب سے جاپان اور ہانگ کانگ کی سیر دیکھی ادارہ مصنفین پاکستان کی روح رواں رہے اور "نو پارٹی مین" مشہور ہوئے، اس سے چال چلن کی خوبی اور خرابی کا سراغ ملتا ہے۔ "افتخار ادب" صدارتی تمغہ بھی پایا۔

والد محترم سید مبارک شاہ جیلانی کی معیت میں شاہد صاحب کے ہاں جانا فون پر طے کر لیا گیا تھا اس لئے وہ منتظر ملے، بظاہر تندرست و توانا، سر کے بال سلامت، لیکن ٹانگ کے درد کی شکایت کسی حد تک باقی تھی جس کے موصوف نے دو اپریشن کرائے اور یادور عباس نے کئے تھے۔ نشست گھنٹہ بھر سے زیادہ رہی، دنیا جہان کی باتیں، ہماری خاطر چائے بسکٹ سے کی گئی، خود بیڑی پیتے رہے۔ میں خاموش ان بزرگوں کی باتیں سنتا رہا اور لکھتا رہا دلّی، انقلاب اگلے وقتوں اور لوگوں کے قصے، تان جوش پر جا کر ٹوٹی، فرمایا،

جوش بذاتِ خود بہت اچھے آدمی ہیں اور بڑے شاعر ہیں مگر جس طرح شیر اور بھیڑیئے کے ساتھ کتے لگے رہتے ہیں اسی طرح ان کے حاشیہ نشینوں نے انہیں خراب کیا ہے۔

পোস্ট কার্ড
پوسٹ کارڈ
ঠিকানা
پتہ

PAKISTAN
5 PAISA POSTAGE

[illegible] ... عزیزی جناب

P.O. Mohammadabad — محمد آباد

Distt. Rahimyar Khan.

THE "SAQI" MONTHLY
KARACHI.-5

19/10/63

عزیزی - بعد سلام مسنون۔

۱۵ اکتوبر کا خط ملا۔ شکریہ۔

"گنجینۂ گوہر" میں نے نہیں چھاپی۔

توجہ کا شکریہ۔

خادم

چلتے چلتے فرمایا آپ سے تو باتیں ہی نہیں ہو سکیں۔ پھر کسی وقت آیئے اور ہاں یہ حیرت شملوی مرحوم سے اتنی عقیدت کیوں ہو گئی آپ کو کہ ان کے نام سے اکادمی کا غم پال لیا، اس وقت تو میں پی گیا، گھر آکر ایک خط میں حیرت کی شاعرانہ عظمت اور معاصرین سے موازنہ کرتے ہوئے اور بھی بہت کچھ لکھ مارا، خلاف معمول جواب تاخیر سے آیا۔ اس لیئے کہ تاخیر ہوئی تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔

میری لڑکی نے سات مہینے کی اذیت ناک علالت کے بعد ۱۲۔ اکتوبر کو میرے گھر پر انتقال کیا، تین بچیاں چھوڑ گئی ہے اسی پریشانی میں آپ کے خط کا جواب جلدی نہیں دے سکا، آپ نے ناحق اتنا طویل خط لکھا، میں نے تو محض بر سبیل تذکرہ آپ سے پوچھا تھا کہ حیرت مرحوم سے آپ کو اس درجہ عقیدت کیوں ہو گئی، میں خود حیرت کے قدر دانوں میں سے ہوں، انہیں میں نے ۲۵ سال پہلے جامعہ ملیہ دلّی کے ایک مشاعرے میں پہلے پہل سنا تھا، ساقی میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے، آپ حیرت شملوی اکادمی ضرور قائم کیجیئے۔ اپنے والد صاحب سے میرا سلام عرض کر دیجیئے انہوں نے غریب خانے پر تشریف لاکر میری عزت افزائی فرمائی۔
جینے کے لیئے مرنا تو پڑتا ہے لہٰذا شاہد صاحب کو بھی مرنا پڑا، ساقی زندہ ہے مگر کب تک۔

ع بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

۱۸ / دسمبر ۱۹۶۸ء

یکے از کافرے کافر مسلماں

ہوش کے ناخن بھی نہ لئے ہوں گے کہ نیاز کی پکار کانوں میں پڑی، برصغیر پاک و ہند میں بہت کم کیا معنی شاذ ہی کسی کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو کہ پوری ایک نسل اور نئی پود کی ذہنی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دی، دماغ سے پھوٹنے والے سوتے یوں اپنا رخ بدلتے ہوئے کبھی نہیں دیکھے گئے، نیاز نے جس دھڑلے اور ٹھسے سے اپنے مذہبی سیاسی علمی ادبی افکار کو الم نشرح کیا اس کی پیمبرانہ شان سے کسے انکار ہو سکتا ہے ان کی لپیٹ میں نو عمر ہی نہیں، ہم عمر اور ہم عصر یکساں آئے کس کی مجال تھی کہ دامن سمیٹ کر آنکھ بچا کر نکل جاتا۔ نیاز نے خلائق کے ذہنی خلفشار روحانی کرب اور اوہام پرستی کے عفریت سے جس تنگ و تاز جرأت اور پر شکوہ انداز میں نجات دلائی ہے یہ کچھ انہی کا حصہ تھا، خدا کا فرسودہ تصور جو ہماری ذرا ذرا سی بات پر خوش ہوتا اور تیوریاں چڑھا لیتا ہے، نیاز کے قلم کی نشتریت کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہو کر رہ گیا، اور خدائے عظیم کا وہ حقیقی اور سچا روپ سامنے آیا جس کا وہ مستحق ہے جو بے نیاز مطلق ہے وہ ایک قوت ہے جو نظام عالم کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جو اصول اس نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔ نیاز کا تصور اسلام بھی عام روش سے ہٹ کر اور بے جا نہیں، بجا ہے، یہ ذہنی انقلاب مرہون منت تھا ایک تو ان کی قبل از وقت پختہ ہو جانے والی فطرت اور دوسرے ان کے استادوں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب محرک ندوۃ العلماء اور بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور اور مولانا نور محمد صاحب مدرس اعلیٰ شاخ عربی مدرسہ اسلامیہ فتحپور کے طبائع کے تضاد کا، مناسب معلوم ہوتا ہے ہر دو حضرات کے بارے میں جناب نیاز ہی کی زبانی کچھ سن لیا جائے۔

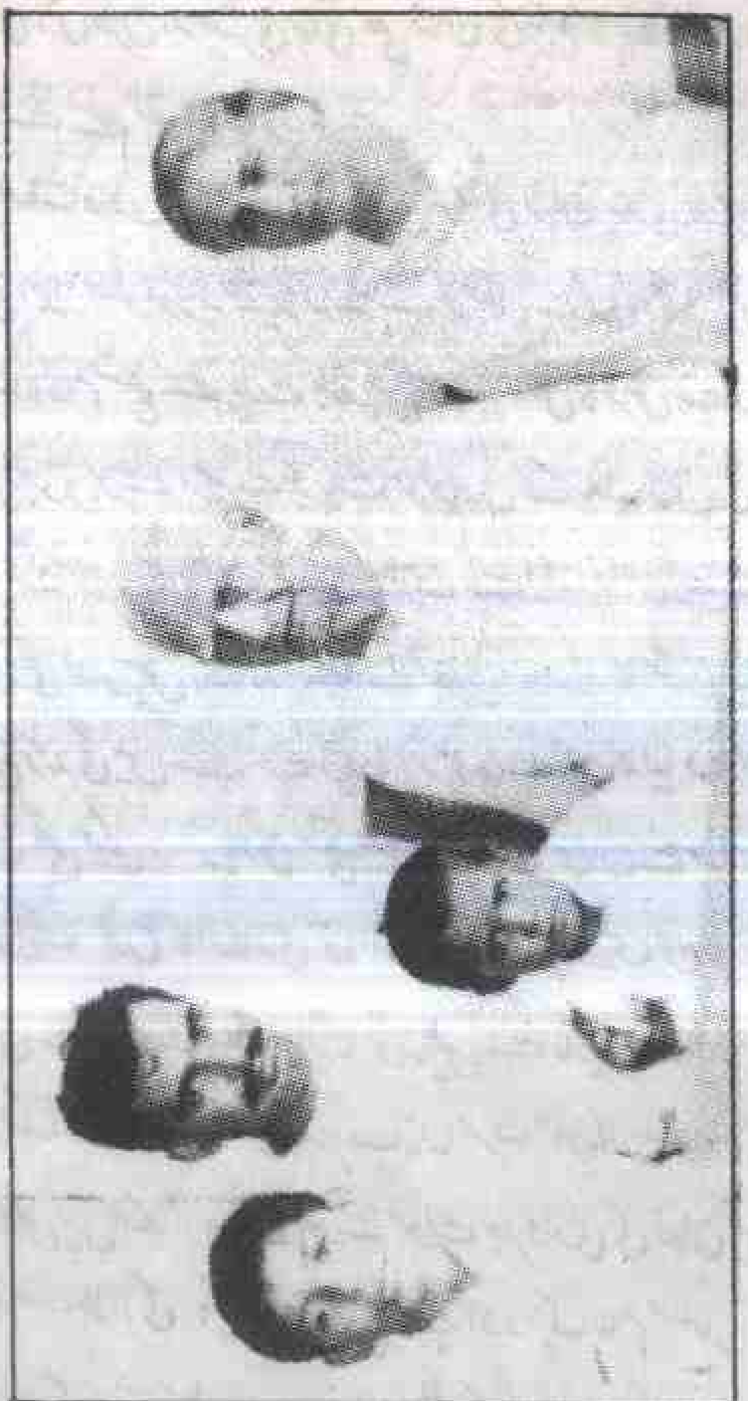
"یہ (نور محمد) پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے

تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے متقی انسان تھے لیکن سراپا ہیبت و جبروت یکسر تقشف و عبوس، برخلاف اس کے مولانا ظہور الاسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے، وہ فارسی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کے اس ادبی رجحان نے ان میں زاہدانہ احتساب و دارو گیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو درگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

اس کے علاوہ مولوی نور محمد انگریزی تعلیم کے بھی سخت مخالف تھے، انکی غیر موجودگی میں جب ٹاٹ اور بوسیدہ دری کی جگہ کرسی اور بنچوں نے لے لی تو یہ دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئے اور ہر چیز اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دی، اس شاندار اسلامی مظاہرے کو بھی مولانا ظہور متانت اور خوش اسلوبی سے جھیل گئے، انگریزی کا شعبہ تعلیم علیحدہ کر کے خود اس کے نگراں ہو گئے۔ عربی شاخ کے مختار کل نور محمد صاحب کی سختی کا یہ عالم کہ لڑکوں کو سخت جسمانی تکلیف پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، درس و تدریس کا انداز بھی انتہائی سپاٹ اور کھردرا تھا، بقول نیاز ہمیشہ شروح و حواشی سے مدد لیتے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے، بدآواز ایسے کہ ان کے اقتدا میں نماز پڑھنے کا لطف اکارت ہو جاتا، البتہ مولانا ظہور کے لہجے کی نرمی، رقت اور لحن کا دل پر اثر ہوتا، درس کے دوران میں لڑکے لب کشائی سے ڈرتے اور جو کچھ وہ بتاتے چپ چاپ سن لیتے۔ اس پر بھی نیاز سوال کرتے تھے پوچھتے جواب کبھی تسلی بخش نہ پاتے، مولانا نور محمد حج کو تشریف لے گئے تو ان کی جگہ پر تقرر مولانا محمد حسین کا ہوا، یہ " حد درجہ مغلوب الغضب اور خشک اور عبوس، آتے ہی حدیث پر زیادہ زور دیا اور مشکوٰۃ کی بعض احادیث مثلاً ایک اژدھے کے سانس کھینچنے اور چھوڑنے پر گرمی سردی کا انحصار سن کر نیاز باوجود ضبط کے " غلط پکار اٹھے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ معتوب ہی کی زبان سے اچھا لگے گا۔

یہ سنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا جیسے ان پر کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور بولے کہ بدتمیز تو رسول اللہ کو غلط کہتا ہے، میں نے عرض کیا کہ میں رسول اللہ کو غلط نہیں کہتا بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں کیونکہ

نیاز فتحپوری



سید محمد شاہ جیلانی، سید انیس شاہ جیلانی، سید ابوالعلام شاہ جیلانی، نیاز فتحپوری، بیگم نیاز فتحپوری

۱۸۴۸ء ——— ۱۹۶۶

رسول اللہ کبھی ایسی لغو خلاف عقل بات نہیں کہہ سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور میں اٹھ کر بھاگا۔

اور یہ بعض دیگر مسائل پر ردوکد کے نتیجے میں پہلے بھی ہو چکا تھا۔

مدرسہ اسلامیہ فتحپور کا حافظ خانہ جسے نیاز مرحوم نے مذبح سے تعبیر کیا ہے جہاں بچوں کی کھال اس طرح ادھیڑی جاتی تھی کہ ان کی چیخ و پکار اور آہ و بکا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے بقول نیاز

"استادوں کی سخت گیری طبعی کرختگی زبان بندی مذہبی تقشف رعونت فرعونی انداز گفتگو اور یہ عقیدہ کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں، ان کا یہ پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہیں اور ہر شخص کا فرض ہے کہ انہیں دیکھتے ہی سربسجود ہو جائے، میرے تجربات مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتے گئے، میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کردی تھی اور یہیں سے مذاہب کے تقابلی مطالعے کا شوق پیدا ہوا مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا مگر یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تھا اور اس لحاظ سے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اگر ان سے مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کر سکتا تھا اور نہ مسائل مذہب میں صرف عقل کا سلیقہ مجھ میں پیدا ہوتا

اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے شوکت سبزواری کی زبان میں کہنا پڑتا ہے کہ "نیاز کے اسلام کی بنیاد فکر پر ہے اور ایک عام مسلمان کے اسلام کی بنیاد جذبے پر" جذبات کی پرشور سطحیت اور خیال و فکر کی گہرائی اور گیرائی بہرحال مسلّم ہے میں یہاں یہ کہے بغیر کیونکر گزر سکتا ہوں کہ نیاز کو صحیح راستے پر ڈالنے میں بڑا ہاتھ ان کے والد کی آزادہ روی، علمی بصیرت اور شعری ذوق کا بھی رہا ہے۔

تکمیل تعلیم درسی کے بعد پولیس اور دیگر مختلف وادیوں میں بھٹک بھٹکا کر بے یقین

اور مضطرب روح کو پہلوئے نگار میں آخر قرار آہی گیا، یہاں ان کے جوہر کھلے، اپنے نظریات اور معتقدات کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری کردیا، نیاز کے آرا کی زد چونکہ ملاؤں کے فرسودہ خیالات معتقدات اور خود ساختہ روایات خصوصاً حلوے مانڈے پر پڑتی تھی اس لئے چہار سو محاذ قائم کردیئے گئے اور بعض حضرات تو اخلاقی حدود سے بھی تجاوز کر گئے۔ دلیل کا جواب بن نہ پڑا تو اینٹ پتھر ہاتھوں میں لے لئے، قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں، ہر شریف اور غیور انسان کی طرح نیاز بھی اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے تھے، وہ اس میدان کے بھی مرد ثابت ہوتے مگر کسی کی "ہمت مردانہ" ان کے گریبان تک تو کجا دامن کو بھی نہ چھو سکی ورنہ وہ خنجر اپنے جوہر ضرور دکھاتا جو اس ہنگامی حالت میں مطالعے کی میز کی دراز میں عریاں رکھا رہتا تھا، کفر کے فتوے گھڑے گئے، مقدمات دائر ہوئے اور جب یہ علم ہوا کہ نیاز تو ہماری من گھڑت روایات کے بخیئے ادھیڑے گا اور برسر عدالت مناظرے کے لئے ہمہ تن تیار ہے برصغیر کے کم و بیش سبھی علماء کو کھینچ بلائے گا اور عبا و قبا کو تار تار کر ڈالے گا تو کھٹ سے واپس بھی لے لیے گئے۔ اور اب تو بعض حقائق کا اظہار خود انہی کے قلم سے ہو رہا ہے جنکی فرشتہ سیرتی کی دھوم مچی ہوئی تھی مثلاً ماہنامہ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بڑے رکھ رکھاؤ اور چاؤ سے اپنی موجودہ ازدواجی زندگی کی تصویر کشی تو کر ڈالی مگر اس مظلومہ کا ذکر پی گئے جسے نکاح کی آڑ میں تین مہینوں تک تختہ مشق بنائے رکھنے کے بعد شریعت اسلامی میں والدین کے احکامات کی افضلیت کا جواز پیدا کرکے چلتا کیا، جبہ و دستار کے پیچ و خم دستاویزی ثبوت تردیدی سے دھڑا دھڑ نکالے جانے لگے تو "ایمانوں" کی سلامتی کیلئے جا بجا نگار کا داخلہ ممنوع قرار دے کر روڑے اٹکائے گئے، یہ نیاز ہی کا دل گردہ تھا تن تنہا چومکھی لڑتا رہا دکن میں نگار کے داخلے پر پابندی کا ذکر والد صاحب کے نام ایک خط میں بھی آیا، تیور ملاحظہ فرمائیے۔

"بیشک نگار کا داخلہ حیدر آباد میں ایک سال کیلئے ممنوع قرار پایا ہے لیکن گھبرایئے نہیں، نگار برابر اسی طرح جاری رہے گا، میں دکن جا کر کوئی کوشش نہ کروں گا کیونکہ مجھے ان سب کو بتا دینا ہے کہ نگار کی زندگی

کا مسئلہ حیدر آباد وغیرہ کے خریداروں سے بہت بلند ہے نقصان ہوا ہے اور ہوگا لیکن میں اس نقصان سے ہمت نہیں ہار سکتا۔"

ایسے آڑے وقتوں میں مالک رام نے کہ جن کا ذوقِ قرآنی گویا عطیۂ نیاز و نگار رہے کچھ سلوک کر دیا تھا جس کا قصہ نیاز مرحوم اپنے حالات میں لے بیٹھے تھے یعنی ایک "کافر" کا دوسرے "کافر" کا ممنت کش احساں ہونا، ہمت استقلال صبر و ضبط سے ناگہانی آفات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے مگر جب معاملہ عالمانہ بحث و نظر، تدبر و تفکر اور تعقل سے نکل کر جہالت وحشت اور بربریت کی حدوں میں جا پہنچا اور عرصہ حیات تنگ کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تو رفع شر کے لئے ایک "توبہ نامہ" شائع کر دیا گیا، جس پر خوب بغلیں بجائی گئیں یوں اس آگ کو وقتی طور پر ٹھنڈا کیا گیا۔ نیاز فرماتے ہیں۔

"میں نے صلح حدیبیہ کے تتبع میں ایسا کیا ہے اس وقت کا تقاضا یہی تھا کہ عارضی طور پر جارحانہ اقدام چھوڑ کر خموشی سے اپنی طاقت کو پھر سے مجتمع کیا جائے۔"

بچپن لڑکپن چھپٹن بھی کہہ لیجئے، نگار کے فائل الٹتے پلٹتے گزرا اور اب بھی جس غائر مطالعہ کی ضرورت ہے اس کی توفیق کہاں ہو پاتی ہے، بغرض زندگی کے ہر دور میں نیاز کو رگِ جاں سے زیادہ قریب پایا گویا یہ سلسلہ روحانی تھا گوشت پوست کے نیاز کو دیکھنے کی سعادت پندرہ ہی برس کی عمر میں حاصل ہوگئی۔

والد محترم سید مبارک شاہ جیلانی دنیائے ادب میں میرے امام کی حیثیت رکھتے ہیں ابا کا وجود سرزمین بہاولپور کی خزاں رسیدگی میں گل نو بہار سے کم نہیں۔ ان کے ۱۹۲۶ء سے قائم کئے ہوئے کتب خانے "مبارک اردو لائبریری" کی سیر دیکھنے اس دور میں کہ ترقی یافتہ ایٹمی دور کہلاتا ہے، سال بھر میں ایک ہی آدھ دیوانہ آنکلتا ہے تو ۱۹۳۳ء میں اس کے سہ ماہی نقیب "لالۂ صحرا"، کو کون پوچھتا جس میں اس وقت کی تقریباً سبھی مشہور شخصیتوں نے قلمی شرکت فرمائی تھی، ایسی غیر شاعرانہ فضا کو ذہن میں لائیے اور ۱۹۲۵ء کا تصور کیجئے اور ہمارے ابا کے سفر لکھنؤ کو دیکھئے، لا محالہ قبلہ کے عشقِ نیازی کے انتہائی مدارج

پر ایمان لانا پڑتا ہے، یہ کیونکر ممکن تھا کہ ۱۹۵۲ء میں وہ کراچی تشریف لائیں اور ابا دیدار یار سے محروم رہ جائیں، مجھے بھی ساتھ لے لیا گیا، میں اور ابا جب سوئے منزل جاناں چلے ہیں تو سلیمانی ہراول دستے کے سالار ادیب شہیر سید رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم و مغفور ہمارے ساتھ تھے اور متامل کہ اگر آپ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں نیاز سے کبھی نہ ملتا، عقائد کے اختلاف پر یہ اخلاقی ردعمل میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ ممکن ہے وہ رواروی میں ایسا کہہ گزرے ہوں۔ ورنہ وہ نیاز کی عظمت کے دل سے قائل تھے، نیاز صاحب کا ایک مکتوب اپنے روزنامچے میں نقل کرنا ہی نہیں نیاز نمبر میں ایک بہت اچھا انسان اور بہت اچھا مسلمان بھی لکھ چکے ہیں، نیاز، جعفری مجادلہ نگار میں اپنی بہار دکھا چکا تھا اور جعفری صاحب کے مضامین میں جو ادیبانہ شان پائی جاتی تھی اس کی تعریف اور مداحی کا اعلان ہو چکا تھا اس لئے جب عبدالواحد سندھی کتب خانہ تاج آفس بندر روڈ کراچی جو اب مرحوم ہو چکا ہے میں یہ کہہ کر لے گئے، آیئے آپ کو جعفری صاحب سے ملاؤں تو ابا کا پہلا سوال یہی تھا کیا آپ وہی "نگاری جعفری" ہیں، جواب نفی نہیں اثبات میں ملا اور پھر بات جعفری صاحب کے نانا ریاض خیر آبادی تک پہنچی، جن سے ابا سفر لکھنو میں مل چکے تھے اور آج تک رطب اللسان ہیں کہ ریاض سے بڑھ کر انسان دوست اور شریف النفس آدمی مشکل سے ملے گا ابا کے نام ریاض کے خطوں سے بھی یہ بات ظاہر ہو کر رہتی ہے، میں یہاں ایک "ریاضی" لطیفہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کی جسارت یوں اور ہو رہی ہے کہ والد صاحب ممکن ہے اپنی وضعداری کو اس طرح نبھا جائیں کہ سرے سے اسے قلم بند ہی نہ کریں جیسا کہ ایک بار فرما بھی چکے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس سے ریاض کی ہیٹی ہو گی اور عیب جوئی سے پردہ پوشی زیادہ افضل ہے، مگر میں ہوں کہ عیب بینی اور کوتاہ اندیشیوں کو صنف حقیقت نگاری اور صاف گوئی سے علیحدہ کوئی اور چیز نہیں سمجھتا، اس سے شخصیت کی تعمیر کے تدریجی ارتقا کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے اور آدمی کو انسان ہونا میسر ہو جاتا ہے اور ریاض کی تر دامنی تو آپ دیکھ لیجئے کہ

ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہاں تو ریاضؔ، ابّا جانی قبلہ کو لکھنؤ کی سیر دکھاتے ہوئے ایک بالا خانے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہاں ایک ماہ لقا رہا کرتی تھی بے اختیارانہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا، حیا و ادا کے لطف اٹھانے کی دیرینہ تمنا کو شرمندۂ وصال کرنا چاہا مگر اس رخِ رنگیں کی تابانی سے سدھ بدھ کھو بیٹھے، جیسے گئے تھے ویسے ہی پلٹ آئے، ہنستے جاتے اور یہ واقعہ سناتے جاتے تھے، زبان پر اس جملے کی تکرار، خدا رعب حسن سے بچائے،

حادثہ گزر یا شبلیؔ، لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا کا مظہر نہیں پا کھنڈ تھا، حقیقت یہ ہے کہ گولی کسی اور نے چلائی حسن اتفاق سے نشانہ خطا گیا اور جان بچ گئی، اس قسم کے اسباب پیدا کر لینا شبلیؔ کی رنگینیِ طبع سے کچھ بعید بھی نہیں تھا پھر کیوں ہم ریاضؔ کی روایت کو ضعیف گردانیں

"پکچر ہاؤس" کراچی کے پرانے سینما گھروں میں سے ایک تھا، اپنی وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے الگ تھلگ، افسوس اسے منہدم کر کے پٹرول پمپ بنا دیا گیا ہے۔ بندر روڈ پر میونسپلٹی کے قریب۔ اسی پکچر ہاؤس کے پچھواڑے بلند و بالا عمارت کی تیسری منزل کا دروازہ اسی کمرے میں کھلا جس میں حضرت نیاز لیٹے ہوئے "ریڈرز ڈائجسٹ" پڑھ رہے تھے، پلنگ اور فرش پر بھی ڈائجسٹ بکھرے پڑے تھے، ممکن ہے ذائقہ بدلنے یا نگار کا پیٹ بھرنے کیلئے کچھ مواد چھانٹ رہے ہوں، ایسے بغیر حوالے کے چھاپ دینا ان کے یہاں روا تھا، بلکہ لوگ تو یہ کہتے ہیں پوری پوری کتابیں ترجمہ کر کے اپنے نام سے شائع کر دیا کرتے تھے یہ ملاقات پچیس سالہ طویل وقفے کے بعد ہو رہی تھی اس لئے خاصی جذباتی رہی، گھنٹے بھر کی نشست میں پرانی یادیں تازہ کی جاتی رہیں اور کسی امریکن صحافی کے اس شگفتہ تبصرے پر تبصرہ ہوتا رہا کہ "یہاں اگر خدا کے وجود کا اقرار کر لینا پڑتا ہے اس لئے کہ نہ تو یہاں کوئی قانون ہے نہ کوئی کام کرنے والا" ذکر خیر مولانا مودودی کا بھی آیا، فرمایا میرے شاگرد ہیں، بلاوے تو آنے میں پس و پیش نہ کریں گے، یہ اور بات کہ نگار کے نیاز نمبر کیلئے فرمائش مضمون کا ٹکا سا جواب فرمان فتحپوری کے نام دے کر رہ گئے، نیاز تڑپ اٹھے اور اس کا ماتم باوجودیکہ نیاز نمبر کی ترتیب و تدوین سے اظہار بے تعلقی کر چکے تھے نیاز نمبر کے بعد کے تمارے

میں بڑے دردانگیز طریقے پر کیا، جی چاہتا ہے اس کی تلخی میں حلاوت کا جو مزہ ہے تھوڑا سا راہم بھی چکھ لیں یا چکھتے ہیں۔

اب المیہ کی روداد سنئے، فرمان صاحب نے باوجود میری مخالفت کے ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی خط لکھا اور جس کا جواب ان الفاظ میں موصول ہوا۔

آپ کا عنایت نامہ ملا میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ اپنے بہت ضروری کام بھی انجام دینے سے قاصر ہو رہا ہوں اس لئے تعمیل ارشاد سے معذور ہوں۔

عبدالماجد صاحب نے تو خیر اپنے خط میں ایک جگہ میرا نام بھی لے لیا ہے لیکن ابوالاعلیٰ نے تو یہ بھی گوارہ نہ کیا، غالبًا اس لئے کہ وہ بھی مجھے کافر و ملحد سمجھتے ہیں، حالانکہ اب سے تقریبًا نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ابوالاعلیٰ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر دونوں کا طویل زمانۂ تعلیم (جب دام ہمرنگ زمیں بود) اسی کافر و ملحد کی صحبت میں بسر ہوا ہے اور سب سے پہلے نگار ہی نے انہیں روشناس خلق کیا، ہو سکتا ہے کہ بھوپال کی وہ رنگین شامیں جب تاج محل کے تالاب میں وہ اور میں دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر پانی سے کھیلتے ہوئے گذر جایا کرتے تھے انہیں فراموش ہو گئی ہوں اور روز و شب کے علمی و ادبی مذاکرات جن سے ان کے ذہن کی تعمیر ہو رہی تھی ان کے دل سے محو ہو گئے ہوں لیکن میں اس لطیف زمانہ کی یاد کبھی نہیں بھلا سکتا اور اس وقت بے اختیار مجھے مومن کی ایک مشہور غزل یاد آ رہی ہے (ابوالاعلیٰ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو) مجھکو ابوالاعلیٰ (مولانا مودودی نہیں) اب بھی اسی طرح عزیز ہیں اور غالبًا ہمیشہ رہیں گے۔

دوست بودی شکوہ، سر گردم و لے جرم تو نیست
کائیں ہمہ بیداد بر من از دل تنگ من است

یہ تو ہوئی ۶۲ء کی بات ۳۲ء میں "ترجمان القرآن" کی ادارت جب مولانا مودودی نے سنبھالی تب بھی تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اسی قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا تھا جس میں دلی لگاؤ بھی موجود ہے۔

"مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا اور اس لئے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے تھے۔

دیکھا آپ نے وہ جو انتہائی بد دماغ، سخت گیر اور اکل کھرا مشہور تھا جس کی سخت جانی، ہنگامہ آرائیوں، یلغاروں، معرکوں کے پرچے تھے کیسا کچھ رقیق القلب نکلا، احباب خصوصاً جن سے ایام شباب میں یاد اللہ رہی ہو، کی بے توجہی بلا کر رکھ دیتی ہے "المیہ کی روداد" پر غور فرمائیے، پھر نام نہ لینے کا چرکا، کشتیوں میں مل بیٹھنے کی یاد، رات رات بھر کے راز و نیاز، دل پر اک چوٹ سی لگی ہوگی، حرف حرف میں اک جہان معانی پنہاں ہو کر رہ گیا۔ مولانا کے تجاہل عارفانہ اور تغافل بے رحمانہ نے جس کرب و اذیت سے نیاز کو دوچار کیا اس پر بے ساختہ رئیس امروہوی کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

جان لیوا سہی جراحت عشق
عقل کا زخم ہے بہت کاری

رونا مولانا عبدالماجد دریا بادی کا بھی رویا گیا، مگر وہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کے سوا اور کچھ نہیں "من یزداں" مرتب کرتے وقت نیاز صاحب کو شوق چرایا کہ اس پر کسی سے مقدمہ لکھوایا جائے تو کیسا رہے وہ غالباً یہ بھول گئے کہ ان پر مقدمہ دائر تو کیا جا سکتا تھا، لکھنے کی ایک ہی رہی، شوخی ملاحظہ ہو اس کار خیر کیلئے مولانا دریا آبادی کو منتخب کیا گیا، صاحب "صدق" یہ سمجھے اپنا قصیدہ لکھوانا چاہتا ہے، جواباً ایک مصرع لکھا تھا۔

ع عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب

سالہا سال بعد یہ مصرع اس وقت پھر دہرایا گیا جب فرمان صاحب نے نیاز نمبر میں شرکت کی دعوت دی، نیاز نے ماضی میں وضاحت کر دی تھی کہ میں کتاب یا اپنی تعریف نہیں لکھوانا چاہتا، مقصود اصلی یہ ہے کہ آپ جتنی گالیاں مجھے دینے والے ہوں سب لکھ کر بھیج دیں تاکہ دوبارہ غم و غصہ کھانے سے بچ جائیں، لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے نہ خط کا جواب دیا نہ کوئی قصیدۂ سب و شتم لکھ کر بھیجا کہ میں اسے نوشتہ آخرت سمجھ کر "من دیزداں" میں شامل کر دیتا۔

آپ اگر بھول نہ گئے ہوں تو بات چلی تھی پہلی ملاقات سے جس کا حاصل یہ جملہ تھا "میرا مقام بہت اونچا ہے مولویوں کی دسترس سے باہر رہتا ہوں۔

یہ وہ دور تھا جب میں جناب رئیس احمد جعفری کے سایہ عاطفت میں گویا پروان چڑھ رہا تھا والد صاحب کی استدعا پر مرحوم نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا تھا، علم و ادب کی دنیا میں سانس لینے لگا، ماہنامہ "ریاض" کا اجرا میرے سامنے کی بات ہے، اس میں کبھی کبھار نیاز کے خطوط بھی چھپ جایا کرتے تھے، گھر آنا ہوتا تو یہاں "ایک شاعر کا انجام" ، "شہاب کی سرگزشت" وغیرہ سے سابقہ پڑتا یا ابا کے نام ذاتی مکاتیب نظر نواز ہوتے، مختصر یک سطری، بہت کم مختصر کی تہمت سے آزاد، بات من ویزداں تک بھی پہنچی اور ہم کوشاں نگارش نیاز کے رسیا لگے یہاں تک کہ میں اپنی خودسری کے ہاتھوں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر آ براجا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی بیکاری کھل گئی، تلافی مافات کیلئے رہنمائی نیاز سے چاہی، جواب دوسری ڈاک سے آیا جس میں مولوی عبدالحق کے اردو کالج میں داخلہ کا مشورہ دیا گیا اور یہ اجازت بھی کہ براہ راست مولوی صاحب کو میرے حوالے سے لکھ دو، میں نے حوالہ دیئے بغیر لکھ مارا، حاشیہ نشینی تو نہیں مراسلت کی سعادت ضرور حاصل ہو گئی۔

نیاز سے پہلے نگار "مشرف بہ اسلام" ہوا یعنی پاکستان منتقل ہوا، یہ دور بھی عجیب رہا، تاہم داد دینا پڑتی ہے کہ سلسلہ اشاعت میں کوئی جھول نہیں پڑا وہ تو ۱۹۵۱ء ہی میں ڈھاکہ کو منتخب کر چکے تھے، شوکت سبزواری کو واسطہ بنا کر اس وقت کے ڈائریکٹر تعلیمات فضل احمد کریم فضلی کو پیغام بھجوایا کہ سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو میں رخت سفر باندھوں

مگر اس کو کیا کیجئے کہ شوکت صاحب کو عندلیب شادانی کی خاطر کچھ ایسی عزیز تھی کہ انہوں نے یہ پیغام فضلی تک پہنچایا ہی نہیں، کیا ہوا اگر اس کا بھگتان دس برس تک نیاز کو بھگتنا پڑا۔ رشک و حسد اور بغض معاویہ کی متعدد روایات شادانی صاحب سے منسوب ہیں، اللہ نیک توفیق دے، حالات کا جائزہ لینے کیلئے کراچی سے واپسی پر اگست ۱۹۷۱ء میں روہڑی سے گزرے، میں ایک قلبی واردات کے ہاتھوں دل و جگر کے ساتھ ساتھ دونوں پھیپھڑے بھی مفلوج لئے پڑا تھا، دل مسوس کر رہ جانا پڑا۔ ویزا ہوتا تو ممکن تھا مسافر اس ویرانے کی بہار بنتا، ابا محترم مشہور سندھی شاعر اور ادیب شیخ محمد فاضل ایم اے کی معیت میں روہڑی گئے اور اپنی محبت کا نقش چھوڑ آئے۔ جناب شیخ کے استفسار پر نیاز نے فرمایا، پاکستان میں صرف یہ بچہ رئیس امروہوی کچھ اچھا کہہ رہا ہے، بلاشبہ پاکستان کی منظوم تاریخ روزنامہ جنگ کراچی میں چھپنے والے قطعات سے مرتب ہوتی چلی جا رہی ہے۔

میں نے چھ مہینے شکن بستر بنے اور پلنگ کی پٹی سے لگے رہنے کے بعد قدم جب نیچے رکھا تو ذہنی کا تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جسمانی صحت پہلے سے بدرجہا بہتر تھی اور الحمد للہ اب تک ہے اس دوران میں نیاز صاحب "مسلمان" ہو چکے تھے، مستقل رہائش کراچی کے مشہور محلہ کیا بستی ناظم آباد میں اختیار کر لی تھی، نگار اسی آب و تاب سے شائع ہونے لگا یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ لکھنو چھوڑنے بھی نہ پائے تھے کہ رامپور سے نگار نامی ایک ماہنامے کا ڈول ڈال دیا گیا یہ "نقل مطابق اصل" تھا، قد و قامت، لکھائی چھپائی، رنگ و روپ، حتیٰ کہ نمبر شمار سالِ اشاعت مستقل عنوانات وغیرہ میں سرِ مو کوئی فرق نہ تھا، یک نظر ہر صاحبِ ذوق دھوکا کھا جائے، اس لئے یہاں نگار "نگار پاکستان" کہلایا۔ ابا محترم کے نام ایک مکتوب میں نیاز کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ فرمایئے "نگار رام پور میری نظر سے گذر چکا ہے حرشی کے بیٹے ہیں میں کیا کہہ سکتا ہوں اگر اس سے انہیں کچھ فائدہ پہنچ جائے تو مجھے خوشی ہوگی" جی ہاں نگار کے دور ثانی یا پاکستانی میں۔ باب المراسلہ والمناظرہ۔ کی رنگا رنگی بدستور قائم رہی، یہ غلط ہے کہ وہ خود سوال قائم کرتے اور بحث و نظر کا دروازہ کھول دیتے میرے چند خطوں کا جواب نگار میں آیا۔ دیگر احباب اور بزرگوں نے بھی اس بات کی تصدیق

کی، باب الاستفسار کی افادیت بڑھی، کم نہیں ہوئی، مطبوعات موصولہ کے عنوان سے بعض معرکے کی تنقیدیں نظر نواز ہوئیں، مولانا ابوالخیر مودودی کا یہ کہنا کچھ جی کو نہ لگا کہ بحیثیت نقاد حد سے گذر جاتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو محمود احمد عباسی کی "خلافت معاویہ و یزید" پر ایسا جاندار بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کبھی قلم کی زبان نہ بنتا، البتہ ہمارے مولانا ماہر القادری نیاز نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے حد سے گزرے ہوں یا نہ گزرے ہوں آپے سے باہر ضرور ہو گئے تھے

یہ نگار و نیاز ہی کا مقام تھا کہ اقبال اور بطور خاص ابوالکلام کی حیات معاشقہ کے متجسس رہے اقبال تو شعری احتساب سے بھی نہ بچ سکے، اس کے علاوہ ہر صنف ادب پر نگار میں آپ کو بہترین مواد مل سکتا ہے، فارسی غزلیات کی اشاعت کا اہتمام محض لوگوں میں ذوق پیدا کرنے کی تحریک تھی، سالنامے بھی حسب معمول چھپتے رہے اور مشرقی روایات کے خلاف ایک سالنامہ نیاز نمبر کی سرخی لئے ہوئے آیا، نگار کی چالیس سالہ خدمت کا صلہ کہہ لیجئے، اس نمبر کی اشاعت کے دو ہی چار ہفتوں بعد ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے ایک ملاقات میں میں نے اظہار ناپسندیدگی کر دیا، وہ چونکے اور خالی خالی نظروں سے میرے چہرے پر آثار حماقت تلاش کرتے رہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ سوا چھ سو صفحات میں نیاز کے فلسفہ ادب اور تھوڑی بہت بحثیں مذہبی مسلک پر بھی ہیں اور کہیں وہ افسانہ نگار، شاعر نقاد کی حیثیت سے پرکھے گئے ہیں تو کہیں فلسفہ، صحافت اور مذہب کی کسوٹی پر چڑھائے گئے ہیں، ذاتی حالات کا اجمالی ذکر آیا بھی تو صرف نیاز کے اپنے مضمون میں، چاہیئے یہ تھا کہ خود نوشت سوانح کے ذیل میں نیاز سے زبردستی دو تین سو صفحے کا مسالہ فراہم کرایا جاتا فضا صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے" کی آئینہ دار ہوتی تو بہتوں کو تکلف اور لئے دیئے ہوئے انداز میں قلم نہ اٹھانا پڑتا، شخصیت کے تمام پردے اور نقاب ایک ایک کرکے اٹھ جاتے مگر یہاں تو صورتحال یہ تھی کہ نقوش کے طفیل صاحب نے ہمت کرکے دو چار سطریں لگی لپٹی رکھے بغیر لکھ ڈالیں، پورا مضمون قطع و برید کے جاں گسل مراحل سے گذر کر نگار میں آیا اب ہر ایک کے پاس ذاتی پریس اور پرچے کہاں ہیں کہ طفیل صاحب کی تقلید میں اصل مضمون بے کم و کاست اپنے پرچے میں چھاپ کر "رسوا" کر دے۔ شاہد احمد دہلوی سے

غالباً اس لئے نہیں لکھوایا گیا کہ وہ جوش پر ایک پیارا سا مضمون لکھنے کی پاداش میں نکو بن کر رہ گئے تھے اور اپنی تصنیف لطیف "گنجینۂ گوہر" میں نیاز کو لتاڑ چکے تھے۔ شاہد مرحوم کو نیاز سے پرخاش نہ تھی، نیاز کی ناقدانہ بصیرت کے زبان سے تو نہیں دل سے معترف نہ ہوتے تو ساقی کے جوش نمبر میں نیاز کے ایک "پھوڑ" دو مضمون کیونکر نقل ہوتے۔

اردو ادب کہوں یا دنیائے علم و ادب میں نگار ایک ایسا مثالی پرچہ ہے، جس کا دامن اپنے مدیر کے افکار رعالیہ سے مالا مال رہا ہے، اسے مضمون نگاروں کے ناز و ادا اور جور نا روا کا شکار نہیں ہونا پڑا، نیاز نہ مدیر اس پائے کے تھے کہ پورا رسالہ اپنے طبعزاد مضامین سے بھر دیتے تھے اور اس میں موضوع کی کوئی قید نہ تھی کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مرحوم نے نہ لکھا ہو، مالک ناشر دفتری چپراسی معتمد غرض بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کام اپنے ہاتھوں سے کرکے وہ اپنی ذات سے اک انجمن ثابت ہوئے۔

لکھنو چھوڑنے کا سرسری ذکر بھی نیاز نے بڑے دکھ اور بے لبی سے کیا ہے، کھل کر نہیں لکھ سکے، دوسروں نے بھی اسے سینے کا راز بنا لیا اور صرف یہ لکھ کر رہ گئے کہ "لکھنو سے ہجرت کا مجھے علم ہے" غالباً شادانی کے راہیں مسدود کر دینے کے بعد وہ لکھنو پر مطمئن ہو چکے تھے اور پاؤں توڑ کر بیٹھ بھی گئے، خدا جانے وہ کیا اسباب تھے کہ باوجود تمام اعزاز و اکرام سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پاکستان آ کر دم لیا، ناک بھوں یہاں بھی چڑھائی گئی اور ہر مجلس و محفل کا موضوع بنے رہے، جناب رئیس امروہوی تو یہاں تک کہہ گذرے، یہ انہوں نے ہندوستان سے غداری کی ہے ہر قسم کے اعزاز ے کر بھاگ کھڑے ہوئے، بات کچھ آگے بڑھی تو فرمایا پہلے مجھے بھی ہنگاموں سے عشق تھا اب وحشت ہوتی ہے، دس برس تک روزانہ باقاعدگی سے شراب پیتا رہا اب وہ لذت نصیب نہیں ہوتی۔ یہ سرمستی اور بدمستی کی منزلیں طے ہو چکیں اب کچھ کر گزرنے کا وقت ہے لیکن میں نے دیکھا نیاز صاحب یہاں آ گئے لیکن وہ بھی ابھی تک انہی چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ عورت کے پجاری ہیں اور الحاد مرض کی سی صورت اختیار کر چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کو "رئیلائیز" نہیں کیا۔ مجھے یاروں نے اس قدر بدنام کر رکھا

ہے کہ نیاز صاحب تک پوچھ بیٹھے آج کل کس کس سے ملتے ہیں ۔۔۔ کی خاطر ہے۔ ڈاکٹر ضیاالدین احمد برنی شاکی تھے کہ وہ کلام الٰہی کو کلام الٰہی کہاں تسلیم کرتے ہیں مجھے نیاز کا دہریہ پن بھی پسند نہیں۔ البتہ نیاز کی وضعداری کے معترف اور شام کی ہوا خوری کے گواہ تھے، اپنے تعارف اور تعلق کی عمر ۱۹۰۸ء سے شمار کرتے تھے، حیرت شملوی خوش تھے کہ نیاز کا یہ نیاز مند بھی چودہ سالہ جدوجہد کے بعد پاکستانی ہے غلام نہیں آزاد، اطلاع پاتے ہی مزاج پرسی کے لئے بنفس نفیس ناظم آباد سے کلفٹن تشریف لائے نیاز صاحب اور اپنی بے پناہ شوخی اور چلبلاہٹ سے حیرت کو موہ لیا، جتنے منہ اتنی باتیں

ع ایسا بھی کوئی ہے سب اچھا کہیں جسے

۱۹۶۶ء کی ایک دوپہر کو جوش صاحب کی زبانی بھی جو کچھ سنا وہ یہ تھا کہ ہوش بلگرامی اور نیاز صاحب کو کھانے پر بلایا گیا۔ جوش صاحب کے ایک عزیز ابرار حسن خاں پی کر بہکنے اور گالیاں بکنے، بوچھاڑ نیاز و ہوش پر بھی پڑی۔ غلط فہمی یہ پیدا ہوئی کہ یہ سب کچھ میزبان کے ایما سے ہوا ہے، دلوں میں کدورت آگئی اور وہ ایک مدت تک رہی یہ واقعہ سن کر میں اس سوچ میں پڑ گیا، کیا صرف جوش اور ابرار حسن نے شغل فرمایا ہوگا بدگمانی یہ کہ حضرت نیاز اور ہوش نے بھی شیشے کی پری کو دل کے آئینے میں ضرور اتارا ہوگا اس کی تصدیق یا تردید کیونکر ہوتی جبکہ نیاز کی مے نوشی کا پرچا کبھی عام ہوا ہی نہیں یہ راز اس وقت افشا ہوا جب رئیس امروہوی نے حضرت کو کھانے پر مدعو کیا اور پوچھا کیا پئیں گے آپ، جواب ملا ’’جن‘‘

’’جن‘‘ نامی ماہنامے کا اجرا اس دور میں عجیب سی بات تھی، اس سے مرحوم کی انفرادیت جدت پسندی اور تنوع مزاج کا پتا چلتا ہے ’’جن‘‘ نے عمر صرف ایک برس کی پائی، مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ اس کا انتخاب کر لو بلکہ مجھے بھیج دو میں خود کر دوں گا تم چھپوا دینا، اب بھلا کون عقل کا اندھا والد صاحب کے عاریتاً پلٹ کئے گئے قلمی نسخے کے زیان کو دیکھتے ہوئے بھی نیاز اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگوں کے جال میں پھنس کر خون پسینہ ایک کر کے جمع کئے گئے نوادرات سے ہاتھ دھو بیٹھنے کیلئے تیار ہوگا۔

کراچی جاتے ہوئے جہاں مشاہیر عصر سے شرف نیاز حاصل کرنے کے منصوبے بنا لئے تھے وہاں نیاز صاحب کی دید کا اشتیاق بھی روز افزوں تھا، تاکید ابا نے بھی کر دی اور از قسم "سوغات" چند چیزیں ساتھ کر دیں مثلاً خالص گھی کہ کراچی میں چیل کا موت تو مل سکتا ہے گھی نہیں، جناب عارف نیازی کو دفتر نگار واقع گاندھی گارڈن سے ساتھ لے کر جب میں دل ہی دل میں سر کے بل ناظم آباد چلا ہوں تو خون کی گردش میں زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ تیزی ضرور آچکی تھی، سوچ رہا تھا اس آفت جاں سے سامنا کیوں کر ہوگا قوت گویائی سلب ہو کر نہ رہ جائے، میری اوقات ایک قطرے سے بڑھ کر نہ تھی جسے سمندر میں ٹپکایا جانے والا تھا / خار تشنہ فنا نے اور مضطرب کیا، مجھے حیرت ہوئی میری ہستی ناپائیدار ثابت نہ ہوئی۔ مرحوم نے چشمے کی اتھاہ گہرائیوں اور موٹے موٹے تالوں کی اوٹ اور پورنظر ڈال سے مجھے دیکھا، چہرہ بڑھاپے کی وجہ سے لٹک گیا تھا، کم گوئی نے اور سنجیدہ اور بارعب بنا دیا تھا، تھوڑی بہت ہیبت بھی ٹپکتی تھی، مگر جب بولتے تو یہ دبیز نقاب خود بخود الٹ جاتی آواز کراری، لہجے میں لگاوٹ تو نہیں لاگ ضرور تھی، مٹھاس بھی کہیے تو برا کیا ہے بڑی محبت اور تپاک سے ملے، میرا حوصلہ قائم رہا، کچھ بڑھا بھی اور میں نے جدید شاعری کا ذکر ان کی رائے معلوم کرنے کیلئے چھیڑا، فرمایا: آج کل جو کچھ جدید شاعری میں پیش کیا جارہا ہے وہ صرف الفاظ کا چکر ہے، بس وزن قائم رکھتے ہیں کوئی پیغام نہیں ہوتا، چینی اور جاپانی شاعری کہنا چاہیئے چھوٹے چھوٹے نثری ٹکڑے ہیں لیکن ان میں ایک پیغام ہوتا ہے، دل سے نکلی ہوئی باتیں ہوتی ہیں، تلقین عمل ہے اس میں ردیف قافیہ تو رہا الگ وزن کی بھی پابندی نہیں لیکن شاعری اعلیٰ پایہ کی ہے، جدید شاعری محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے اور سب سے بڑا شعبدہ باز جوش ہے، اس کی شاعری زندہ رہنے والی نہیں۔ الفاظ کے ڈھیر لگا دیئے ہیں، بات دل سے نکلی ہوئی نہیں دماغ ہی دماغ ہے اقبال اس کے دل سے بات نکلتی تھی اور اس کی زباں بن جاتی تھی، جوش کے یہاں یہ تو نہیں کہ ردح نہیں ہے، ہے لیکن خفیف، یہ رائے کم و بیش نیاز ہی کے الفاظ میں یہاں نقل ہوئی ہے، ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ رہائش دوسری منزل پر تھی، مطالعے کی میز پہلی

میں رکھی ہوئی تھی، جس پر برہم ناتھ دت کی تصویر سے زیادہ داڑھی بہار دکھا رہی تھی۔ گیلری کے بیرونی حصے پر "ادارہ ادب عالیہ" کا بورڈ بھی لٹکایا گیا تھا۔ اپنے بھتیجے محمد شاہ اور ولی عہد ابوالکلام کے علاوہ مانگے تانگے کا ایک کیمرہ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ تصویر میں بیگم صاحبہ نیاز نے بھی شرکت فرمائی۔ یہ باتیں ۲۷ جولائی ۱۹۷۲ء کی یادگار ہیں۔

اسی پھیرے میں ایک سہ پہر کو میں والدہ ماجدہ بھابی اور بہنوں کے ساتھ چائے پر مدعو تھا نیاز صاحب کے ہاں، ساقی کے جوش نمبر کو شاہد صاحب کی لغو اور مہمل کوشش قرار دیا، میں نے محمد آباد تشریف آوری کی طرح ڈالی۔ وعدہ تو کر لیا تھا، ایفائے عہد کی نوبت غالباً اس لئے نہ آسکی کہ پاکستان باسی ہوتے ہی دارالآثار (نیشنل میوزیم) میں مخطوطات کی ترتیب و تدوین پر مامور کر دیئے گئے، ترقی اردو بورڈ میں بھی عمل دخل کا موقع مل گیا تھا، فرمان صاحب کا کہنا یہ تھا کہ بورڈ کے ممبران محض تنخواہیں وصول کرتے ہیں، نیاز صاحب اب جانے لگے ہیں، کام آدمی ہیں سب ان سے گھبرائیں گے۔

پاکستان میں ایک اخبار کم از کم ایسا ہے جس میں کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی لکھنے والوں نے نظم و نثر میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ نیاز بھی ہاتھوں ہاتھ لئے گئے اور ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھا ہے کہ ایک طرف علم و فکر کے عنوان سے جوش صاحب نثر لکھ رہے تھے دوسری طرف رنگارنگ کے ذیل میں نیاز کی نظمیں آنے لگیں نثر پہ اترے تو مطبوعہ مضامین کی بھرمار کر دی۔ بہت کم نئی چیزیں قلم سے کاغذ آشنا ہوئیں، کیا ہی اچھا ہوتا وہ اپنی زندگی کے اوراق الٹنے بیٹھ جاتے جبکہ یادداشت ایسی زبردست کہ چار برس کی عمر تک کی باتیں محفوظ، پوری ایک تاریخ اور بیش بہا خزینہ دامن اردو میں سمٹ آتا، یہ مرض ہر عبقری میں پایا جاتا ہے، اپنے حالات زندگی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں بخیلانہ بخل سے کام لیتا ہے، یہ روش مشرق کا طرۂ امتیاز رہے خصوصاً پاک و ہند، مغرب اس سے مستثنیٰ ہے، ابونواس پر حضرت کا مقالہ سید محمد تقی نے ناقابل اشاعت ٹھہرایا، اس پر رئیس امروہوی صاحب نے از راہ تفنن پوچھا تھا، قبلہ کیا اب بھی حور و غلمان کی للک باقی ہے، مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا کیوں نہیں، رئیس اس پر بھی باز

نہیں آئے کہا اچھا تو پھر میں انتظام کردوں جوتوں سے کھایئے گا، نیاز کے ہاں ہر بات میں ایک بات کیوں نہ ہوتی۔ غالب کی مشکلات کو آسان کیا تو اس پر بھی لے دے ہوئی اور فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کی طرح نیاز بھی عرصۂ "جنگ" میں کام آئے، میر خلیل الرحمٰن، تقی صاحب سے شکوہ سنج ہوئے، نیاز کے مضامین ایک تو مطبوعہ چلے آرہے ہیں دوسرے اخباری نقطہ نظر سے بھی جاندار نہیں ہوتے۔ خدا بھلا کرے تقی صاحب کا میر صاحب کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے "جنگ" میں چھپنے والی بعض تصاویر پر سینکڑوں روپیہ اٹھ جاتا ہے اور نیاز کو تو ان کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کی پنشن ملتی ہے آپ کے اخبار سے، میر صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور نیاز نوازی کی داد دینا پڑتی ہے کہ پھر کبھی اس موضوع پر کسی سے گفتگو نہیں آئی، اس بحث و نظر میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہوگیا، سید محمد تقی راوی ہیں کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں حضرت دفتر جنگ کی تیسری منزل پر میرے پاس چلے آرہے ہیں، میں حیران کہ اس عمر میں اتنی سیڑھیاں طے کر کے آنے کا سبب کیا ہے، سخت پریشانی اور ندامت کے عالم میں عرض کیا حضرت آپ نے کیوں زحمت اٹھائی، مجھے بلا لیتے یا فون پر حکم صادر فرمایا ہوتا، کہنے لگے میاں یہ کیا بات ہے میرے مضمون دفتر جنگ میں تو آرہے ہیں اخبار جنگ میں چھپ نہیں رہے، تقی صاحب نے آئندہ ایسا نہ ہونے کا یقین دلا کر اس مرد بزرگ کو بصد احترام رخصت کیا کراچی کی زندگی میں پیٹ پالنا بھی بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔

یہ تھیں وہ مصروفیات اور ہنگامے جو زنجیر بن گئے تھے اور وہ کراچی سے ایک قدم بھی باہر نہ نکال سکے، یہاں کی آب و ہوا، مشاغل کار، شعری و ادبی مجالس نے ان کی صحت پر بھی خوشگوار اثر ڈالا، بقول رئیس امروہوی

رخ پہ لالی چھا گئی چہرے پہ ماس آنے لگا
حضرتِ والا کو پاکستان راس آنے لگا

طفیل محمد نقوش نے عائشہ خاں کا نام لے کر کوئی زوردار انکشاف نہیں کیا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، عورت تو نیاز کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، سید مبارک شاہ جیلانی

کے نام ایک خط کا ابتدائیہ یہ ہے۔

میں اگر" کوئی پرست" ہوں تو صرف

عورت پرست یا حقیقت پرست

میرے خیال میں نیاز کا مثلث کچھ اس طرح بنتا ہے۔

عورت حقیقت اور ماش کی دال۔

سردیپ رانی پر مائل ہوئے تو نگار تخلص سے نگار ہی میں چھپنے لگیں، فضل حق قریشی نے طاہرہ دیوی شیرازی کا شوشہ چھوڑا تو بیچارے کلکتہ کی گلیوں میں جھانکتے پھرے نیاز نمبر میں "عہدِ رنگیں کے یادگار مقامات" دس گیارہ گنوائے گئے ہیں، غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مقدر جو بے حد مشکوک ہے حسن کامل ہی رہا ہو، نیاز صاحب سے میرا معاملہ خوردی بزرگی کا تھا۔ اے کاش وہ میرے یار رازدار ہوتے تو بہت سی گفتنی و ناگفتنی اگلوا لیتا۔ خلوتیانِ راز کی پوری ایک کھیپ موجود ہے مگر مہر بلب،

ستمبر ۱۹۶۳ء میں ایک بار ئیں پھر جا دھمکا، کواڑ نیاز صاحب نے بنفس نفیس کھولے آہا آپ ہیں! مجھے کمرہ استقبالیہ میں بٹھایا، خیریت دریافت کی اور جھروکے میں لکھنے چلے گئے۔ صاحبزادگان قمر، سرفراز، اور بیگم صاحبہ سے گفتگو رہی۔ میں نے بھائی قمر کے ذریعے ایک مضمون ملاحظے کیلئے پیش کیا معلوم ہوا، اس وقت نہیں دیکھ سکتے، کھانے کی میز پر ایک سے زیادہ قسم کی چیزیں تھیں، حضرت نے بریانی کھائی، گوشت کی خرابی کا ذکر کیا اور پانچوں انگلیاں چاٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے، مجھے تو اس سے گھن نہیں آئی مولوی عبدالحق یقیناً لال بھبھوکا ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے اور فرماتے، لیجئے اس سے بھی شوق فرمائیے، میں نے پوچھا آج کل کس موضوع پر لکھ رہے ہیں آپ۔ فرمایا: موضوع کیا ہے ایک تاریخ ہے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں، میں نے دیکھا مزاج میں خشونت جگہ پا چکی ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھلائے جا رہے تھے، سب گھر والے چوکنے نظر آئے، کھانے کے بعد میں سلام کرنے ان کے کمرے میں گیا تو لیٹے ہوئے سر دکھا رہے تھے، گھر میں لباس ململ کا کرتہ بنیان اور ململ ہی کا تہہ بند تھا۔

والد محترم کی ہمسفری کا لطف میسر آیا، وجع المفاصل کے پرانے مریض، مرض غالب تھا اس لئے سیڑھیاں طے کرنا تو کجا موٹر سے قدم نیچے رکھنے میں بھی بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لئے خبر پاتے ہی فوراً بالکل نوجوانوں کی سی پھرتی سے نیاز صاحب نیچے اتر آئے، کرسیاں لگ گئیں اور ہم سب براج گئے، باتیں غم جاناں سے گردش دوراں تک پہنچیں، کچھ بھول گئیں چند یاد رہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کی بڑی تعریفیں کرتے تھے بیچارے نے گھٹی گھٹی وزارت کی اور کر بھی کیا سکتے تھے وزیر نہ ہوتے تو اچھا تھا وہ اس سے بلند تر تھے، لغت نویسی کی بات چلی تو کہنے لگے ترقی اردو بورڈ نے ایسے الفاظ بھی لے لئے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں۔ اب کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹتا صرف الف ممدودہ ہی پندرہ سو صفحے کا ہو گیا ہے، جو ابھی تک پریس نہیں گیا، میں بیچ میں بول پڑا کیا موجودہ طریق کار کو بدلا نہیں جا سکتا؟ کہنے لگے۔ اب تو کمبل ہی نہیں چھوڑتا وہاں کام کرنے والے صرف شوکت سبزواری ہیں۔ نیاز صاحب نے نسیم امروہوی کا نام نہیں لیا۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ پورے کام کی نگرانی وہی کر رہے ہیں، آج کل شان الحق حقی مختار کل ہیں جوش تو ٹھہرے جاہل کاہل نااہل، ابا نے اپنی بیاض پیش کی، پو کریاں بھرتے ہوتے اوپر گئے اور ایک مصرع لکھ کر لائے۔

ع فرحتم بادا کہ رونقش بامداداں دیدہ ام

ہمیں اپنے چچازاد بھائی کے استقبال کیلئے ہوائی اڈے جانا تھا وہ حج کر کے آرہے تھے، ولی عہد بہادر سرفراز نیازی کو بھی ساتھ لے لیا واپسی دس بجے رات کو ہوئی یہاں ہماری نحیف اور نزار گاڑی تھک ہار کر دم لینے لگی، نیاز صاحب نے اوپر بلا لیا۔ کھانا کھلایا، نیچے اترے ۔ ہوا کھاتے اور باتیں کرتے رہے۔ چچیکا میں بھی نہ رہ سکا، حجر اسود سے بوس و کنار اور طواف کا مسئلہ پیش کر دیا، فرمایا۔ بس رسم ہے اک چلی آرہی ہے، اسی طرح شیطان کو پتھر مارنا، صفا و مروہ میں دوڑنا، حضرت علی نے تو ایک خطبے میں کہا بھی تھا، اگر اسلام ابتدائی دور میں نہ ہوتا تو میں بہت سی رسمیں بدل دیتا یا ختم کر دیتا، رئیس امروہوی کی زود گوئی کی تعریف کرتے رہے، ذرا سی توجہ کریں

The Nigar Office

LUCKNOW.

۳/۱۱

مخدومی - خط ملا - پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے

تصنیف و اشاعت کو ثانوی درجہ میں رکھ دیا - بہرحال غنیمت

ہے کہ اب بھی آپ کو اس کا خیال آیا اور اس کی تلافی

کرنے کے لئے آپ آمادہ ہیں - لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقتاً

آپ ہیں یا نہیں؟ آپ کی تعلیم تو عربی و دینیات کی ہے اور ریویو یا نوٹ

تو لکھ سکتے ہیں - میں چاہتا ہوں کہ آپ اردو ادب کی

کتابوں میں دلچسپی لیجئے اور اگر وہاں کوئی ہو رہا تک ہے

تو میرے پاس بھیجئے تاکہ آپ کی نگرانی ہو سکے -

آپ میرا یہ خط عزیز و الا محترم کو دکھا دیجئے

دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں

ریشن کا حاشیہ صحیح حرف مزدوری غائب ہو گیا

"لاذہمرہ" کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ درست ہے

ان جناب کی اور رشتے کے لئے کہہ سنے تھے اور کہوں ۔

سبب پڑول پابند رہے۔ اس کو جانکر کیا سمجھوں گا ۔

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا —

فی الحال میرے پاکستان آنے کی کوئی صورت

نظر نہیں آتی ۔ آپ کبھی اگر ہندوستان

آئیں تو ضرور ملئے ۔

اپنی تصویر بھی بھیج دیجئے (ضرور)

[illegible]

[۱۹۵۵ء]

تو روزانہ خطعات کی خامیاں بھی جاتی رہیں، میں نے کہا وہ تو فرائض منصبی کے تقاضے ہیں، زور دے کر کہا، نہیں بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے، یورپ اور عرب ممالک کا سفر اس لئے نہ کرسکے کہ روپے پیسے کی فراوانی کبھی رہی ہی نہیں، مگر مجھے اس سے اختلاف ہے، وہ چاہتے تو جا بھی سکتے تھے، نگار کیلئے "لمیٹڈ کمپنی" کا مشورہ سن کر مایوسانہ گویا ہوئے، بھئی یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے میں تو بے تعلق ہو کر رہ گیا ہوں گاڑی کا مزاج کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آتا دیکھ کر میں نے کھسکنے کی ٹھان لی، آخر کہاں تک اس مردِ بزرگ کو لب سڑک کھڑا رکھتے۔

بالکل غیر ارادی طور پر ایک دفعہ مرحوم سے نوک جھونک بھی ہو گئی، مولوی عبدالحق کا مذہبی مسلک عنوان باندھا، اٹکل پچو ادھر ادھر کی چند چیزیں جوڑ جاڑ کر اشاعت کیلئے منتخب نگار کو نہ جانے کس زعم میں کر بیٹھا اور براہ راست گھر کے پتے پر رجسٹرڈ بھجوایا، پورا مضمون اس نوٹ کے ساتھ واپس آیا، مضمون واپس کر رہا ہوں مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی، جواباً ایک کارڈ لکھ کر رکھا ہی تھا کہ وہاں سے بھی ایک کارڈ صادر ہوا، اقتباس ملاحظہ فرمائیے اسے چھوڑ دیئے کہ مرحوم کے بیشتر خط "اقتباسی" ہوا کرتے تھے، شوکت تھانوی کی زبان میں "تار نما خط"، آپ کا مضمون یوں تو بہت خوب تھا لیکن اس کی اشاعت ضروری نہ تھی، میں نے اس کے جواب میں بھی ایک کارڈ داغ دیا، جواب "مفصل" آیا،

"آپ کے دو کارڈ ملے" آپ کی برہمی سے لطف آگیا، میں نے آپ کے مقالہ کی تعریف کی اس لئے کہ وہ اپنی زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے واقعی بہت خوب تھا لیکن اس کی اشاعت سے اس لئے معذرت چاہی کہ موضوع اس کا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

مولوی عبدالحق کی مذہبیت پر گفتگو کرنا جبکہ انہیں کوئی مذہبی اہمیت حاصل نہ تھی بیکار سی بات ہے ایک خط میں آپ نے آزاد وغیرہ کے سلسلے میں بعض حضرات کے حیات معاشقہ کا بھی حوالہ دیا ہے، سو

اس کی حیثیت بالکل مختلف ہے چنانچہ دسمبر کے نگار میں ایک مضمون اسی نوعیت کا شائع بھی ہو رہا ہے آپ دیکھیں گے کہ میں نے اپنے نوٹ میں کیا لکھا ہے بہرحال آپ اگر اجازت دیں تو آپ کے خطوط شائع کر دوں اور ساتھ ہی اپنا جواب بھی"

اب میں پریشان یا الٰہی، خیر غصے کی تو نہیں، احساس شکست کی جھانجھ میں نجانے کیا کیا کچھ لکھ ڈالا ہوگا / جی کڑا کر کے اشاعت کی" اجازت مرحمت فرما ہی دی، دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے نے بڑی راہ دکھائی، کھول کر جو دیکھا تو صفحہ ۶۷ پر" مولوی عبدالحق کا مذہبی مسلک" کے بجائے، رقم تھا۔

مولوی عبدالحق کا مذہب

یہ تھا عنوان ایک مقالہ کا جسے سید انیس شاہ صاحب جیلانی (محمد آباد ضلع رحیم یار خاں) نے اشاعت کیلئے مجھے بھیجا تھا میں نے اسے پڑھ کر اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دیا کہ "مضمون خوب ہے لیکن اس کی اشاعت نہ کوئی مذہبی خدمت ہوگی نہ ادبی" میری یہ بات" انیس شاہ" کو پسند نہیں آئی اور انھوں نے تابڑ توڑ دو خط مجھے لکھے، پہلے خط کے الفاظ یہ ہیں۔

خلاف توقع تو نہیں تاہم میرا مضمون کل مجھے واپس مل گیا آپ فرماتے ہیں" مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی" گستاخی معاف، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اقبال کی حیات معاشقہ کو منظر عام پر لانا، ابوالکلام کی واردات عشق کی کرید اور دریابادی کی عیش کوشیوں کے واقعات" نگار" میں شائع کر کے کس مذہب اور کون سے ادب کی خدمت کی گئی ہے، افسوس آپ نے میرے مضمون کا ابتدائی حصہ غور سے نہیں دیکھا میں نے رونا اسی بات کا رویا تھا اگر میں آپ کی بات مان لوں تو اردو اور انگریزی ادب کی تمام سوانح عمریوں کو نذر آتش کر دینا پڑے گا، چونکہ ہر کتاب میں موضوع

کے مذہبی مسلک پر جی کھول کر گفتگو کی گئی ہے اگر آپ صاف صاف لکھ دیتے کہ پرستارانِ عبدالحق کی یورش سے گھبراتا ہوں تو کچھ بات بھی بنتی، آپ سے اس کم ہمتی کی توقع ہرگز نہ تھی، مجھے اب بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں اور نہ میری عقیدت اور محبت میں فرق آیا ہے، یقیناً یہ چند سطریں میری برہمی کی غماز نہیں۔

اور دوسرے خط کے یہ:۔

مضمون کی واپسی کی رسید ارسال کر چکا تھا کہ آپ کا کارڈ شرف صدور لایا میرا گمان بالآخر غالب ہی رہا، اب تک سنا ہی تھا اور تجربہ بھی یہ ہے کہ آنجناب کی رائے بے لاگ ہوا کرتی ہے اور لگی لپٹی نہیں رکھی جاتی، ایسے میں آپ کا یہ فرمانا کہ "یوں تو مضمون بہت خوب تھا،" محل نظر ہے، اگر یہ تعریف بے جا ہے تو پھر آپ کی صاف گوئی کو کیا ہوا، اور اگر توصیف جائز ہے تو اس کی اشاعت سے گریز کیوں؟ آپ یا تو یہ کہیے کہ محض میرا دل رکھنے کیلئے آپ نے مضمون کو "بہت خوب" سے نواز دیا، یا پھر اس کے لچر ہونے کا اعلان کر دیجئے۔

ہر چند ان خطوط کا جواب خط ہی کے ذریعہ سے دیا جا سکتا تھا لیکن وہ شاید زیادہ مفصل نہ ہوتا اور انیس شاہ صاحب کی کوئی نہ کوئی شکایت پھر بھی رہ جاتی، علاوہ اس کے بعض باتیں اس سلسلہ میں ایسی بھی آجاتی ہیں جن کا تعلق نفس مضمون نگاری سے ہے اس لئے میں نے نگار ہی کی وساطت سے جواب دینا مناسب سمجھا،

میرا یہ کہنا کہ "مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی" اور اس کے جواب میں آپ کا "اقبال کی حیاتِ معاشقہ" "ابوالکلام کی واردات عشق" اور "دریابادی کے واقعات عیش کوشی" کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمانا کہ یہ کونسی مذہبی یا ادبی خدمت تھی بڑی عجیب سی بات ہے،

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مضمون نگاری کا اولین اصول یہ ہے کہ جو بات لکھی

جائے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق موضوع سے ضرور ہونا چاہیئے اور اگر موضوع گفتگو کوئی خاص کردار ہے تو پھر ہم کو اس کی انہیں خصوصیات کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا ہوگی جن سے وہ زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور اگر کوئی بات ان میں ایسی پائی جائے گی جو ان کے مسلمہ کرداری خصوصیات کی متناقض ہے تو اس پر بھی گفتگو کرنے کا حق ہم کو پہنچتا ہے

اب آپ اس اصول کے پیش نظر خود اپنے اعتراضات پر غور کیجئے

۱۔ اقبال شاعر تھے اور فلسفہ کے علاوہ حسن و عشق کے بھی شاعر تھے اس لئے اگر ان کی حیات معاشقہ پر اظہار خیال کیا جائے تو یہ قطعاً ادب کی خدمت ہوگی کیونکہ اس طرح ہم کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ اقبال کے جذبات محبت کا (خواہ وہ آسودہ رہے ہوں یا ناآسودہ) ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔

۲۔ ابوالکلام کے واردات عشق کی جستجو یا اس پر اظہار خیال بھی بے محل بات نہیں کیونکہ وہ شاعر نہ ہوں تو بھی ان کی نثر کی شاعری اس بات کی غماز ہے (اور خود انہوں نے غبار خاطر میں اس کا صاف صاف اظہار کر دیا ہے) کہ وہ "کوچۂ عشق" سے نابلد نہیں رہے اور اس بنا پر اگر ان کے واردات محبت کی جستجو کی جائے تو بھی ادب کی خدمت ہوگی اور اگر ان کی مذہبی اہمیت کو سامنے رکھا جائے تو یہ مذہب کی بھی خدمت ہوگی کیونکہ اس سے ثابت ہو سکے گا کہ مذہب اور محبت نہ صرف یہ کہ وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کہ مذہب کی صحیح روح غالباً جذبہ عشق ہی سے پیدا ہو سکتی ہے

۳۔ اسی طرح مولانا دریابادی کے ازدواج ثانی پر اگر نگار میں اظہار خیال کیا گیا تو اسے کیوں محل نظر سمجھا جائے کیونکہ ان کی بڑھی ہوئی مذہبیت اور جذبات تقدس کو دیکھتے ہوئے ان کا نکاح کرنا نہیں بلکہ نکاح کے بعد مہینہ کے اندر ہی اندر طلاق دے دینا (اور وہ بھی اس خاتون کو جو ان کے مرحوم دوست کی بیوہ تھی اور جس سے انہوں نے محض ازراہ شفقت و ہمدردی شادی کی تھی) بڑی عجیب سی بات تھی پھر اس کے بعد طلاق کی جو تاویل انہوں

نے پیش کی وہ خود ایک مذہبی مسئلہ بن گئی اور اس طرح اس پر گفتگو کرنا یقیناً مذہب کی خدمت تھی۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر گفتگو کرنے کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی کیا انہوں نے کبھی مذہبی عالم و فقیہہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا کیا وہ کوئی تحریر یا کتاب اپنے بعد ایسی چھوڑ گئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ انہیں مذہب سے بھی کوئی دلچسپی کبھی رہی تھی مولوی عبدالحق کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ مذہب سے قطعاً بیگانہ تھے اسلامی عقائد پر انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا نہ انہوں نے تاریخ اسلام کا غائر مطالعہ کیا یہاں تک کہ بعض حضرات انہیں دہریہ اور ملحد سمجھتے تھے حالانکہ سچ پوچھئے تو وہ غریب یہ بھی نہ تھے کیونکہ محض خدا اور مذہب سے بے تعلق رہنے کا نام الحاد نہیں ہے، رہا اس سے انکار سو یہ اتنی بڑی بات ہے کہ انہیں کبھی اس کی جرأت ہی نہ ہو سکتی تھی۔

ان حالات میں آپ کا مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر کچھ لکھنا بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی سرسید کے حالات میں یہ جستجو کرے کہ آیا وہ ستار بھی بجا سکتے تھے یا نہیں یا حالی کے متعلق یہ گفتگو کرے کہ انہیں رقص و سرود میں کتنا ملکہ حاصل تھا۔
ہاں اگر آپ مولوی عبدالحق کی صرف ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوتے انکی اہمیت یا عدم اہمیت پر گفتگو کرتے تو بیشک یہ بات برمحل ہوتی، آپ نے مثالاً اردو انگریزی کی سوانحی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے ان میں بے شک ہر قسم کی چھان بین ہوتی ہے لیکن آپکا مضمون تو سوانح عبدالحق سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا محض ایک مختصر سا مقالہ ہے، ہاں اگر ان کی مفصل سیرت پر آئندہ کوئی کتاب تصنیف کرنا مدنظر ہو تو اس میں بے شک آپ ان کے مذہبی خیالات پر بھی سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔

لے معرکہ مذہب و سائنس، کا دیباچہ بجائے خود ایک کتاب ہے اس کے علاوہ بھی متعدد تحریروں اور تراجم سے مولوی صاحب کے معتقدات عیاں ہیں۔

ایک بات اور رہ گئی وہ یہ کہ میں نے آپ کے مضمون کے متعلق لکھا کہ وہ خوب ہے سو یہ بات میں پھر کہوں گا کیونکہ جس حد تک زبان و بیان ادب و انشا کا تعلق ہے۔ وہ یقیناً نہ صرف خوب بلکہ بہت خوب ہے اور میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اسی خوبی کے ساتھ کسی اور موضوع پر اظہار خیال فرماتے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالباً پرستاران عبدالحق کی یورش سے گھبرا کر میں نے آپکا مضمون شائع نہیں کیا سو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبد و فسوس

سعدی ان نیست ولیکن چوتو فرمائی ہست

آپ نے دیکھا نیاز صاحب کے تردیدی دلائل کے حرف حرف سے پہلو تصدیق اور تائید کا نکلتا ہے، چونکہ یہ "کارروائی" باب المراسلہ والمناظرہ کے تحت عمل میں آئی تھی اس لئے میں نے جواب الجواب لکھنا ضروری سمجھا، رسید آئی، آپ نے بڑی عجیب بات لکھی کیا عبدالحق بھی اورنگ زیب ہی کی طرح اپنے زہد و تقویٰ کیلئے مشہور تھے مومن کو کافر کہنا تو خیر ایک بات ہے دلچسپ لیکن کافر کو کافر کہنے میں کیا لطف، افسوس میں نے اپنے طویل مراسلے کی نقل نہ رکھی، اس کمی کو مولانا غلام رسول مہر کے ایک مکتوب سے پورا کرتا ہوں۔

"مولانا عبدالحق مرحوم کے متعلق آپ کا مقالہ نہ چھاپنے کے سلسلے میں نیاز صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے میرے نزدیک تو وہ چنداں محکم نہیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق جو توجیہات نکال لی گئیں وہ آپ کے مضمون کے بارے میں بھی نکالی جا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ،

۱۔ مولانا مدت العمر اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔

۲۔ انہوں نے سالہاسال تک اس زبان کے سلسلے میں گاندھی جی کانگریس اور مخالفین سے جنگ جاری رکھی۔

۳۔ ان کے اس عزم و ہمت میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا یا کہہ لیجئے کہ ایک محرک مذہب بھی تھا کیونکہ اردو کی دوسری خصوصیات کے

علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ دو سو سال سے مسلمانوں کے فکرو نظر کی بہترین دولت اس زبان میں منتقل ہوتی رہی اور اس کے مٹائے جانے سے جہاں نقصان کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی ثقافت کی ایک مشترکہ ثروت ناپید ہوتی وہاں ایک بڑا نقصان یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے ارباب فکرو نظر نے دو سو سال میں جو کچھ پیدا کیا تھا وہ مٹ جاتا یا آئندہ نسلوں کیلئے ناقابل فہم بن جاتا۔

۴۔ خدمت ادب میں مولانا عبدالحق کے ایک زبردست محرک کو نظرانداز کر دینا سراسر غیر مناسب تھا لہذا ان کی دینی حیثیت پر بحث عین مناسب تھی۔

۵۔ پھر مولانا بحمد اللہ مسلمان تھے اور ان پر مختلف لوگوں نے دین سے بے تعلقی یا بے پرواہی کے الزامات لگائے گویا ایک جلیل الشان خدمت گذار ادب اردو کی سیرت میں سقم کا پہلو پیدا کیا، ضروری تھا کہ اس سقم کا ازالہ کر دیا جاتا اور اس مضمون کی اشاعت بہر حال ضروری ہے پھر جب مضمون اچھا ہے تو کیوں نہ چھاپا جائے۔

میں نے سقم کو لوگ کہتے ہیں غیر جانب دارانہ "ہوا" دی تھی، ازالہ کہاں ممکن ہے مولوی صاحب مرحوم حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے تھے، بلکہ یہ کہنے میں زیادہ لطف ہے کہ پیدا ہوئے تھے۔

ہمت میں نے بھی نہیں ہاری "مولوی عبدالحق دیدہ و شنیدہ" کے عنوان سے ایک اور مضمون ارسال کر دیا، جسے ان کو چھاپتے ہی بنی، ایک سطری کارڈ، یہ کہ مضمون مل گیا جنوری ۱۹۶۵ء کے نگار میں شائع ہوگا، میں نے اس پر بھی تاکیداً لکھا، کاٹ چھانٹ قطعاً نہ کی جائے، فرمایا: آپ کے مضمون میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا سوا اس کے کہ عبارت میں اگر کہیں جھول تھا تو اسے دور کر دیا گیا ہے، اور وہ جھول معلوم ہے آپکو کہاں کہاں تھا۔ جہاں تعریفی کلمات زبانِ قلم سے بے اختیار ٹپک پڑے تھے حذف کر دیئے گئے

یہاں یہ بتانا بھی خالی از علت یا دلچسپی نہ ہوگا کہ اسی مضمون کو لیل و نہار اردو ڈائجسٹ سیارہ ڈائجسٹ، عالمی ڈائجسٹ، ماہ نو نا قابل اشاعت گردان چکے تھے، اردو ڈائجسٹ کے عملے نے تو حسن کارکردگی کی انتہا کردی، میں نے از راہ حماقت مولوی عبدالحق کی دو قلمی تحریریں بھی نتھی کر کے بھیج دیں تاکہ ان کے عکس بھی چھپ جائیں اور لوگ مولوی صاحب کی پاکیزگی تحریر سے محظوظ ہوں، یہ دونوں تحریریں سال چھ مہینے کے شدید تقاضوں کے بعد مضمون جب مجھے واپس ملا تو غائب تھیں، اس پر صبر نہ کرتا تو کیا کرتا، ماہ نو کے ظفر قریشی میرے پرانے کرم فرما ہیں، انہوں نے حق بزرگی اس طرح ادا کیا کہ پورا مضمون اپنے الفاظ میں لکھ کر میرے نام بغرض "منظوری" ارسال فرمایا، بیچاروں نے بڑی مشقت اٹھائی، ظاہر ہے مجھے معاوضہ بھی ملتا اور "نام" بھی ہو جاتا مگر میں نے بصد ادب معذرت چاہ لی اور مضمون کی واپسی پر اللہ اور ظفر صاحب کا شکر ادا کیا، یہ مضمون نگار سے شورش کاشمیری کے چٹان میں بھی نقل ہوا، داد دلی تک سے ملی، اس طویل تحریر کا مقصود اصلی خود ستائی نہیں صرف یہ جتلانا ہے کہ، لکھنا سہل اور چھپنا دشوار تر ہے۔

ایک بار آپا دھاپی میں کراچی جانا ہوا، صرف دفتر نگار میں جھانک کر چلا آیا، بزرگانہ شفقت ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں: آپ نے بھی کمال کیا کہ کراچی آئے دفتر نگار گئے اور مجھے خبر تک نہ کی دفتر نگار سے فون ہی کر لیا ہوتا، آج یہ باتیں روح کا پیکان بن کر رہ گئی ہیں نجانے کس ترنگ میں گیا اور چلا آیا۔

ایک مثال اور: عزیزی انیس صرف ایک دن مجھ سے ملنے آئے تھے اس کے بعد سے غائب ہیں غالباً کراچی کی دلچسپیوں نے ان کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ شکایت والد صاحب سے کی گئی تھی۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجے، اس نوٹ کے ساتھ واپس آجاتے: یہ نہ کیا کیجئے مجھے تکلیف ہوتی ہے، مبارک اردو لائبریری کیلئے دو دو بوریاں کتب و رسائل کی بھجوا دیتے، میرے سامنے بھی ایک مینار کھڑا کر دیا جاتا اور میں اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹ کر چلا آتا، لائبریری کیلئے ربڑ کی مہروں کی ضرورت پڑی، مہروں کے ساتھ ساتھ بلاک بھی پارسل میں آئے، کراچی آنے کے بعد تو وہ خط بھی خاصے لمبے چوڑے

لکھنے لگے تھے، ادھر ابوالخیر مودودی کو یہ لکھنے کی ضرورت خدا جانے کیوں پیش آئی، وہ جو چند بیہودہ سے اعتبارات ہیں مثلاً مروت ایثار دوست نوازی وغیرہ، نیاز صاحب ان لغویات کے بس اسی حد تک قائل ہیں کہ ان سے ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

نیاز مرحوم نے روپے پیسے کی دھول کبھی نہیں اڑائی، تنگ دست بھی نہیں رہے، دور اندیش معاملہ فہم اور کاروباری حد تک کاروباری بھی تھے، کراچی میں دو منزلہ ذاتی مکان تقریباً چالیس ہزار روپے میں خرید لیا تھا، جو عابد منزل سے بدل کر اب نیاز منزل کہلاتا ہے، یہ بھی کسی نے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں فلمی کاروبار بھی شروع کیا تھا، مگر اس میں چل نہ سکے، البتہ فلمیں دیکھنا نہیں چھوڑیں اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی، ذاتی توہین بہت کم برداشت کرتے اور عدالتی کارروائی بھی کر گزرتے مدرس بھی اچھے تھے، حکیم اجمل خان کے انگلش اسکول کی ہیڈ ماسٹری کیلئے مولانا ابوالکلام آزاد نے انہی کو منتخب کیا تھا۔

میں جب آخری بار (۱۲ ستمبر ۶۵ء) ان سے ملا ہوں (دیکھ ایک روز پہلے چکا تھا جناح ہسپتال جا رہے تھے ٹیکسی میں) تو بظاہر تندرست دکھائی دیئے، مطالعے کے کمرے میں سے چل کر کمرہ استقبالیہ میں آئے، اور بڑھ کر مجھے پہلی اور آخری بار گلے سے لگالیا، ان کی نگاہوں میں خلوص اور محبت کی ملی جلی کیفیت دل کے پار ہوئی جاتی تھی، کسی قدر کھوئے کھوئے سے گم سم چپ چپ، بولتے وہ یوں بھی کم تھے بجز خلوتیانِ راز کے، رعشہ بڑھا ہوا تھا، کینسر کے زخم کی وجہ سے مونچھیں بڑھ گئی تھیں اور بھلی لگتی تھیں، کیمرہ ہوتا تو اس وقت کی تصویر یادگار ہی نہیں نادر روزگار ہوتی ہماری موجودگی میں ان کے ایک عزیز ڈاکٹر تھے یا شاید وکیل آگئے اور پاک بھارت جنگ پر کچھ باتیں گوش گزار کرتے رہے جنہیں مرحوم نے بڑی توجہ سے سنا خود کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔

میں تنہا نہیں تھا۔ شیخ محمد صادق اور اقبال ہاشمی سعادت دید میں شریک تھے اپنے ساتھیوں کا تعارف میں نے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ لوگ آپ کے چاہنے والوں میں سے ہیں، کہیں کہیں آپ سے نظریاتی اختلاف بھی رکھتے ہیں ٹکر ٹکر دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں، برادر عزیز سرفراز نے "ٹیپ ریکارڈر" کا ذکر کیا، اتفاق سے اس وقت میرے پاس

ایک فیتہ ایسا تھا۔ جس میں حیرت شملوی مرحوم کی آواز مقیّد ہے، جی چاہا حیرت کی آواز نیاز صاحب کو سنوا دوں، سرفراز نے ٹیپ ریکارڈر لاکر رکھا، بٹن دبایا گیا، پتہ چلا اس کی ساخت کچھ اور ہے اور یہ فیتہ یہاں کام نہ دے گا، اس تمام کاروائی کو نیاز خاموشی سے دیکھتے رہے، معترض نہیں ہوئے، میں نے سرگوشیوں میں سرفراز سے پوچھا اپنے ابا کی آواز بھی کسی فیتے میں بھری یا نہیں، بولے اس کی اجازت نہیں تم کہو تو شائد مان جائیں، مگر ہمت میری بھی نہ پڑی اور بات رہ گئی، اقبال ہاشمی مصر تھے کہ میری بیاض نیاز کی قلمی تحریر سے خالی رہ گئی تو تا زیست خلش رہے گی۔ ناچار اس شوق فضول کے پیش نظر جرأت رندانہ سے کام لینا پڑا اور یہ کہہ کر میں نے بیاض آگے بڑھا دی، آپ کا تصور خدا کیا ہے، ممکن ہے یہ ان کی آخری تحریر ہو جو ایک عقیدت مند کی بیاض میں نقل ہوئی ہے آیئے خدا کی باتیں آپ بھی سن لیجئے

خدا کا تصور اور خدا کا وجود دونوں ایک دوسرے سے مختلف باتیں ہیں، یہاں تک کہ خود انسان نے جو تصور خدا کا قائم کیا ہے وہ بجائے خود ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ حقیقت خداوندی سے بے خبر ہے۔

چوں ندیدم حقیقت رہ افسانہ زدیم

نیاز فتحپوری ۶۵ $\frac{12}{9}$

اس کے بعد وہ آٹھ مہینے زندہ رہے۔ زندہ کیا رہے مر مر کے جیتے رہے۔ وہ جو ہوا کے زور سے درخت کی ٹہنی سمیت کنویں میں جا ٹپکا اور نکل آیا، بھنور میں ڈوبتی ہوئی کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے آ لگا، سوتے میں آگ کی لپیٹ میں آکر بچ نکلا، دلدل میں پھنس کر گھوڑے کو تو نہیں اپنی جان بچا لایا، دو قدم پر بیٹھے ہوئے شیر کو اپنی موجودگی کے احساس سے بے خبر رکھ لینا، ڈاکوؤں کے نرغے میں گھر کر سلامت رہنا، ریلوں کی ٹکر میں خراش تک نہ آنا، کراچی کے موٹر رکشا بالفاظ دیگر "موت کے گولے" پر سفر کرنا اور معمولی زخم کھانا، مولویوں کی دسترس سے باہر رہنا اور آخر کار ایک پھنسی سے زیر ہونا تعجب خیز تو ہے مگر جو چیز نیاز جیسی بھاری بھر کم ہستی پر غالب آجائے، اس کی بلاخیزی میں شک ہی کیا رہ جاتا ہے، سرطان کا علاج دلی کے ایک ایسے حکیم کے سینے میں دفن ہوا۔ جس نے

محلہ بھر کے کہنے سننے اور خوشامد کے باوجود حکیم اجمل خاں کو خالی ہاتھوں واپس کر دیا جناح ہسپتال اور زمانہ بھر میں دردِ دل اور زخمِ جگر کا علاج تو ممکن ہے مگر اس موذی سرطان کا کوئی توڑ نہیں مرض کبھی بڑھا کبھی گھٹا ، مجموعی طور پر یہ کہنا بجا ہوگا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ہسپتال جاتے جاتے بھی بیوی بچوں کیلئے نون تیل لکڑی کی فکر میں سید محمد تقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''۔ بہر حال یہ بضاعتِ حقیر حاضر ہے اس سے کام لیجئے یا نہ لیجئے میں تو اب چلا اگر اتفاق سے جانبر ہو گیا تو خیر ورنہ ان مقالات کا معاوضہ میری بیوی گلزار بیگم کو ذریعہ منی آرڈر یا دستی اس پتہ پر بھیج دیا جادے ستمبر تک کا حساب صاف ہو چکا ہے'' یہ سن کر جوش نے خوب کہا '' اور اس قوم میں پیدا ہو'' بہر حال نیاز صاحب کے ہاں مرتے مرتے احساس فرض بھی نمایاں ہے۔

مرض الموت میں بھی نیاز کے حوصلے بلند ولولے جوان اور ہمت قوی رہی محب گرامی پیرزادہ لطیف الرحمٰن صدیقی مزاج پرسی کیلئے جانے لگے تو ملّا واحدی صاحب نے کہا یہ فرض میری طرف سے بھی ادا کر دیجئے گا معذور ہوں ورنہ خود حاضر ہوتا، پیرزادہ جب ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو نیاز نے فرمایا واحدی صاحب سے کہہ دیجئے گا میں موت سے نہیں ڈرتا وہ تو آکر رہے گی، میں مسلمان ہوں اور مسلمان مروں گا اس کے گواہ آپ ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کے قلم سے یہ فقرہ بھی موجود ہے، میں ایک سنی مسلمان ہوں اس سے نہ کچھ زیادہ نہ کم۔

کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور وہ بھی مرگیا جس کی موت پر ممکن ہے آسمان خود بھی پشیمان ہوا ہو '' نگار'' زندہ ہے مگر کب تک ، کل وہ آج اس کی باری ہے ، البتہ نگارش نیاز امر ہیں گویا۔

نیاز مر گئے لیکن نیاز مر نہیں سکتے

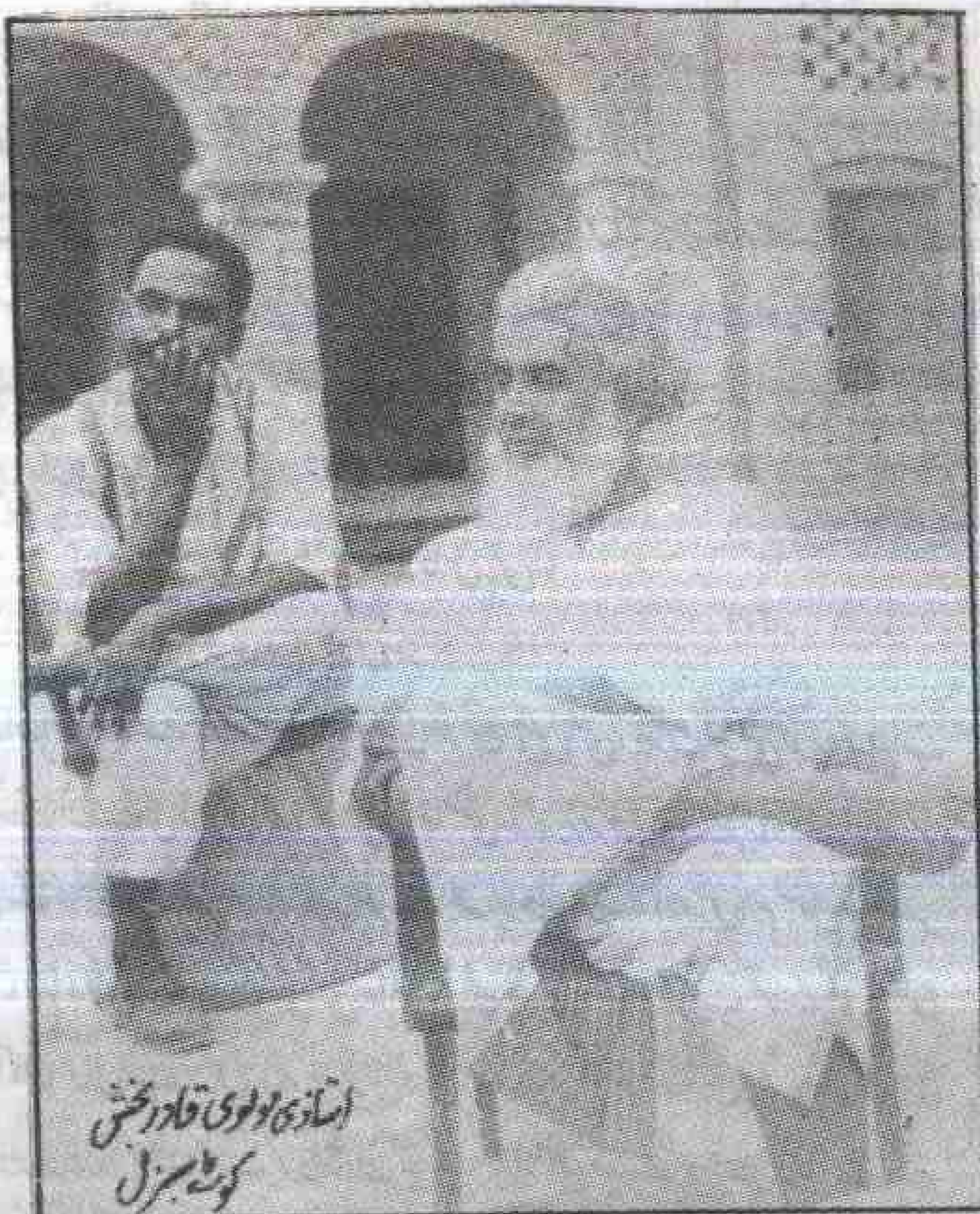
۲۹/ دسمبر ۱۹۶۸ء

ذکر اُس پری وش کا

میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولی ہیں، چاہیئے تو یہ تھا، بو ہر طرف سے کفن و کافور کی آتی، محافل سماع اور قوالیوں کی دھوم ہوتی، اوراد و وظائف، نوافل اور چلہ کشی کے چرچے ہوتے تعویز گنڈے، مریدانِ باصفا کی چہل پہل اور نذر و نیاز کی ریل پیل ہوتی۔ مگر یہاں تو ارکان اسلامی کی بھی ٹھپہ دار پابندی دیکھنے میں آئی یعنی قرآن کی تلاوت تو باقاعدگی سے ہوتی رہتی ہے مگر اس کی دور از کار تاویلات سننے میں نہیں آئیں، فرض کے علاوہ ہزار ہا نوافل کے افسانے کسی نے نہیں دہرائے، مشرع و مقطع کی بجائے ہلکی خشخشی داڑھی پر خاصی نکلتی ہوئی مونچھیں مردانہ وجاہت میں ایک خوشگوار اضافہ محسوس ہوئیں، احباب کی طویل و عریض داڑھیوں اور ریاکارانہ خضوع و خشوع پر ہلکی پھلکی بے ضرر چوٹیں اور مذہبی مسائل پر حوصلہ مندانہ بحث و نظر میں ابّا جان آگے آگے رہے ہیں گھر سے نکل راہ انسانوں کے جنگل کراچی کی لی، مرحوم رئیس احمد جعفری ندوۃ العلماء کے سند یافتہ "مولوی" ہونے کے باوجود داڑھی مونچھ کے جھنجھٹ سے یکسر آزاد، نماز کے عید کے عید بھی روادار نہیں تھے، البتہ غصے کی جھانجھ میں قرآن بھی پڑھتے اور نماز بھی فضا مذہبیت نہیں شعریت سے معمور زیادہ ملی، اس لئے سچی بات تو یہ ہے کہ "مولویوں" کے ساتھ ساتھ علماء کرام کی خوشہ چینی سے بھی یک گونہ احتراز ہی رہا، اسی لیے جب میرے چچازاد بھائی نے اپنے ایک ایسے مہمان کو جس کی مولویت کی سن گن میں پا چکا تھا بولانے کی تحریک کی تو میں گویا مارے باندھے ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا، بیس پچیس میل چل کر گاڑی ایک رئیس کے دولت کدے پر رکی، ہاتھوں ہاتھ تو نہیں بہرحال لیا گیا، مہمان مذکور سے مصافحہ اور رسمی و رواجی معانقہ ہوا، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد حضرت آمادہ

سفر ہوئے ان کے ہمراہی نے اسفنج کی چپل ہٹا کر پمپ شو پہنا دیے اور ہم پھر انہیں لے ہوں سے گھر کو آئے جن سے گئے تھے، باتیں اپنی نظر بندی اور قید و بند کی، قصے اخلاقی قیدیوں کے، اور ان کے نفسیاتی مطالعہ کا تذکرہ، ان کے کردار کی بلندی، عادات و اطوار کی شائستگی اور خدا جانے کیا کیا کچھ سناتے رہے، محمد آباد پہنچے تو گفتگو کا رنگ کچھ اور نکھر آیا، مذہبی سیاسی ثقافتی ادبی و شعری لطیفے چٹکلے، طنز و مزاح غرض وہ کسی میں بند نہ تھے، بڑی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ باایں ریش و فش مولویانہ تقشف، یبوست اور تنگ نظری کا دور دور پتا نہ تھا، میں اس دو تین گھنٹے کی نشست میں منقار زیر پر رہا، گل افشانی گفتار، حیا و ادا کے مزے لوٹتا رہا، اتنے ہی میں اندازہ ہو گیا کہ آدمی معقول اور کشادہ ذہن ہے، ظاہری شکل و صورت بھی جاذب نظر تھی، نکلتا ہوا قد، کتابی چہرہ، غالب کی زبان میں چمپئی رنگ چاندی سی مشت بھر سے ذرا بڑی کھچڑی چھدری داڑھی، شرعی کتر داں لب، ناگوں کی طرح بل کھاتی ہوئی بنی سنوری زلفیں، جو عنفوان شباب میں گھنی زلفوں کی چغلی کھا رہی تھیں، سرخ ڈورے پڑے ہوئے چھوٹی چھوٹی جگر جگر کرتی ہوئی خمار آلود سرمئی آنکھیں جن میں ساری مستی شراب کی سی تھی، شرارت آمیز سوالات کے جواب میں ایک اندازِ دلربایانہ سے دیکھتے کہ معترض گھائل ہو کر رہ جاتا، اندازِ گفتگو ایسا پیارا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، اگر میں یہ کہوں کہ پھول جھڑتے تھے تو مبالغہ نہ ہوگا، بے اختیار منہ چوم لینے کو جی چاہے، گلا ایسا صاف کہ گھنٹوں بے تکان بولنے کے باوجود کیا مجال جو اکھر جائے، کبھی نرم ایسے کہ شبنم، بعض وقت پرجوش تقریر میں اذان دینے کا گمان ہوتا، قابو سے نکل نکل جاتے اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان بن جاتے، شیرینی میں تلخی شاعرانہ زیر و بم سے بھرپور، رسیلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں سے مشابہ، باتوں باتوں میں اس طرح سیکڑتے گویا الفاظ پر مٹھاس چڑھائی جا رہی ہے، خفیف لکنت اور رس گھول رہی تھی، دانت سرائیکی محاورے کے مطابق "موتی کے دانے" بدن مائل بہ فربہی، ہلکی سی توند نکلی ہوئی سر پر ریشمی رومال لپٹا ہوا، بر میں نفیس ململ کا کرتہ لٹھے کا تہبند (ایک مدت تک والدہ کے کاتے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتے رہے) چھیلا بنے دلوں کو گرما اور برما رہے تھے رجھا رہے تھے، مرجع زریں بنے ہجوم عاشقاں میں گھرے

قاضی احسان احمد شجاع آبادی



۱۳۲۴ھ ـــــــــ ۱۳۸۶ھ

ہوئے، بلبل کی طرح چہک رہے تھے، ہو بہو اپنے مرشد روحانی سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تصویر، اس کو چھپالو اس کو نکالو، یہی تو تھے قاضی احسان احمد شجاع آبادی،

میں انہیں عام ملاّ سمجھا تھا جو خدا کی ربوبیت اور رحمانیت کا کم اور قہرمانیت کا ذکر بڑے اہتمام اور شد ومد سے کرتے ہیں، نماز روزہ مظہر ہوتا ہے ڈر اور خوف کا ورنہ جو خشیت چاہیئے وہ ایسی تعلیم کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے، دماغ نے دل سے کہا "مولوی ہے، زندہ دل" وہ روائتی خشکی اور درشتی جو "مولوی" کا طرۂ امتیاز رہے اس کا بہت کم حصہ اس کے حصے میں آیا ہے. مسلسل تین چار گھنٹے کی تقریری گفتگو (واعظانہ نہیں) نظریات اور افکار کی خوشگوار تشریح اور پرچار، دل کے تاروں کو چھیڑ ہی گیا، اور جی یہ چاہنے لگا کیوں نہ اس یونانی دیوتا نما مولوی کی تصویر اتار لی جائے۔

کیا آپ تصویر اتروانے کے قائل ہیں ؟

قائل! میں تو پجاری ہوں۔

نظر بظاہر اس "ملاّ" سے اس شگفتگی کی توقع نہیں تھی، پھڑک کر ہی تو رہ گیا. اب کیا تھا میں ان کے نشانے کی زد میں تھا اور میری خامشی کے بند کو اپنی بے پناہ روانیٔ تقریر سے توڑتے چلے گئے، لطیفے چٹکلے پھبتیاں ہر پہلو سے مجھ پر وار ہوئے اور میں نیم بسمل ہو کر لطف اندوز ہوتا رہا، اک بے خودی کی سی حالت مجھے قریب سے قریب ترلے گئی، معلوم شد کہ اب بچ کر نکلنا محال ہے، میں نے سپر ڈال دی اور زبان تکلم درازی کی، بڑی حیرت ہوئی میرے ہر اوچھے وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا گیا. بدلہ سنجی سے میرے حوصلے بڑھائے گئے اور میں اس قدر بیباک ہوا کہ سوالات کی ناموزونیت کے ساتھ ساتھ لہجے کی کرختگی بھی جھلک دکھاجاتی، وہ اس پر بھی تیوری پڑھائے بغیر اپنے دلائل وشواہد سے نہ صرف مجھے بلکہ تمام حاضرین کو بہالے گئے وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، سینکڑوں کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ بڑے بڑے دقیق مذہبی مسائل باتوں باتوں میں حل کر دیتے۔

میں نے اس "واعظ" کا یہ نرالا رنگ بھی دیکھا کہ خود نماز پڑھتا ہم دیکھا کرتے وہ

تماشا ہم تماشائی، کیا مجال کبھی یہ کہا ہو تم نماز کیوں نہیں پڑھتے یا آؤ نماز پڑھ لیں، نماز کا وقت ہوا لوٹا سنبھال وضو کیا اور کھڑے ہو گئے، یا جماعت کو ترجیح دیتے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے فرائض کی تکمیل سے پیچھے رہ جاتا تھا، جی نہیں، وہ بجائے نماز پڑھنے کی تاکید کے فضائل نماز اس خوبصورتی سے بیان کرتا کہ بے اختیار نماز پڑھنے کو جی چاہے، ایک لمحے کیلئے بھی اس کی آنکھوں میں نہ خون اترتا نہ آنکھیں ابلی پڑتیں جیسا کہ عام ''واعظین'' کا معمول اور دستور ہے، کف بھی جاری نہ ہوتا بلکہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی مزے مزے سے وہ شعور کی دبیز تہوں کو کھولتا جاتا اور بے اختیار آدمی کھنچا چلا جاتا میرے سامنے صرف ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے میرے ایک دوست چھوٹو صاحب احمد پور لمہ کو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھ کر براہ راست محبت آمیز لہجے میں ٹوکا، جس کا اثر میں سمجھتا تھا سامع کے دل پر اثر نہیں ہوگا، مگر ہوا اور اس نے پھر کبھی انگوٹھی نہیں پہنی

ہاں خوب یاد آیا میری ان سے یہ دوسری ''ملاقات'' تھی، ولہار سے صادق آباد کا ریل کا سفر آدھے گھنٹے کا ہے، اتفاق سے جس ''انٹر کلاس'' میں ہم سوار ہوئے اسی میں یہ حضرت بھی براجمان تھے، میرے ساتھی ارادتمندانہ ملے، میرے ہاتھ میں مکاتیب شبلی تھے لے کر دیکھنے لگے، پندرہ منٹ بعد گاڑی ماچھی گوٹھ پر رکی، یہی وہ مقام ہے جہاں جماعت اسلامی کا مخصوص تاریخی اجتماع ہوا تھا اور مولانا مودودی شام کو دو چار میل کھیت کھلیان میں ''چرنے چگنے'' اور ٹہلنے نکل جایا کرتے تھے، یہاں قاضی صاحب کے ایک دولتمند عقیدت کیش نے زبردستی گاڑی سے اتار لیا، شکر ہے میری کتاب مجھے واپس مل گئی۔ ورنہ مرحوم کی عادت تو یہ تھی کتاب ہو یا رسالہ کہیں سے بھی ہاتھ لگے چھوڑتے نہیں تھے، کتب خانہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل رہا ہوگا۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ہماری تین چار ہزار کتابیں دیکھ کر فرمایا: تو اس سلسلے میں میں زیادہ خوش بخت ہوں۔ اتنی کتابیں ادھر ادھر سے تو جمع ہونے سے رہیں، خریدتے ضرور ہوں گے، جیسا کہ ایک بار بتایا ''مسٹریس آف لندن'' قیمتاً طلب کر چکا ہوں، وہی کہتے تھے اس میں ملکہ وکٹوریہ کے حالات معاشقہ ہیں، اور قاضی صاحب کو ان کی کرید تھی اس لئے کہ مرزا صاحب تو اس کی شان میں قصیدے لکھ رہے تھے

اور اس کی اخلاقی پستی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، مجھ سے عبدالمجید سالک کا خط مانگ کر لے گئے شورش کاشمیری اور دوسروں کو دکھاتے پھرتے اور کہتے تم تو سالک کے تردیدی مراسلات شائع کر رہے ہو، وہ پس پردہ تحقیق مزید میں لگا ہوا ہے، بارہا تقاضے کئے، پی گئے خواجہ عبدالوحید خوش بخت نکلے، علامہ اقبال کے دستخطی بیانات وغیرہ قاضی صاحب تین برس تو دبائے بیٹھے رہے پھر لوٹا دیئے، مذکورہ خط میں نے ازراہِ "خلوص" کراچی سے ملتان کیلئے سفر کر رہے تھے تو سوتے میں سے جگا کر پیش کیا تھا، یہ سفر وہ درجہ دوئم میں کر رہے تھے ہوا یہ تھا کہ سالک مرحوم نے مکتبہ چٹان کے زیر اہتمام چھپنے والی کتاب "یاران کہن" میں کہیں لکھ دیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے جنازے کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور سے بٹالے تک گئے تھے، اب کیا تھا اہل سنت والجماعت کا "نقیب" سہ روزہ "دعوت" جو بعد میں ماہنامہ ہو گیا تھا، لے لے اڑا اور زہر اگلنے لگا، مولانا آزاد کو لکھا گیا، ان کے سیکرٹری کا تردیدی بیان "چٹان" میں شائع ہوا، معذرت نامہ احتراماً سالک نے بھی چھپوا دیا، میں نے براہِ راست پوچھا تو فرمایا، مجھے جو کچھ یاد تھا لکھ دیا، لاہور تک آنے کی شہادت تو ایک کتاب کے حوالے سے بھی دے دی، وہ اس تگ و دو میں بھی تھے کہ کسی ماخذ سے آزاد کا بٹالہ جانا بھی ثابت ہو جائے، مولانا آزاد سے ملاقات میں بھی اس کا ذکر آیا جو بقول سالک ہنسی میں اڑ گیا۔ یہ تمام مراسلت مرحومین کے خطوط کا مجموعہ "نوازش نامے" میں میں نے چھپوا دی تھی۔

میں ۱۹۶۱ء میں بخار کی شدت سے بستر گیر ہوا، میرے جسم کو ایکسرے کی آنکھ سے میری حد سے بڑھی ہوئی ناتوانی کے پیش نظر ٹٹولا گیا، جہاں دل و جگر داغ دار تھے وہاں پھیپھڑے بھی مفلوج پائے گئے، ناچار چھ مہینے شکن بستر بننا پڑا، قاضی صاحب کی محبت اور خورد نوازی ملاحظہ فرمایئے، مزاج پرسی کیلئے جون کی گرمی میں زحمت سفر اٹھائی، میں خس کی ٹٹیوں کی اوٹ میں لیٹا ہوا تھا، دہلیز ہی سے پکار اٹھے مکار الملت یہ کیا چھل ہے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا، احباب جمع ہو گئے، گفتگو کا ایک نہ رکنے والا دھارا بہہ نکلا۔ زن و شو کے ازدواجی مسائل پر بول رہے تھے، استاذی مولوی قادر بخش نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا بپھر ہی تو گئے، دلائل و شواہد سے حقوق نسواں کی اہمیت جتلاتے رہے۔ تیور دیکھ کر مجھے یہ

گمان ہوا کہیں دل پر غبار نہ آگیا ہو۔ مگر یہ صرف میرا وہم تھا دوپہر کے کھانے پر پھر وہی بذلہ سنجی اور استاذی سے آموں کی چھین جھپٹ اسی ملاقات میں فرمایا، سالک کو مرحوم نہیں آنجہانی لکھا کرو، میں نے کہا سالک واضح طور پر اپنے سنی العقیدہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں، بدگمانی کی کیا ضرورت۔ بنس آئی، نہ مانے اور اپنی رلئے پر اڑے رہے ایسا ہی معاملہ مشہور شاعر رئیس امروہوی سے تھا، ملکہ برطانیہ کی آمد پر رئیس نے ایک طنزیہ نظم لکھی، ہجو ملیح کا بہترین نمونہ، بر سر مجلس پڑھ کر سنائی اور لگے غداری اور ملک دشمنی کے الزامات لگانے، حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے، احراری لیڈروں پر بھی ارباب حکومت نے وقتاً فوقتاً الزام ملک دشمنی ہی کا لگایا ہے۔ اور ایک مدت تک معتوب رہے، نظم گو ذرا طویل ہے مگر اس کا یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مثنوی آمد نامہ

بتقریب نزول اجلال کوئین الیزبتھ ثانی خلد اللہ ملکہا وسلطنت ہا

اے کشور پاک و پاک کشور
تابندہ و تابناک کشور

اللہ رے آب و تاب تیری — تقدیر ہے لاجواب تیری
از راہ فیوض بادشاہی — بخشندۂ شان کجکلاہی
سلطانہ و شہریار انگلینڈ — مخدوم و تاجدار انگلینڈ
اس خاک پر جلوہ گر ہوئی ہے — جلوہ وہ بحر و بر ہوئی ہے
شہزادی بحر و بر ہے آخر — سلطانۂ خشک و تر ہے آخر
وہ دائرہ، عزم کا عمل کا — وہ دولتِ مشترک کی ملکہ
وہ نیّر اوجِ خود پسندی — وہ اختر برج فتحمندی
معبودۂ جبر گر رعایا — وہ خلق پہ کبریا کا سایہ
مسجودۂ بندگان دولت — مخدومۂ خادمان صولت

منصور و مسکرم و مظفر — وکٹوریہ جاہ الزبتھ فر
قانون کو ورد جس کا ہر ورڈ — وہ وارثِ اقتدار اڈورڈ :
وہ شمع محافل و مجالس — وہ چشم و چراغ جارج خامس
خاتونِ حریم حکمرانی — وہ جارج دی سکستھ کی نشانی
سب دنگ ہیں جلوہ و ضیا سے — انجم کی نمود نقش پا سے
کس شان سے وہ رواں دواں ہے — راہوں پہ گمانِ کہکشاں ہے
ذروں کی روش بدل رہی ہے — افلاک کی چال چل رہی ہے
اربابِ نظر ادب سے جھانکیں — رستوں پہ بچھی ہوئی ہیں آنکھیں
اللہ رے وہ جلوس شاہی — امواجِ نسیم صبحگاہی :
چلتی ہے ہوائے فتح و اقبال — جنبش میں ہے کاروانِ اجلال
ہر بندۂ بندگان عالی — ہر ایک عوالی و موالی
باہر نہ ہو جادۂ طلب سے — حاضر ہو قرینہ و ادب سے

اے کشور پاک و پاک کشور
تابندہ و تابناک کشور
ملکہ کا یہ مرکب ہمایوں
اس خاک پہ بس رہی ہے مفتوں

پیاسوں کی زمیں پہ چشمۂ مُل — کانٹوں کے وطن میں خندۂ گل
دنیائے عزا میں جلوۂ عید — ذرات کی انجمن میں خورشید
پستی میں عروج سوز میں ساز — گنجشک کے گھونسلے میں شہباز
آنکھیں ہیں تجلیوں سے خیرہ — جھلسے ہوئے پتھروں میں ہیرا
یہ شان ہے اور کیوں نہ ہوتی — دریا میں گہر، صدف میں موتی
جلووں کی یہ شان چشم بد دور — فانوس میں لَو چراغ میں نور
سوکھے ہوئے بادلوں میں پانی — الفاظ کے دیس میں معانی

گونگے کی پکار میں لطافت ——— بہرے کے دیار میں سماعت
گنجا کسی تاج زر کا گاہک ——— اندھے کی دوکان اور عینک
لنگڑے سے امیدِ رقصِ آہو ——— لنجے کو غرورِ دست و بازو
بے رنگ فضا میں ماہ و مہتاب ——— بے آب ندی میں موجۂ آب
بے نور شعاع میں حرارت ——— بے نرخ متاع کی تجارت
پت جھڑ کا سماں بسنت کا روپ ——— پرچھائیں کی حاشیہ نشیں دھوپ
اندھیر نگر میں دانش و داد ——— عفریت کی گود میں پری زاد

اے کشورِ پاک و پاک کشور
تابندہ و تابناک کشور
سلطانہ و شہریار انگلینڈ
مخدومہ و تاجدار انگلینڈ
اس خاک پر جلوہ گر ہوئی ہے
گذری شبِ غم سحر ہوئی ہے

(مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی ۲ فروری ۱۹۶۱ء)

مجھ سے تقاضا ہوا کہ تم ایک مراسلہ اس نظم کے خلاف "جنگ" میں بھیجو۔ میں نے کہا کیوں نہ رئیسؔ سے پوچھ لیا جائے۔ جواب دوسری ڈاک سے آیا۔

یہ نظم تو سراسر طنز ہے اور طنز بھی ایسا بے پناہ کہ جب ۱۱ فروری کو یہ جنگ میں شائع ہوئی تو برٹش کونسل کے انگریز تک شکایت کرنے لگے کہ صاحب یہ تو بڑے تابڑ توڑ وار کئے گئے ہیں، ملکہ کو خلق پر کبریا کا سایہ (یعنی ظل اللہ) کہنا کیا مذاق اڑانا نہیں ہے۔

مسجودۂ بندگانِ دولت
مخدومہ خادمانِ صولت

مسجودہ اور مخدومہ کے خطابات استعمال کرنا کیا ہے! محض تضحیک

جس طرح حضرت علامہ اور ذات شریف وغیرہ کے الفاظ مزاحاً و طنزاً استعمال کرتے ہیں۔ آپ بڑے حضرت ہیں۔ یہ تو علامۂ دوراں ہیں، ان ذات شریف سے ملیے۔ اس طرح اس نظم کے پورے الفاظ تراکیب استعارات و تشبیہات حضرت علامہ اور ذات شریف کے معنی میں استعمال کی گئی ہیں۔ اگر اس نظم کو مدح کہا جائے تو پھر ہجو ملیح کسے کہتے ہیں، طنز کس قسم ادب کا نام ہے؟ یہ نظم (غالباً جنگ، کے ایڈیشن ۱۱۔ فروری میں ملکہ کا روز ورود غالباً وہی تھا) شائع ہوئی ہے اور ۱۰۔ فروری کے جنگ میں یہ قطعہ چھپ چکا تھا کہ

کشور پاک میں سلطانہ برٹش کا نزول
اور وہ شاہانہ سفر عالم سیاحی میں
کیوں نہ ہم لوگ پڑھیں ڈٹ کے قصیدے انکے
پانچویں پشت ہے انگریز کی مداحی کی

اس سے ایک روز قبل ۸ فروری کو یہ قطعہ شائع ہوا تھا کہ

آمد الزبتھ جلوس بہار — اے بزرگان شہر و اہل دیار
آرہی ہے سواری سرکار — باادب باملاحظہ ہوشیار

کیا یہ سب طنز نہیں ہے؟ پھر عفریت کی گود میں پری زاد، ان اشاروں کو سمجھیے کون عفریت ہے، کون پری زاد ہے؟ وغیرہ وغیرہ، مجھے اس نظم کی اشاعت کے بعد یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہجو ملیح کے جرم میں (جو لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے) کہیں کوئی بلائے ناگہانی نازل نہ ہو جائے (جس سے مجھے ڈرایا گیا تھا)۔ بہرحال اس نظم کی اپنی نیت کردار ساخت اور مقاصد اتنے واضح ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، مہربانی کر کے اس نظم کو پھر پڑھیے اور خالی الذہن ہو کر سوچیے کہ اس نظم میں کسی کی تعریف کی گئی ہے یا تنقیص؟ جس نے کبھی اپنے بزرگان دولت کی تعریف بھی نہیں کی (اور اگر کبھی کی ہو گی تو بطور ہجو ملیح) وہ مخدوم زادی افرنگ کی کیا مدح کرے گا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے رئیسؔ ملکہ کے اعزاز میں دی گئی کسی دعوت یا استقبالئے میں شریک نہیں ہوئے یہ محض ان کے جذبۂ ملی اور شاعرانہ تخیل نے رنگ باندھا اور خاکہ اڑا کر رکھ دیا، مہمان خواہ کسی درجہ کا ہو نعرہ تحسین و خوش آمدید تو بلند کرنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ اس میں اعتدال لازم ہے، مبالغہ آمیز اور حد سے بڑھی ہوئی تعریف و توصیف ظاہر ہے نمائندگی تضحیک ہی کی کرتی ہے اور اسے ہجو ملیح بھی کہتے ہیں، حیرت مجھے اپنی کوتاہ فہمی پر نہیں قاضی صاحب کی سخن فہمی پر ہوئی، نہ جانے کس عالم میں مرحوم نے یہ نظم پڑھی، دیکھا جائے تو تاج برطانیہ کا سلوک مشرق خصوصاً مسلمانوں سے کبھی منصفانہ نہیں رہا، چاہیئے تو یہ تھا کہ اس مہمان ناخواندہ کی آمد پر معترض ہوتے، ارباب اختیار کو قاضی صاحب آڑے ہاتھوں لیتے، جنہوں نے افرنگ زادی کے " ذوق نظر " کی خاطر گرگٹ کی طرح خود پر تو قادر نہ ہو سکے البتہ جہاں جہاں سے ملکہ کو گذرنا تھا بے جان عمارتوں اور کھمبوں کے رنگ ضرور بدل دیئے اور اس پر مدتوں نازاں رہے۔ میں نے اس خط کی نقل بھجوا دی تھی، رئیس بیداد کا نہیں داد کا مستحق تھا۔ مگر وہاں کون سنتا ہے فرماتے ہیں۔

"رئیس امروہوی رافضی ہے تقیہ اس کا مذہب ہے۔

ہم سے کچھ غیروں سے کچھ درباں سے کچھ

نظم قصیدہ ہے یا ہجو ملیح آپ اسے اتنا لکھیں کہ " جنگ " کے تمام قارئین اصناف سخن سے واقف نہیں میرے ایسے "جاہلوں" کو بہت صدمہ ہوا ہے وہ " جنگ " میں اتنا شائع کر دے کہ مذکورہ نظم کو شاعری کی اس قسم سے سمجھا جائے، حقیقت واضح ہو جائے گی۔

نجانے یہ ضد یہ ہٹ ان میں کیوں سما گئی تھی،

قاضی صاحب رئیس الاحرار امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند معنوی و روحانی تھے، چہرے مہرے سے ہو بہو شاہ جی کی تصویر، فکر و نظر، افکار و نظریات صورت شکل میں اس درجہ مماثلت بہت کم پائی جاتی ہے، امیر شریعت کا ذکر آ گیا ہے تو میں اتنا اور کہتا چلوں کہ بچپن میں انکے اقتدار میں عصر و مغرب کی سعادت حاصل ہو چکی ہے

بغرض علاج جسمانی اپنے ماموں سید نیاز محمد شاہ جیلانی (گھوٹکی سندھ) کے ساتھ نشتر ہسپتال میں داخل تھا، ماموں نے علاج روحانی بھی ضروری سمجھا ہوگا، جبھی شاہ جی کے یہاں پہنچے، مسجد سے اٹھ کر جب دولت کدے کے دروازے پر آئے تو ماموں نے دو روپے نذر کئے جو تھوڑی سی ردوکد کے بعد قبول کر لئے گئے۔ کچھ ظریفانہ گفتگو بھی رہی جس کا نقش میرے ذہن میں تازہ نہ رہ سکا۔

انگریز کے بعد اگر کسی کے خلاف محاذ قائم رہا تو وہ مرزا غلام احمد کی جماعت تھی، جسے احمدیت قادیانیت اور مرزائیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور احراری اسے خارج از اسلام تصور کرتے ہیں، بعض حلقے ایسے بھی ہیں جو اس جماعت کو سمجھتے تو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہیں، مگر گمراہ ترین فرقہ، مرزائیت قاضی صاحب کا "محبوب و مرغوب" موضوع تھی، گھنٹوں ردِ مرزائیت پر بولتے، اک ذرا چھیڑنے کی ضرورت تھی۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عام گفتگو میں بھی تقریر کا مزہ ہوتا تھا، میرے خیال میں مرزائیت پر جتنا مواد ان کے پاس تھا، قادیانیوں کے پاس بھی نہ رہا ہوگا۔ چھوٹے سے چھوٹا کتابچہ اور اشتہار اور بڑی سے بڑی کتاب اور اس کے سینکڑوں حوالے از بر، ایک بار میں نے ان سے کہا، مرزائیت پر جتنی تحقیق آپ نے کی ہے کسی اور نے شائد نہ کی ہو اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ فرقہ گمراہ اور مرتد ہے تو اس کی تردید میں ٹھوس کام کیجئے، تقریریں لوگ سنتے ذوق شوق سے ہیں ، وقتی جوش بھی پیدا ہوتا ہے، ایمانوں میں تازگی کی لہر بھی دوڑ جاتی ہے، ہو حق ہوا، نعرے بلند ہوتے اور فضا میں تحلیل ہو گئے۔ رہنمائی کیلئے جہاں تقریریں ضروری ہیں، وہاں مدلل اور مستقل تحریری مواد کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور میں اسے آپ کی تقریروں پر بھاری سمجھوں گا، اگر آپ ایک کتاب مرتب کر دیں، فرماتے: تم آؤ تو میں مرتب کرا سکتا ہوں، تو د لکھنا میرے بس کی بات نہیں، میں نے کہا اگر میں یہ کہنے کی گستاخی کروں کہ آپ باتیں بنانا جانتے ہیں، سطحی باتوں کو ٹھوس اور پائیدار تحریر پر مقدم رکھ کر کچھ انصاف تو نہیں کیا جا رہا، اس پر الٹا

مجھے آڑے ہاتھوں لیتے اور رمضان میں شجاع آباد چلے آنے کی دعوت دیتے عموماً تبلیغی دورد٘ں پر رہتے تھے، آج یہاں کل وہاں، رمضان گھر میں مناتے، مولانا عبدالماجد دریابادی کی مزائیت نوازی کو دیکھ کر چاہتے تھے کہ ان کو ٹوکیں، میں نے تو کہا تو پھر دیر کیا ہے۔ بسم اللہ، آپ بولئے میں لکھتا ہوں، میرا اصرار بڑھا تو بولے عبدالماجد کو لکھنا ہے ذرا سوچ سمجھ کر لکھنا ہوگا۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، شاہ جی اور قاضی صاحب تقریر کے دھنی اور قلم کے چور تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "میں غازی گفتار تو تھا قلم کا دھنی کبھی بھی نہیں" تاہم "فتوحات بخاری کا ایک ورق" میں ان کی نثر نگاری بے جان نظر نہیں آتی، یہ ایک مختصر مضمون ہے خاصا جاندار، خطوں میں بے اختیار ان کے قلم سے ایسے جملے ٹپک پڑتے تھے جنہیں شعری نثر پارے کہنا چاہیئے میں یہاں ایک خط سے اقتباس پیش کرتا ہوں، لکھتے ہیں۔

"کوئٹہ پسنجر چلتی گاڑی پر سوار ہونے لگا، دستہ چھوٹ گیا نیچے گرا زخمی ہوا، دل و جگر کے زخم ہی کیا کم تھے کہ جسم بھی مجروح طرفہ یہ کہ پیٹھ پر پھنسیوں کی یلغار ہوئی، خیر اب سوائے جراحتِ دل کے اور کوئی زخم بظاہر نہیں"

خطوں کے علاوہ ایک نثری شاہکار میری بیاض میں دستِ خاص سے محفوظ ہے جسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ

کیا رب الناس کی ربوبیت کافۃ اللناس کی نبوت ہدی اللناس کی ہدایت، بیت اللہ کی مرکزیت کے ساتھ کنتم خیر امۃ کے اعزاز کے بعد بھی کسی آٹوگراف کی ضرورت باقی ہے اگر مقصد طلب ہدایت ہے تو اس کی تکمیل ہو چکی۔ اتمام نعمت کے بعد کسی فکرِ خام سے طلب راہنمائی کفرانِ نعمت ہے، منعم حقیقی نے ہادی وہ عطا فرمایا ہے جو بہر حال بہر پہلو "محمدؐ" ہیں۔ یہ نام ہی تمام سوالات کا اکمل ترین جواب ہے۔ اس نام

کا نام لیوا کونین کے کسی گوشے میں بھی زندگی کے کسی شعبے میں بھی کسی قسم کی رہبری کا محتاج نہیں، خیر جہاں بھی ہے وہ میراث مومن ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسی ہادی برحق کی اطاعت میں زندگی گزارنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور دنیا و آخرت میں اسی آقا کی غلامی اور ان کے غلاموں کی محبت سے نوازے ۔ آمین

دعاگو۔ احسان احمد عفی عنہ شجاع آبادی ۴ شعبان اعظم ۱۳۸۵ھ

سابق صدر ایوب خاں نے ایک "مشائخ کانفرنس بلائی" تھی اس پر تبصرہ قاضی صاحب نے کچھ اس انداز میں کیا جس سے شرکت کی آرزو کی بُو آئی تھی، ایک خط میں اس کا ذکر بھی آگیا، بگڑے ہوئے تیور دیکھئے، محبت میں یہی ہوتا ہے۔

"مجھے سرکاری اجیر سمجھ لینے کے بعد اور مشائخ کانفرنس کی شرکت کی طلب میں بیقرار محسوس کر لینے کے بعد اب یہی ہے کہ جناب اپنا قیمتی وقت اور پیسے ضائع نہ فرمائیں۔ جب ایک بے ضمیر یا ضمیر فروش کی حقیقت واضح ہو جائے تو پھر کیوں نہ ہمیشہ کے لئے ایسے پر عمر بھر کیلئے تین حرف بھیج دیئے جائیں"۔

اخباری اطلاع یہ تھی کہ قاضی صاحب نے مولانا مودودی کو جلسہ عام میں بُرا بھلا کہا، میں نے لکھا اگر آپ لوگ اسی طرح الجھتے رہے تو عوام کا خدا حافظ ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا تھا کہ تحریک ختم نبوت میں مولانا مودودی کیلئے بھی دار و رسن کی آزمائش تجویز کر دی گئی تھی" اور وہ ثابت قدم رہے، علماء کی سیاسیات سے علیحدگی کا نتیجہ ایوب خاں کی بدترین آمریت ہے میرا انداز نگارش طنزیہ تھا، میرے جواب میں لکھتے ہیں۔

جناب نے بغیر تحقیق کئے مجھے ملزم ہی نہیں مجرم گردانتے ہوئے سزائیں بھی تجویز فرمادیں۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

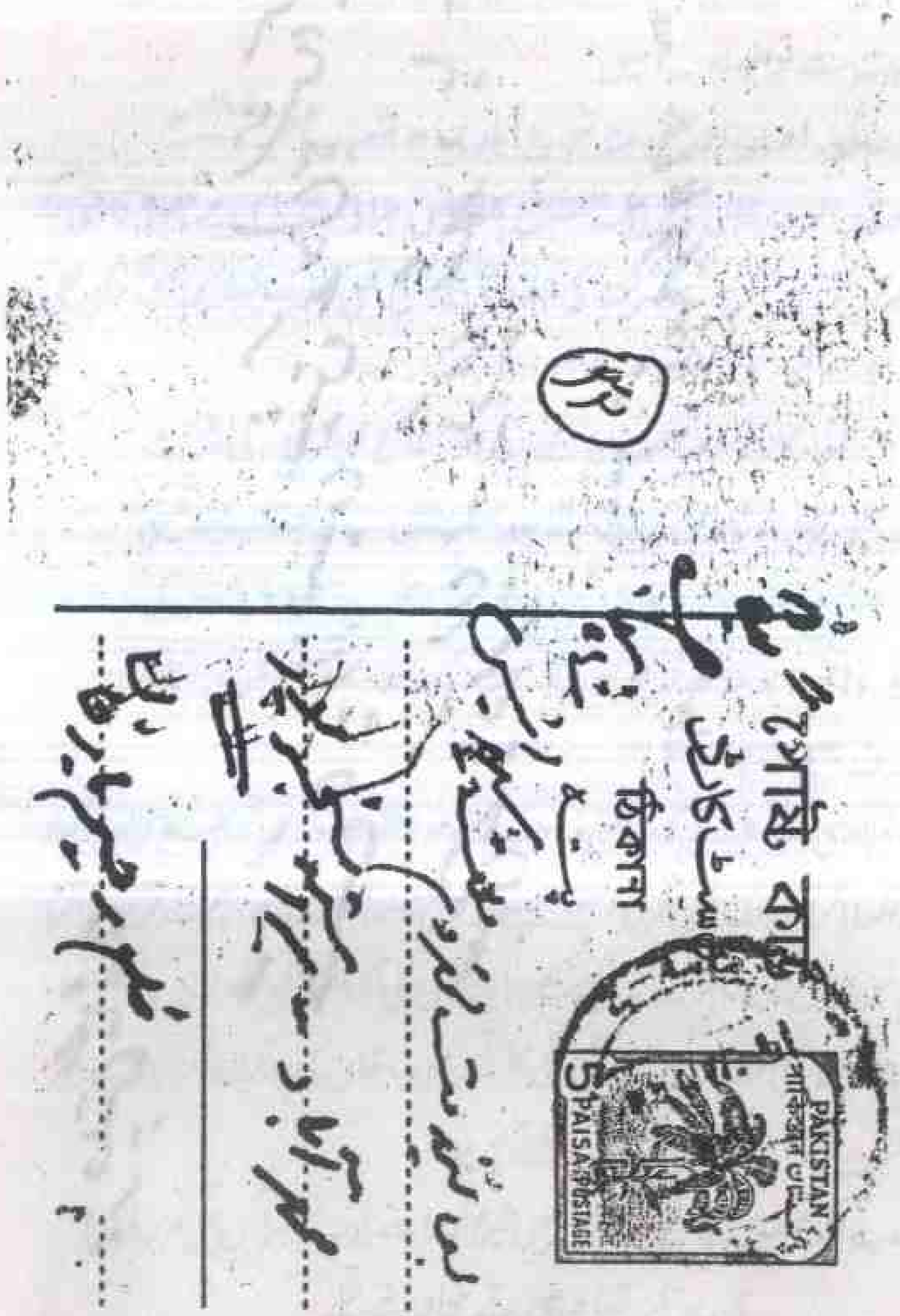
شبلی کے پھول والا معاملہ ہوا خطوط اور بھی آئے مگر سب سے زیادہ اذیت جناب کے عتاب نامے سے ہوئی، میں واقعہ عرض کر دوں، مولانا

از جلیسِ تازہ

حسن کا یہ نواز فیضِ عشق کے دل پہ نقش ہیں
معمول سے یاد کر لیا — یاد کیا بھلا دیا —

— ایک معمولہ ۱۹۸۱ ---

احمد


PAKISTAN
5 PAISA POSTAGE

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے میرے اچھے مراسم تھے، تحریک تحفظ ختم نبوت میں انہوں نے نہ صرف اچھے کردار کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ایک ادنیٰ کارکن سے بھی ایسی روش کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، خیر مضے امضے بحمد اللہ تعالیٰ انہیں ایک عمدہ انشاپرداز تسلیم کرتا ہوں، نہ اسیر عقیدت ہوں نہ مجرم عداوت میرے لئے کبھی بھی وہ ''وداے دل'' بیچنے والے نہیں تھے''

ان کے یہاں اظہار محبت لفظ لفظ سے ہوتا تھا۔ لفافے پر پتہ لکھتے تو نام سے پہلے طرح طرح کے خطاب والقاب لکھ کر اپنی بزرگانہ شفقت کا اظہار فرماتے مثلاً۔

* انیس بیکساں
* راحتِ قلب ونظر
* انیس ملت
* مخدوم ملت
* برادر بجان برابر
* انیس قلب حزیں
* پیارے پیر جی
* راحت رساں
* انیس احساں وغیرہ

خوش نویس نہیں تو بدخط بھی نہیں تھے، خاصا منشیانہ خط تھا، کارڈ لفافوں کا استعمال یکساں کرتے۔

آج کل معاشرے میں جو برائیاں جگہ پاگئی ہیں ان کی نشاندہی بڑے کرب اور خندہ'' زہر آلود سے کرتے، کراچی میں کہیں سرراہ کپڑا خرید رہے تھے، ایک شناسا نے دیکھتے ہی کہا، ارے آپ یہاں کپڑا خریدتے پھر رہے ہیں، فرمایا، افسوس میری بیوی کا کوئی ''بوائے فرینڈ'' نہیں ہے جو اسے ضروریات زندگی لاکر دیتا رہے۔ انگریزی زدہ لوگوں کو گھیر لیتے اور

طرح طرح سے یورپ کا ملمع اتارنے کی کوشش کرتے کراچی سے سیکنڈ کلاس میں ایک اپ ٹو ڈیٹ نوجوان بھی ہم سفر تھا باتوں باتوں میں گویا ہوا۔

مولوی صاحب پردے کے بارے میں کیا خیال ہے
آپ کا، کیا یہ خواتین پر عدم اعتماد کی دلیل نہیں

قاضی صاحب نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا ضروریاتِ سفر کی ٹوکری میں سے ایک سنہری رو پہلی لیمو نکال کر دیکھنے لگے اور نوجوان سے پوچھا کہیے اسے دیکھ کر طبیعت للچائی تو نہیں منہ میں پانی تو نہیں بھر آیا، اس نے جواب اثبات میں دیا، قاضی صاحب نے کہا۔

اسی لئے ہم بدنیتوں سے عورتوں کو بچاتے ہیں
عورت شمع محفل نہیں چراغِ خانہ ہی اچھی لگتی ہے

گاڑی میں بیٹھ چکے تھے مجھ سے رہا نہ گیا، عرض کیا، لوگوں کو صراط مستقیم پر لانے کیلئے آپ پورے برکوچک میں تقریریں کرتے رہے ہیں آپ اب پاکستان کا چپا چپا چھان مارا مگر چراغ تلے یہ کیسا اندھیرا ہے کہ "چکلہ" شجاع آباد میں بھی موجود ہے، کہنے لگے، اب رہنے دو منہ نہ کھلواؤ شجاع آباد ہی کیا پورا ملک ہی چکلہ بنا ہوا ہے، فرماتے تھے لباس عریانی ڈھانپنے کیلئے تھا اب لباس سے عریانی کا کام لیا جاتا ہے، یہاں ایک اور لطیفہ سنتے چلئے، پرویز صاحب (طلوع اسلام والے اور علماء کی نظر میں حالیہ مرتد) نے نماز کے لغوی معنی "چوتڑ ہلانا" قرار دیئے ہیں، قاضی صاحب نے برجستہ کہا "بال روم ڈانس" تو نماز باجماعت ہوا۔

میں نے عرض گزرانی، آپ نے تو دنیا دیکھی ہے برصغیر پاک و ہند کی تقریباً سبھی مشہور شخصیتوں سے ذاتی تعارف رہا ہے تحریک آزادی میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے بلکہ آپ بجائے خود ایک تاریخ ہیں اپنے تاثرات قلم بند کر دیں تو کیا کہنے، کہنے لگے رمضان بھر گھر پہ رہتا ہوں آجاؤ تو بہت سی باتیں لکھوا دوں، میں نے کہا آنے کو تو آجاؤں مگر پانچ وقت کی نماز اور روزہ میرے بس کی بات نہیں، مسکرا کر فرمایا، ہمارے یہاں دوپہر کو بچوں کیلئے کھانا پکا کرتا ہے، ایک معصوم کا اضافہ اور سہی، میں نے لکھا۔

مجھ کو پہونچا ہی چکو اپنے پاس
آج، کل، شام یا سحر پہونچا

کس محبت سے لکھتے ہیں: میری تمناؤں کے گلشن میں بہار آگئی خدا کرے یہ حسین وعدہ حسین فریب ثابت نہ ہو، آیئے اور بصد ناز آیئے: مرحوم کی تمنا یہ بھی تھی کہ سوانح عمری بھی مرتب ہو جاتے، جب میں نے حامی بھرلی تو ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے انیس میری سوانح عمری مرتب کرے گا، میری بے توفیقی ملاحظہ فرمائیے ارادے باندھ باندھ کر توڑتا رہا، وہ خط لکھ کر اکساتے مگر میں اپنی فطری کاہلی کا اسیر قدم باہر نہ نکال سکا اور تحریک آزادی، شخصی زندگی ہمعصر مشاہیر کی تصویروں کے کئی رخ پس پردہ رہ گئے

خبر آئی قاضی صاحب پر نصیب دشمناں متواتر دل کے دورے پڑ رہے ہیں اور وہ تقریباً نیم جاں ہو چکے ہیں، میں نے اور میرے چچازاد بھائی نے مزاج پرسی کیلئے ارادہ سفر باندھا، آمادہ سفر ہوئے. شدید گرمی پڑ رہی تھی، دوپہر کو ہم پہنچے، جمعے کا وقت قریب تھا اس لئے ہمیں کھانا تو مل گیا، درشن کیلئے شریک نماز ہونا ضروری تھا خطاب فرما رہے تھے موضوع تھا: عید میلاد النبی پر لاہور میں جلسے اور جلوس باندازِ تعزیہ لاؤڈ اسپیکر دورِ ایوبی کی برکت سے ممنوع تھا، بے چارے پوری قوت سے بول رہے تھے ہم نے "ٹیپ ریکارڈر" سامنے رکھ دیا، افسوس ہے کہ یہ یادگار تقریر کثرت استعمال اور بے احتیاطی کی وجہ سے کہیں کہیں سے مٹ چکی ہے اور آخری حصہ تو بچہ بیچ کی کرامت سے بالکل ہی صاف ہو چکا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس دفعہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس میں ماڈل بنائے گئے پھر باقاعدہ لوگوں کو وہاں سجدے کرائے گئے، شیعوں کا اخبار رہے "اسد لاہور سے نکلتا ہے اس نے لکھا ہے کہ کیوں جناب، شیعہ اگر حسین کا تعزیہ نکالیں تو برے اور سنی اگر حضور کے روضہ کا ماڈل نکالیں تو واب ہماری محبت تماشا بن گئی ہے باقاعدہ ڈھول باقاعدہ تالیاں باقاعدہ باجے اور یہ حضور کی محبت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے، قبر مقام عبرت ہے مقام عبادت

نہیں، قبر مقام آرائش اور مقام عبادت نہیں، قبر مقام عبرت ہے، قبر رکھو، قبروں کی زیارت کو جایا کرو، کیوں؟ ایسا حسین ایسا جمیل ایسا وجیہہ ایسا شکیل ایسا عالم ایسا مفتی ایسا قاضی ایسا ولی ایسا بہادر یوں مٹی میں سویا ہوا ہے اور مجھے یہاں آنا ہے، قبر عبرت کی جگہ ہے عبادت کی جگہ نہیں، ہمیں ڈر یہ ہے کہ اب محبت کرتے کرتے کرتے کرتے کرتے کہیں محبت یہ رنگ نہ اختیار کرے کہ اب شیعوں نے تو سیدنا حسین کا تعزیہ بنایا تھا اب سنی خیر سے کہیں حضور کے روضہ کی نقل بنا کر اس کا جلوس نہ شروع کریں، لاہور میں شروع ہو گیا"۔

نماز ہو چکی تو مرحوم کو منبر پر قرون اولیٰ کے بزرگوں کی طرح بیٹھے ہوئے

- دیکھا، شورش نے سچ کہا ہے

تیرے ہم چہرہ تھے افراد قرون اولیٰ
میں انہیں تیرے خد و خال سے پہچان گیا

مستحقین میں ریزگاری تقسیم کر رہے تھے، اسی ریلے میں ہم بھی ان کے قریب تو پہنچ گئے لیکن تبرک حاصل کرنے کا ہوش نہ رہا، فرمایا تم لوگ اوپر چلو میں آتا ہوں، ہم تو لیٹتے ہی سو گئے، وہ آکر پلٹ گئے، عصر کی نماز پر گلے لگایا، محبت سے پیش آئے، بہت خوش تھے کہتے تھے ہمارا تمہارا رشتہ محبت اخلاص اور اسلام کا ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جو بہت کم میسر آتی ہے، بار بار کہتے تھے تم لوگوں کی آمد پر میں خوشی سے پھولا نہیں سمارہا، حاجتمندوں نے حلقہ باندھ لیا اور مرحوم حسب معمول اس کو اس کو چھیڑتے رہے، ان کے ایک پڑوسی کو مولی سے چڑھ تھی اور یہ بار بار مولی کے فوائد اور اہمیت جتلا رہے تھے، وہ لاحول پڑھتے جاتے، کافی ستا چکے تو تشریف آوری کا مدعا پوچھا، وہ کسی سرکاری افسر کے نام سفارشی خط لکھوانا چاہتے تھے، افسر مذکور کا نام سن کر فرمایا "میں اس کے نام ہرگز خط لکھ دینے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا، پچھلے دنوں میری موجودگی میں اپنے نوکر کو حرام زادہ کہہ کر گویا اسکی ماں پر تہمت لگائی اور میں ایسے لوگوں سے رسم ملاقات اٹھا دیا کرتا ہوں۔

عطاءاللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور سے لوگ کہا کرتے تھے آپ کچھ تحریری سرمایہ بھی یادگار چھوڑ جائیے، قلم سے اتنی دوری قلم اور کاغذ کی محرومی تصور کی جارہی ہے تو مرحوم بے ساختہ فرماتے، میں کیا لکھوں میری کتابیں تو قاضی اور شورش ہیں، شورش اور قاضی نے کارزار زندگی میں یکساں قدم بڑھائے ہیں، منزل دونوں کی ایک تھی، آزادی اور وہ پاکر رہے یہاں مسافروں نے کمریں کھول دیں، ستائے اور پھر خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے، حریف نہ پاکر آپس ہی میں دست و گریباں ہو گئے، قاضی صاحب شورش سے نہ جانے کیوں کبیدہ خاطر رہتے ہیں، رہتے ہیں نہیں رہتے تھے، اُن کے ظاہر و باطن میں یکسانی کو مشکوک گردانتے، حالانکہ شورش اپنے فکر و نظر کے اظہار میں نیاز فتحپوری سے کچھ کم بیباک نہیں ہے احرار ایک مدت تک نظریہ پاکستان کے مخالف رہے ہیں لیکن جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا تو شاہ جی نے بھی ہندوستان پر پاکستان کو ترجیح دی اور امرتسر سے اٹھ کر ملتان آ لیے اور یہ بڑے ظرف کی بات ہے کہ آدمی اپنی رائے جمہور امت کے حق میں بدل دے اس کے باوجود شورش جس شد و مد سے کٹر کانگریسی اور گاندھی بھگت لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد کا دفاع کرتے ہیں اس سے شورش کے مولانا مرحوم سے تعلق خاطر کا پتا ملتا ہے۔

مرحوم کھانے سے بھی پورا پورا انصاف کرتے تھے، مرغ پلاؤ بڑی رغبت سے کھاتے تھے، اچھی پکی ہوئی دال بھی مل جائے تو گھر میں مبارکباد کہلواتے، اچار کا ان سے بڑھ کر کوئی اور رسیا میں نے نہیں دیکھا، خدا لگتی کہتا ہوں پیالے بھر بھر کے بالکل سالن کی طرح کھاتے اور ڈکار تک نہ لیتے، ہاضم رہا ہوگا ورنہ ایسے کارنامے انجام دینا معمولی دل گردے کا کام نہیں، دسترخوان پر اچار نہ ہو تو باصرار طلب کرتے اور مزے لے لے کر کھاتے اور تو اور حکیم اجمل خاں کے یہاں بیٹر کا اچار کھا چکے تھے۔ حکیم صاحب کی حذاقت کے مداح تھے ایک مریض آیا نسخہ تجویز کردیا جانے لگا تو ہدایت فرمائی گئی کہ آئندہ جوا ہرگز نہ کھیلنا، حضرت مرض کا جوا سے کیا تعلق، حکیم صاحب بولے یہ مزدور جوا کھیلتے وقت پیسے منہ میں رکھ لیتے ہیں، زنگ اترتا رہتا ہے پھیپھڑے متاثر ہو ہی جاتے ہیں، قاضی صاحب ذیابیطس کے مریض ہو کر بھی آم بڑے شوق سے کھاتے، یہ پسند بھی تھی ان کی دسترخوان

پرکوشش یہی کرتے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے حصے میں آئیں، چھینا جھپٹی سے بھی نہ چوکتے
آموں کے باغ بھی اپنی زرعی زمینوں میں لگا رکھے تھے۔ کھانا کھاتے کھاتے اچھی سی بوٹی
نصف تو خود دانتوں سے الگ کر لیتے اور باقی نصف اِس کے اُس کے منہ میں دے دیتے
میں خلوص اور اپنائیت کی اس بے پناہ یلغار سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیشہ بچ کر بیٹھتا
یہی حال پانی کا تھا جھوٹا پیتے پلاتے اور یہ سب کچھ اسلام میں انسانی مساوات کی تعلیمات
کا مظہر تھا، شجاع آباد میں تین مہمانوں کو ایک ہی بڑے طشتری نما پیالے میں سالن دیا گیا
میں نے تو ایک بوٹی الگ سے روٹی پر نکال کے رکھ لی اور بھوکا اٹھ گیا، یہ ازراہ تبختر دکرامت
تو نہیں کہہ سکتا بہرحال مجھے گھن ضرور آتی ہے، یوں تو متعدد دوسری غلاظتوں کو گوارہ کر
لیتا ہوں، مگر کھانے پینے کے معاملے میں نفاست طبع کو کیا کروں ہمراہیوں کا بھی بڑا خیال
کرتے ان کی پلیٹوں میں اپنے ہاتھ سے سالن وغیرہ ڈالتے نہیں انڈیل دیتے اور کھلا کھلا

کر بے جان کر دیتے، میں نے کبھی مرحوم کے مصاحبین کو تقریریں سنتے ہوئے نہیں دیکھا ادھر
کھایا اور اُدھر انٹا غفیل ہو گئے اس بے حسی کو محسوس کرتے اور برملا کہتے تم لوگ میرے ساتھ
رہ کر استفادہ نہیں کرتے اگر انیس ہوتا تمہاری جگہ تو ایک دفتر سمیٹ لیتا، کسی کی تحقیر کے
ہرگز روادار نہیں تھے، البتہ طنز لطیف سے بچ نکلنا بڑا مشکل تھا، سنجر پور میں تقریر شروع
کرنے سے پہلے نظر جلسہ گاہ کے ایک کونے میں میز کرسی کاغذ قلم سنبھالے ایک تھانیدار صاحب
پر پڑی، مسکرائے اور اشارہ کر کے فرمایا، آپ کے ساتھ تو دو دو فرشتے ہیں مجھ پر تقرر چار
کا ہے۔ خطاب فرما چکے تو معانقہ اس فرشتے سے بھی ہوا، کون نہیں جانتا کہ قادیانیوں
سے وہ کس درجہ اختلاف رکھتے تھے مگر انفرادی طور پر جا جا کر ان سے ملتے اور اس
حسن سلوک کے اخلاقی ردِ عمل اور اصلاحی رد عمل کے منتظر رہتے۔
تقریریں پچاس برس کے سن میں بھی زناٹے کی کر لیتے تھے لیکن ماچھی گوٹھ کی تقریر
کچھ ایسی رد کھی پھیکی رہی کہ ہم نے چھیڑ بنالی تھی، جب کبھی وہ عام گفتگو میں فراٹے بھرتے
اور کسی طرح مات کھاتے (اور مات انہیں دے بھی کون سکتا تھا) نظر نہ آتے یا یوں کہہ لیجئے

چوکڑیاں بھرتے تو ہم اس تقریر کی یاد تازہ کر کے رکاڈمیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے وہ ذرا نہ پھلانگ کر ہمیں چت کر لیتے اس کمی کو مرحوم نے سنجر پور کی تقریر میں پورا کیا جی بھر کے ہمیں رگیدا غالبًا ان کو اس کا الہام ہوا تھا کہ میں کسی کا جھوٹا پانی نہیں پیتا جبھی وہ نام لے لے کر کوستے رہے، کچھ اس طرح مثال دی کہ: ہاں ہاں اس گلاس کو ہاتھ نہ لگانا یہ پیر انیس سائیں کا گلاس ہے سائیں کا گلاس نہ ہوا چیٹھ[1] ہوا: اس پر ہم نے یونہی سامنہ بنایا اور پھیلایا، اچھے مہمان ہیں آپ، جلسہ عام میں یوں گالیاں دی جا رہی ہیں، قاضی صاحب کی سرزنش پر غالب یاد آئے، یعنی گالیاں کھا کے بھی ہم بے مزہ نہ ہوئے یہ تقریر بلاشبہ معرکہ آرا تھی، میں جس چوکڑی میں بیٹھا ہوا تھا، سب کی حالت غیر تھی، آنسوؤں کا طوفان جیسے اشک ہائے ندامت کہتے رکتا نظر نہ آتا تھا، گلا میرا بھی رُندھ رُندھ گیا، خشک ہوا جذبات امڈ آئے ضبط کیا اور رسوائی میرا مقدر نہ بن سکی، کسی نے سچ کہا ہے

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

خاتمہ کلام پر، ہجوم دست بوسی کے لئے ٹوٹ پڑا، میں صرف ہاتھ میں ہاتھ دے کر رہ گیا، رات کے دو بج رہے تھے اس وقت یہ دو نفل کیسے؟ کہنے لگے جلسہ گاہ سے رخصت ہوتے وقت دو نوجوان آگے بڑھ کر ملے اور کہا ہم نے آج اسلام کی روح کو پا لیا، یہ دو نفل اسی کا شکرانہ تھے۔

کہتے تھے صرف ایک آدمی سے میں نے شکست کھائی ہے اور وہ تھا سکندر حیات اس کی وزارت کا دور دورہ تھا ایک ایسے جلسے کی صدارت وزیر موصوف کرنے والے تھے جس میں مجھے بھی تقریر کرنا تھی، سوچا موقع اچھا ہے جو کچھ کہنا ہے کہہ دو، میں نے اسے انگریزوں کا پٹھو اور غدار وطن قرار دیا اور یہ شعر پڑھا

حرم کو بندہ لات و منات کیا جانے
خدا کے گھر کو سکندر حیات کیا جانے

---

[1] وہ برتن جس میں کتا کھائے پیئے۔ لفظ کتا زبان پر لانے کی ضرورت نہیں ہے چیٹھ کہہ دینا کافی و شافی ہے، اردو ترجمہ نہ ہوا۔

سکندر حیات سب کچھ خاموش سنتا رہا مسکراتا رہا، خطبہ صدارت کے لئے کھڑا ہوا اور کہا یہ بڑے فخر اور مسرت کی بات ہے کہ میرے دور حکومت میں ایسے حق گو بھی موجود ہیں جو میرے سامنے کلمہ حق کہہ سکتے ہیں، یہ سن کر میں پانی پانی ہو گیا، مرحوم کی بیباکی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ سندھ کے ایک گورنر کی ٹائی پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا جب خدا کے دربار میں پہنچو گے تو کیا جواب دو گے۔

تقریر کرنے جہاں بھی پہنچتے "ناکہ بندی" تو لازم تھی، یہ بھی طرح طرح سے چکمہ دیتے، کبھی قلی کی وردی حاصل کر کے غچہ دے جاتے اور گاہے مختلف عمارتوں کی چھتیں طے کر کے سیڑھیاں لگا کر مسجد وزیر خاں میں وقت مقررہ پر پہنچتے، دل کا بخار نکالتے اور ہاتھ زنجیر و سلاسل کے لئے آگے بڑھا دیتے، سنجیدہ مذہبی مسائل میں بھی طنز و مزاح کی چاشنی بقدر حسن بیان شامل رکھتے اور ایک سماں باندھ دیتے۔ شنید ہے کہ بہادر یار جنگ مرحوم کھڑے ہوتے تو اعلان کرتے جس کا جی چاہے جا سکتا ہے، اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں نے بولنا شروع کر دیا تو آپ کا بیچ میں سے اٹھ کر جانا ناممکن ہو جائیگا، قاضی صاحب بھی کم نہیں تھے، تقریر کے دوران میں بادل گھر آئے، بادل برسا کیا یہ گرجا کئے، جل تھل ایک ہو گئے تو مجھے کو ساتھ لئے لئے پھرے، پچاس برس کی عمر میں بھی خوب ہٹے کٹے چست "چالاک" اور چاق و چوبند، بے انتہا نمکین بھرے بھرے گال، یہ حالت تو یوں کہئے دم آخر تھی، ایام شباب میں کیا عالم رہا ہو گا، اس کے باوجود دلی کے ایک جلسۂ عام میں جوش تقریر میں آواز اونچی ہوتی چلی گئی اور اس قدر چیخ چیخ کر بولے کہ پھیپھڑے متاثر ہو گئے، شدت جذبات سے خلوص نیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "خطیب پاکستان" خطاب جمہور امت کا دیا ہوا تھا بعض حلقوں میں "بلبل پاکستان" مشہور تھے، میں نے اپنی بیاض میں یہی ترکیب لکھ رکھی تھی، قلم زد کرتے ہوئے فرمایا، اچھے خاصے آدمی کو چڑیا گھر میں کیوں ڈال رہے ہو۔

سینکڑوں اشعار از بر تھے اور تقریر کے دوران میں نگینے کی طرح جڑتے چلے جاتے یہی حال عام گفتگو کا تھا، اکبر اور اقبال کے حافظ تھے، زبان و بیان کے اعتبار سے پست

اور غیر معیاری اشعار سے بھی کام چلا لیتے تھے، ایک شعر سنا کر فرمانے لگے رقیب کی تعریف میں اس سے بہتر شعر میری نظر سے نہیں گذرا، میں نے کہا یہ ہے کس کا؟ بولے ناسخ اور کون، افسوس مجھے وہ شعر یاد نہیں رہا، مفہوم یہ تھا کہ رقیب جب ہمارے محبوب کا محبوب ہے تو ہمیں کیوں نہ محبوب ہو، اب جو ناسخ کا مجموعہ کلام دیکھتا ہوں تو اس مضمون کا کوئی شعر نظر نہیں آتا، متاخرین کے ساتھ ساتھ متقدمین کو بھی ترجیح دیتے عدم اور فیض کے علاوہ ان سے بھی کم تر غزل گویوں کے اشعار یاد تھے، پنجابی میں وارث شاہ اور نئے رنگ میں لکھنے والوں کی پوری پوری نظمیں سنایا کرتے، سرائیکی ان کی مادری زبان تھی اسے بھی مایوس نہ کرتے اور موقع بہ موقع خواجہ فرید کو گنگناتے، ایک رباعی یہاں نقل کرتا ہوں یہ خود حضرت کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔

گر سامنے تیرے کوئی بدخو آئے
تجھ میں نہ ذرا فرق سر مو آئے
احساں سے نہیں عود سے خوش خلقی سیکھی
جو تجھ کو جلائے اسے خوشبو آئے

خاصے تیز بخار میں بھی خطابت کے جوہر دکھاتے رہتے تھے، رقت طاری ہو جاتی تھی یا پیشہ ورانہ تقاریر میں رقت طاری کر لیتے تھے، منجر پور میں یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ جلسہ گاہ شہر کے مرکزی مقام پر ہے اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بھی کیا گیا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ خواتین نے بھی گھر بیٹھے اور پردے میں رہ کر اسلامی تعلیمات کی شرح و تفسیر سن لی، مرحوم کو صنف نازک کی اس محرومی کا بڑا احساس رہا کرتا تھا، حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ کسی قدر ازالہ ہوتا رہے۔

تنگ نظری، جہل، تعصب سے کوسوں دور تھے، وسیع المشرب وسیع النظر وسیع الملاقات وفاشعار، ہنس مکھ مہمان نواز دلیر اور دبنگ آدمی تھے، اچھا کھاتے اچھا پہنتے، کشادہ دل ہاتھ کھلا ہوا تھا اس لئے نذرانے بلا تردد قبول کر لیتے تھے، تقریروں کا معاوضہ بھی لے لیتے معقول آمدنی شہری جائیداد اور زرعی زمین سے بھی تھی، جس سے ملتے اسی کے ہو کر ملتے، گلے لگاتے

پیار کرتے احباب واعزہ کی خیریت پوچھتے، انجان لوگوں کو اس طرح چمٹا لیتے گویا مدتوں کی شناسائی ہے امرا اور غربا میں کوئی امتیاز نہ برتتے چاہے آپ کیسے ہی میلے چکٹ کپڑے پہنے ہوئے ہوں، میل اور پسینے سے سراپا عفونت کو بالکل اسی انداز سے اپنی بانہوں میں لے لیں گے جس طرح لباس حریر میں لپٹے ہوئے کسی معشوق چہاردہ سالہ کو لیا جا سکتا ہے، جلسہ گاہ سے رخصت ہو رہے ہیں، سامنے سے مجمع کو چیرتا ہوا ایک چیچک زدہ کریہہ الصورت نابینا شخص نمودار ہوتا ہے اور قاضی صاحب کے دست بوس ہونے کی تمنا کا اظہار کرتا ہے، بے اختیار یہ کہہ کر گلے سے لگا لیتے ہیں اور پیشانی چومتے ہیں، میاں آپ نے تو انبیا کو بھی ڈانٹ پلوادی تھی، عام معاشرتی زندگی میں صلح کل آدمی تھے، ان کی موجودگی میں لوگوں کی باہمی آویزش اور آمیزش کی بات چل نکلتی تو مظلوم اور اپنے کئے پر پشیمان غیر متعلق

اشخاص کی حمایت کرتے اور اپنی ذات کو واسطہ بنا کر دلوں کا غبار دھو ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے تو بے پایاں روحانی مسرت اور شادمانی چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔

مزاج میں خشونت بالکل نہیں تھی، بے حد شگفتہ مزاج اور باغ و بہار آدمی تھے، کبھی کبھی عریاں گفتار ہو جاتے تھے، مس فاطمہ جناح کا ذکر آیا تو یونہی کسی سے روایت کرتے ہوئے فرمایا جس نے ایک کا بوجھ نہیں اٹھایا وہ قوم کا بوجھ کیا اٹھائیں گی، حامی قاضی صاحب صدر ایوب کے بھی نہیں تھے، بلاوے پر مل چکے تھے، پاک بھارت جنگ کو جہاد سے تعبیر کرنے میں تامل تھا، تامل کیا تھا صاف صاف کہتے تھے میں اسے جہاد نہیں سمجھتا، پاک افواج کے کارہائے نمایاں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے تھے جس بے جگری سے ہمارے جوان لڑے ہیں اس کی مثالیں صرف اسلامی تاریخ ہی سے پیش کی جا سکتی ہیں اور یہ جذبہ عطیہ اسلام کا ہے، ہماری فوجوں کو اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع ملا دوسرے اخلاقی حالت بھی سدھر گئی، صدر ایوب کے میدان جنگ میں اگلے مورچوں تک باوجود روک تھام کے چلے جانے کی روایت بھی قاضی صاحب سے منسوب کرتا ہوں صدر کا موقف یہ تھا کہ میدان کارزار میں مجھے دیکھ کر جوانوں کے حوصلے بڑھیں گے۔

علامہ اقبال سے ملاقات کی تفصیل بھی قاضی صاحب نے مجھے بتائی تھی۔ میں نے اپنی قوت حافظہ پر ناحق اعتماد کر لیا، اب سوائے اس کے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ تین سوال کئے گئے تھے، پہلا سوال مرزائیت سے متعلق تھا جس کی علامہ نے تردید اور تنقیص فرمائی، دوسرا سوال علامہ کی شاعری اور تیسرا نہیں کہا جاسکتا کہ کیا تھا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو سے معرکہ آرائیوں کی جزئیات بھی مجھے یاد نہیں رہیں،

تصویریں وہ اتروا لیا کرتے تھے، کبھی چہرہ پر رومال ڈال لیتے کبھی ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرتے، میں نے ان کے پانچ سات عکس لئے جن میں سے ایک ایسا ہے، جس میں میں نے اپنے بیٹے ابوالکلام کو گود میں بٹھا دیا اور وہ بھی پورے اہتمام سے تصویر کھنچوانے ہی کے انداز میں بیٹھ گئے تھے، افسوس میری تصویر کسی نے مرحوم کے ساتھ کی نہ اتار لی، مجھے بھی اس کا خیال نہیں آیا، اپنی چند تصویریں مجھ سے چھین کر لے بھی گئے تھے بیوی کو غیر مردوں کے دیکھنے کا حکم نہیں تھا، تعمیل ارشاد میں بیگم صاحبہ نے وہ سب تصویری مجموعہ جلا کر خاکستر کر دیا جہاں جہاں مرحوم "غیر مردوں" کے جلو میں کھڑے یا بیٹھے ہوئے نظر آئے، اس طرح بڑا نادر ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ تصویر اور کیمرہ کی افادیت کے قائل تھے، ایک وردی پوش فوجی کو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے قدم بوس ہوتے وقت کی تصویر لے کر کمانڈر انچیف کو بھجواتے کی تمنا کیمرہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے تشنۂ تکمیل رہ گئی، مرحوم اسے پاکستانی وردی کی تذلیل سمجھتے تھے، کیمرہ خریدنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے، بینائی آخر وقت تک ٹھیک رہی، میں نے پڑھتے لکھتے وقت چشمہ لگائے ہوئے کبھی نہیں دیکھا،

کم از کم میرے علم میں پہلی بار محمد آباد تشریف لائے تو ارادے ہالیجی یا نوعاقل سندھ جا کر مولانا حماد اللہ سے ملنے کے باندھ لئے، دو کوارٹروں کی ڈبہ سی اوپل کار میں جب ہم لد کے چلے ہیں تو سفر قاضی صاحب کی خوش طبعی کہوں یا خوش فعلیوں سے خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہمارے چچا زاد بھائی کو جو اس گاڑی کے ناخدا بھی تھے کسی بات پر دبوچ ہی تو لیا اور پیشانی چومے بغیر نہ چھوڑا، گاڑی کا ڈگمگا کر رہ جانا بعید از قیاس نہ تھا، بلکہ درختوں سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی، گرمی چونکہ شدت کی پڑ رہی تھی، اکل و شرب کی ضرورت پڑتی

تو رکنا پڑا، اب تلاش مسلم ہوٹل کی شروع ہوئی، سندھ میں کثرت سے ہندو بھی آباد ہیں انتہا پسند مسلمان ان کے ہوٹلوں میں جاتے ہوئے ہچکچاتے کیا ہیں، سرے سے جاتے ہی نہیں، اکثریت کا طرز عمل اس کے برعکس ہے، مجھے یاد ہے بچپن میں ہم گاؤں سے شہر جاتے تو سب سے اچھی جلیبیاں ہندو حلوائیوں کے یہاں ملا کرتی تھیں، تقسیم ملک کے بعد یہ عصبیت نہ جانے کہاں سے در آئی، جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، ہم نے تو رسول اکرمؐ کو غیر مسلم وفود کی پذیرائی میں ایک موقع پر اپنی چادر بچھا کر انسانی مساوات کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور اخلاقیات کی دنیا میں غیر فانی اور انقلاب آفریں مثال قائم کرتے ہوئے دیکھا ہے، ہاں تو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہ تو "ہندو ہوٹل" ہے ہمارا "قافلہ" آگے بڑھا اور تجسس مزید کے لئے ایک اور ہوٹل کے سامنے رکا، میں نے کہا، یہاں پوچھنے کی ضرورت نہیں، دیکھ نہیں رہے آپ حضرات کہ یہ سرخ سرخ آنکھوں والے مینیجر صاحب ابھی ابھی چرس کا دم لگا کر آئے ہیں ظاہر ہے مسلمان ہیں، قاضی صاحب میری یاوہ گوئی پر حد درجہ محظوظ ہوئے، یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، یہ ہندو مسلم کرید ہمارے بھائی کی "پاکیزگی طبع کا نتیجہ تھی، مرحوم قاضی صاحب نے ہندو مسلم کی کوئی قید نہیں لگائی تازہ دم ہو کر یہ کارواں پھر آگے بڑھا اور ہالیجی جا کر دم لیا، مولانا حماد اللہ مسجد میں بیٹھے ہوئے کسی تفسیر کی تلاوت فرما رہے تھے، قاضی صاحب کی دیکھا دیکھی میں نے بھی پیروں کو چھوا اور یہ پانچ نفری "وفد" مودب ہو کر بیٹھ گیا، پانچ دس منٹ بعد متوجہ ہوئے اور چھنگلی سے ہر ایک کو مخاطب کیا، خیریت دریافت کرتے ہوئے فرمایا آپ تو جیل میں تھے، اسے مرحوم نے مولانا کی الہامی کیفیت سے منسوب کیا اور بہت متاثر ہوئے کہنے لگے دیکھا حضرت اخبار نہیں دیکھتے مگر میری نظر بندی آپ کے علم میں تھی، کھانے کا وقت ہو چکا تھا پھوس کے چھپر کے نیچے سی کچی پکی روٹیوں اور غالباً بینگن کے سالن سے پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑا، ہم کھانا زہر مار (کم از کم میری حالت تو یہی تھی) کر ہی رہے تھے کہ مولانا مسجد سے حویلی جاتے ہوئے ہمارے قریب سے گذرے اور ایک مرید کے نذر کئے گئے آموں میں سے تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی مل گیا، رخصتی معانقہ کرتے ہوئے قاضی صاحب رو رہے تھے

میں نے تو نہیں سنا ساتھیوں نے بتایا مولانا نے قاضی صاحب سے کہا: ہم آپ کو دیکھ لیتے ہیں: قاضی صاحب کی حالت اس لئے غیر ہوئی جاتی تھی کہ مولانا نہ جانے اس گنہگار کو کس حال میں دیکھتے ہوں گے چلے تو اب قاضی صاحب مصر ہیں کہ حضرت نے سکھر جانے کے بارے میں کیوں پوچھا تھا، چلو سکھر چلیں لیجیے ہم سکھر پہنچ گئے۔ یہاں ان کے ایک مرید کے ہاں کھانا بھی ہوا اور لڈو سے چھٹکارا بھی، باصرار اپنے پہلو میں لٹایا، سکھر میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس سرکاری افسر سے غالباً چیف سٹلمنٹ کمشنر کسی کی سفارش کے لئے لاہور جانے والے تھے وہ تو کراچی میں براجمان ہے، اب تو مولانا حماد اللہ کی ولایت غیر مشکوک اور شبہات سے بالاتر ہو کر رہی، مولانا مرحوم طویل القامت اور لحیم شحیم آدمی تھے فربہی صحت مندانہ نہیں مریضانہ تھی، نیک نفس اور اللہ اللہ کرنے والے بزرگ تھے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہاں جاکر طمانیت قلب نصیب نہیں ہوئی، مرحوم کی روحانیت مجھ پر منعکس نہیں ہوئی، دل میں احترام ابھی تک ہے۔

قاضی صاحب تو خیبر میل سے کراچی سدھارے اور ہم سیدھے سینما ہال میں جا گھسے، نہیں کہا جا سکتا مرحوم نے کبھی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی، فلمی گانے سن لیا کرتے تھے روایت ہے کہ ریلوے پھاٹک بند ہونے کی وجہ سے رُکے تو حضرت اتر کر ذرا ٹہلنے نکل گئے اسے غنیمت جان کر ریڈیو کے کان مروڑ دیے گئے، آتے آتے کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی بیٹھتے ہی ٹٹولتے ہوتے طنزیہ فرمایا، بھئی کیوں بند کر دیا میں بھی سلسلہ چشتیہ سے منسلک ہوں "ابتدائے عشق" میں پوچھتے رہے۔ انیس بی اے تو ہو گا ہی، حالانکہ یہاں سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں، مرحوم بلا مبالغہ ہزاروں سے ملے، بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوتے، بڑے بوڑھوں اور اگلے وقتوں کے لوگوں کے صحبت یافتہ، بلند ترین معاصرین بلند پایا ہم عصروں سے شب و روز کی مجلس آرائیاں اور چشمک، عوامی ربط ضبط سبھی کچھ تھا، مگر معاف کیجیے گا مردم شناسی چھو تک نہیں گئی تھی، میں نے ان کے حواریوں میں ریاکار اور خود غرض لوگوں کی ہما ہمی دیکھی جنہیں مرحوم اپنا ہوا خواہ اور مخلص سمجھتے رہے، دینی مدارس کے بدکردار ملاؤں کی نشاندہی کی گئی مگر ان کے حسن ظن میں کوئی فرق نہیں آیا،

قاضی صاحب دل کے ساتھ پاسبانِ عقل ضرور رکھتے تھے مگران کا شمار اہل خرد میں نہیں اصحاب جنوں میں ہوتا تھا، وہ ایک چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے تھے، بے انتہا رقیق القلب دل کے معاملات کا ذکر انہیں آبدیدہ کر دیا کرتا تھا، گھگھی بندھ جاتی، آنسوؤں کے موتی رولنے لگتے، خدا اور رسولؐ کے بعد اپنی بچیوں اور بیوی سے عشق تھا، عشق مجازی کا مرجع بچے اور حقیقی کا خدا و رسولؐ، اولاد نرینہ سے محروم رہے مگر وہ اپنی اس محرومی پر کبھی ماتم کناں نہیں دیکھے گئے، ہر بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پیار کرتے اور جی بہلاتے۔

مرحوم بسا اوقات اپنی محبت کا اظہار خاصے مبالغہ آمیز پیرائے میں بیان کیا کرتے تھے لیکن اس میں شبہ نہیں، دخل کذب دریا کو بہت کم رہا ہے، وہ سراپا محبت تھے وہ محبت ہی محبت تھے ایک پیغام سر بہ مہر ان ہی کی آواز میں مجھ تک پہنچا تھا۔ اب کہاں لوگ اس محبت کے۔

یاں گروہ کہ از ساغرِ دفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

پڑھی نماز جنازے کی میری غیروں نے مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

اور پیارے

آرائشِ جمال میں وہ ہیں ابھی مگن
اور میں نے آسماں کے ستارے بھی گن لئے

اس علاقے میں آؤں اور اپنے انیسؔ سے محروم رہوں، یہ میری سب سے بڑی بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے، بہر حال انیسؔ کی یاد میرے شامل حال ہے، اللہ اسے دونوں جہانوں کی راحتیں اور مسرتیں عطا فرمائے پروگرام بن رہا ہے شائد ایک ہفتہ کا پروگرام بن جاتے تو حاضری دے کر آنکھیں ٹھنڈی کر سکوں، السلام علیکم، میرا ہدیہ سلام قبول فرمائیں۔

قاضی صاحب ہجوم عاشقاں میں لیٹے ہوئے کراہ رہے تھے، پیٹ میں درد کم لیکن عشاق کو تڑپانے کے لئے زیادہ ظاہر کر رہے ہیں، ایک منہ چڑھا عقیدت مند

بھی موجود ہے شکایتاً کہتا ہے

o آپ ہمارے ہاں آتے نہیں
تم بلاتے نہیں تو آئیں کیسے

o یہ تو نہیں بار ہا بلا چکا ہوں

لوگو دیکھو یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور صحیح سلامت بیٹھا ہے، ایک زمانے میں جھوٹ بولنے والے کو بخار چڑھ جاتا تھا۔

o عقیدت مند کہاں چوکنے والا تھا، جی بخار تو نہیں اب پیٹ میں درد ضرور ہو جاتا ہے،

جھینپ مٹاتے کے لئے ''اچھا اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور میری ٹانگیں دباؤ۔

یہ پہلا موقع تھا قاضی صاحب کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا گیا ورنہ عام طور پر اگر کوئی خم ٹھونک کر سامنے آیا بھی تو چٹکیوں میں اڑا دیا گیا۔

پوری زندگی تحریک آزادی اور اسلامی قدروں کی ترویج اور ترقی میں گزری خدا کی وحدانیت کے مبلغ اور رسولؐ کی رسالت وصداقت کی تعریف وتوصیف کا بقول شبلیؔ ایک شعر بن کر رہ گئے تھے، وہ گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ارکان اسلامی پر جان چھڑکتے تھے۔ مولانا مودودی کی ''تفہیم القرآن'' میں کہیں صحابہ پر بقول قاضی صاحب تنقید دیکھ کر برافروختہ ہوئے اور شدومد سے اختلاف کیا، ایک نوجوان پر اس لئے بگڑے کہ اس نے پندرہ پارے تو حفظ کر لئے اور باقی یہ کہہ کر چھوڑ دیئے کہ دل نہیں لگ رہا۔ کہتے تھے تمہیں خدا کے یہاں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ حیات مسیح اور معراج جسمانی کے قائل تھے، حج کر چکے تھے اپنی معذور ماں کے قدموں کو چومتے وہ روکتیں تو کہتے میری جنت تو انہی قدموں تلے ہے،

شجاع آباد کے مشہور قاضی خاندان سے تھے، بادشاہی مسجد کے متولی اور پیش امام

تھے مسجد کی ہر سال توسیع ہوتی رہتی تھی اور اس کے لئے احباب کی جیبوں کو بے تکلف ٹٹولتے رہتے تھے، تقاضے مجھ سے بھی ہوئے مگر یہاں جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔

مرحوم شوق جہاد اور پاداش جذبۂ آزادی میں بحیثیت مجموعی نو برس جیل میں رہے آزادی کے بعد بھی "بلیک لسٹ" میں رہے، کبھی یہاں تو کبھی وہاں داخلہ بند، سامعین میں سے کسی نے سوال کیا کہ خلفائے، راشدین اور موجودہ دور کے حکمرانوں کا موازنہ کیجئے، فرمایا یہ حکومت ان کے مقابلے میں لاشئے کا درجہ رکھتی ہے، اخباری نمائندے نے لاشیں باندھا اور قاضی صاحب دھر لئے گئے، مرزائیوں کے خلاف ۱۹۵۲ء ۵۲ء میں باقاعدہ تحریک چل نکلی تھی یہ بھی پیش پیش تھے جیل میں ڈال دیئے گئے، اسی دوران میں والد کا انتقال ہو گیا، حکام نے بہت چاہا درخواست گذار دیں تو جنازے وغیرہ میں شریک ہو سکتے ہیں، مگر اس مرد خدا نے منت کش دربان ہونا پسند نہیں کیا سنایا کرتے تھے، تقسیم ملک کے بعد جب میں پہلی بار جیل جانے لگا تو والد آبدیدہ ہو گئے، میں حیران یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے، یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی، قید و بند کی آزمائشیں تو گویا ایک معمول تھا، عرض کیا حضور یہ کیا! بولے بیٹا پہلے غیروں سے معاملہ تھا اب اپنوں کی نظر کرم ہے، جیل میں فرش و فروش کہاں، تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ایک پتھر کی چوکی سی بنا دی جاتی ہے۔ جس میں ایک جوؤں سے بھرا ہوا دھسہ بھی پڑا رہتا ہے، یہ قلندر کچھ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا کہ کروٹ بدلتے ہی نیچے آرہا، ہڈی کہنی سے اتر گئی یا ٹوٹ گئی اس لئے ایک بازو خمیدہ تھا، جیل میں بقول مرحوم زہر دیا گیا تھا جس کے اثرات گرمیوں میں عود کر آتے تھے، پھر تو وہ مستقل مریض رہنے لگے، مرض کی طوالت کو دیکھتے ہوئے شورش نے اپنی دعائیہ نظم میں لکھا تھا۔

ع چھ مہینے سے سفیر اسلام کا بیمار ہے

لاہور اور ملتان کے اچھے سے اچھے ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، یہاں تک کہ وہ مایوس ہو کر گھر آ گئے جگر اور گردے متاثر تھے، میں اسی

مرض الموت میں مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا، ایک کھری چارپائی پر کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی ڈالے لیٹے کیا پڑے ہوئے تھے، سوکھ کر قاق ہو چکے تھے، وہ تن و توش سب غائب، وہ شخص جو گھنٹوں ہر موضوع پر جوشیلی گفتگو کر سکتا تھا تقریر کرنے کھڑا ہو تو محض الفاظ کی جادوگری سے ہزاروں کی دنیا بدل دیتا تھا! جب جی چاہے ہنسا دے، رلا دے، اس کی بے بسی اور بیچارگی دیکھی نہیں جاتی تھی، سن لیتے تھے. بولنے کا یارانہ تھا، کان لے جاکر منہ سے لگا دو تب کچھ پلے پڑتا تھا۔ ہوش و حواس قائم تنہا تھے، میں نے پوچھا کہ وہ آپ کے رفیق خاص کیا ہوئے، انگشت شہادت بلند کر کے رہ گئے۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں رہا۔ ہا' سچ ہے۔

ع شمع جب بجھنے لگی پروانے وفا بھول گئے

اخبار جنگ کا جمعہ نمبر میرے ہاتھ میں تھا، میں نے کہا پیر علی محمد راشدی نے ابوالکلام آزاد پر لکھا ہے فرمایا، سناؤ۔ اس کے بعد زیادہ دیر بیٹھنا اول تو مناسب بھی نہیں تھا دوسرے بیٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ دل تھامے ہوئے چلا آیا تھوڑے ہی دنوں میں میرے لئے یہ سناؤنی حیرت زا ثابت نہیں ہوئی کہ

ع۔ لوگ کہتے ہیں شجاع آباد سے احسان گیا

۱۸/ فروری ۱۹۷۹ء

ساڑھے بارہ بجے دن

مجنوں جو مر گیا ہے

پنجابی نژاد محمد الدین کے تین بیٹے، منشی عبد القدیر، یوسف دہلوی، ضیاء الدین احمد، عبد القدیر کا شمار دلی کے عاشقوں میں ہوا، کوچہ سیاست میں رسوا بھی ہوئے، یوسف دہلوی نے خطاطی میں نام پیدا کیا، بقول ملا واحدی، یوسف کا تو جواب ہی نہیں، ضیاء الدین احمد کیوں پیچھے رہتے، دنیائے ادب و صحافت میں معروف ہوئے، برنی خطاب خواجہ حسن نظامی نے دیا، دلی میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے، ابتدائی تعلیم گھر پہ اور عربک ہائی اسکول میں ہوئی، گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کیا، مشہور کانگریسی آصف علی کے ساتھ کے کھیلے ہوئے، انہی کے مشورے پر سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخل ہو گئے، پرنسپل رودرا اور سی ایف اینڈریوز کے محبوب شاگردوں میں ممتاز ہوئے، کلبوں دعوتوں میں بھی اساتذہ کے ساتھ ساتھ، اینڈریوز نے ذکاء اللہ پر قلم اٹھایا تو ایک مقالہ برنی نے بھی لکھ کر اعانت کی، خوش ہو کر استاد نے سوان ہیلن عطا فرمایا، ایک موقعے پر کسی مطبوعہ کتاب کا اصل مسودہ تحفہ دیا اسی استاد نے، سبھی برنی کے گرویدہ، بی اے کا امتحان دینے لاہور آئے تو علامہ اقبال سے بھی ملے اور ظفر علی خاں کے زمیندار میں کام بھی کیا، کالج سے نکلتے ہی مختلف تعلیمی اداروں سے منسلک ہو گئے، اینی بیسنٹ کے یہاں کانپور جا کر کچھ کام تدریس کا کیا، اور بھی ادھر اُدھر جھانک آئے، بالآخر وابستۂ سرکار ہوئے، دارالترجمہ سے منسوب ہوئے، قریب قریب بمبئی کے ہو کر رہ گئے، اصل میدان علم و ادب تھا، قلم اور مشاہیر عصر کے ساتھ انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا، بازپرس بھی ہوئی، مگر وہ زمانہ تحریک آزادی کا تھا، اکابرین ملت سے ملتے جلتے اور کام آتے رہے، محمد علی کی غزلیں کچھ دیکھے بھالے بغیر برنی کے دفتر سے آزاد ہو کر معارف میں چھپا کرتی تھیں، خود بدولت قلمی ناموں سے اردو انگریزی

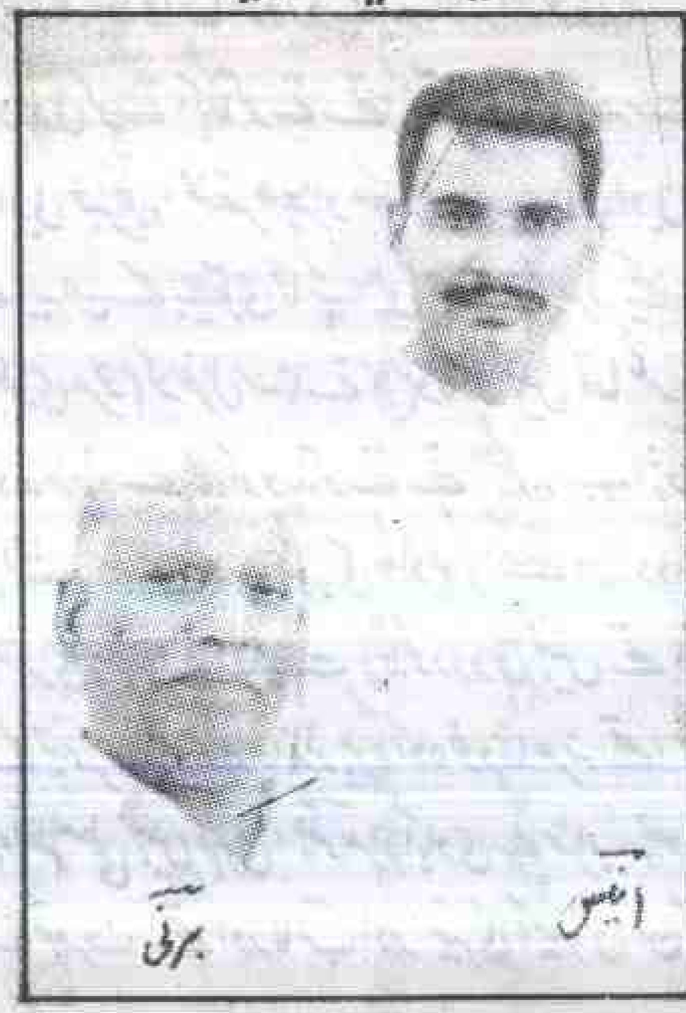
اخبارات و رسائل میں خامہ فرسائی کرتے رہے۔ مختلف اصلاحی کتابچے لکھے اور چھپوائے۔

سادہ نویس تھے، بوجھل اور ثقیل جملے ان کے قلم سے بہت کم نکلے، واقعات کا انتخاب سنجیدہ اور اصلاحی ہوتا، خط پختہ تھا، قلم روک کر لکھتے تو خوش نویس کہلاتے، ان کے بس میں ہوتا تو پوری پوری سطریں ملا کر لکھتے، آج کل کے خوش نویسوں سے اچھا لکھ سکتا ہوں، دعوی یہ بھی تھا، ایک بد خط کاتب کو خطاب ان کی سرکار سے تنکا رقم عطا ہوا، انگریزی اردو سے زیادہ صاف اور روشن لکھتے تھے۔

خطوں کے جواب بڑی باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، گھنٹوں کی دیر بھی مشکل سے ہوتی، نام اور پتہ انگریزی میں لکھنا بھی عادت سی تھی، جوابی لفافہ بھیجئے تو مرحوم اسے توہین تصور کرتے اور خفا ہوتے۔ انگریزی کی خوبی ایک یہ بھی بیان کیا کرتے تھے کہ خطوں کے جواب جلدی اور عمدگی سے دیتے ہیں، آخر عمر میں بصارت موتیا بند کے سبب بہت کم رہ گئی تھی چشمہ کوئی لگ نہ سکا، بینائی کی یہ خرابی اچانک ہوئی اور وہ پڑھنے لکھنے سے تقریباً معذور ہو گئے، تاہم بہو بیٹیاں اور بیٹے ہاتھ اور آنکھیں بن گئے تھے، تیماردار بھی اور منشی بھی صحت کے دنوں میں اپنا زیادہ تر وقت یو گھر میں گزارتے لکھنے پڑھنے کی میز پر جھکے رہتے۔ خط سادہ لکھتے، بالکل سپاٹ، مطلب اور کام کی باتیں، ادیبانہ شان قطعاً نہیں پائی جاتی تھی، تاہم اپنائیت، بزرگانہ شفقت و مروت کا عنصر بے حد نمایاں اور رواں دواں نظر آتا ہے، زندگی میں انہوں نے بہت کم آرام کیا، ہمہ وقت لکھنے پڑھنے یا دوسروں کے کام آنے میں بسر کی، تقریباً ایک سو ہمعصر ایسے ہیں جن پر مرحوم نے قلم اٹھایا تھا تصانیف و تراجم کی فہرست اچھی خاصی ہے اور یہ سب بڑے بوڑھوں اور نوجوانوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے پڑھنے کا بہت شوق تھا، پرانی چیزوں کی جستجو بھی کسی قدر رہتی تھی، ایک دوست نے کتاب لکھی پوری کتاب جا کر سن لی، مضمون کوئی پسند آجائے تو بار بار پڑھتے مطالعے کی چیٹک تھی اخبارات کے دفاتر اور پریسوں میں جا کر زیر طبع کتابیں پڑھتے رہتے، معیاری لکھائی چھپائی کے قائل تھے بلکہ ٹائپ زیادہ مرغوب

ضیاء الدین احمد برنی



۱۸۹۰ء ——— ۱۹۶۹ء

تھا، کتابیں جمع کرنے کا شوق بس واجبی سا تھا۔ تبصرے کے لئے جتنی کتابیں آتیں دوستوں میں بٹ جاتیں۔

غلط تلفظ ان کے سینے میں برچھی بن کر اتر جایا کرتا تھا، حالی کا مصرع ریڈیو سے غلط نشر ہوا فوراً اپنے ننھے منے ماہنامے "کتابی دنیا" میں تصحیح شائع کر دی، یہ رسالہ ایک طرح سے مرحوم کا بہلاوا تھا، دو روپے زر سالانہ اگر کوئی پورے صفحے کا اشتہار چھپوائے تو صرف پچیس روپے وصول کرتے، کہا کرتے تھے، مقصود اصلی خدمت ہے حصول زر نہیں ہرگز نہیں، علمی ادبی خبریں، مختصر طبعزاد مضامین، بے لاگ ادبی سیاسی تبصرے دل کو لبھانے والے، یہ ان کے جیتے جی ٹائپ میں چھپتا رہا پھر دیکھنے میں ہی نہیں آیا۔

حیرت شملوی مرحوم کو غزل سنانے کا ہوکا تو نہیں تھا مگر وہ اپنے خاص ملاقاتیوں کی تواضع ایک آدھ غزل سے بھی کر دیا کرتے تھے، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ برنی مرحوم ایک طویل نشست میں شعر و سخن کی وادیوں سے دور دور ہی رہے تو کہنا پڑا۔ اچھا تو نثری ہیں شعری نہیں، فی الحقیقت وہ کورِ ذوق نہیں تھے، کتابی دنیا میں شعری مجموعوں پر اُن کے تبصرے بڑے جاندار ہیں، وہ خود شاعر نہ تھے، مگر شعر کی پرکھ اور مزاج آشنا ضرور تھے، نظر سطحی نہیں گہری، جگر مرادآبادی نے شراب چھوڑنے کے بعد جو کچھ کہا ہے برنی اسی کے معترف تھے اور غالب اور میر کی آمیزش ان کو فانی کے ہاں تڑپاتی تھی۔

صوم و صلوٰۃ کے پابند، علی الصبح نماز کے لئے گھر والوں کو تو کیا پاس پڑوس کو کو بھی جگا دیتے تھے شور یہ مچا، جلدی کرو ورنہ روزہ مکروہ ہو جائے گا، بے روزہ داروں کو خوب پھٹکارتے، آخر عمر میں نماز بیٹھ کر ادا تو ہو گئی تھی پھر بھی صبح سویرے بیدار ہو جاتے بچوں کو جگاتے نماز پڑھتے، قرآن کی تھوڑی سی تلاوت اور انگریزی ترجمے کا مطالعہ کرتے پردے کے قائل نہیں تھے، موجودہ پردہ کہتے تھے شرعی نہیں رواجی ہے جو ہندو راجپوتوں اور برہمنوں میں رہ کر سیکھا گیا، اپنی پردے کی پابند بہن پر معترض بھی نہیں ہوتے ان کا مسلک رواداری تھا، چھوت چھات سے دور، ہندوؤں کے ہاں مہینوں قیام کرتے اور کھاتے پیتے، اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے بائبل سوسائٹی کے طریقوں پر عمل

محب۔ شکیب۔ تصویریں آگئی ہیں۔ شکریہ قبول فرمایئے

[illegible] [illegible] ان کا [illegible] والتسلیم

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

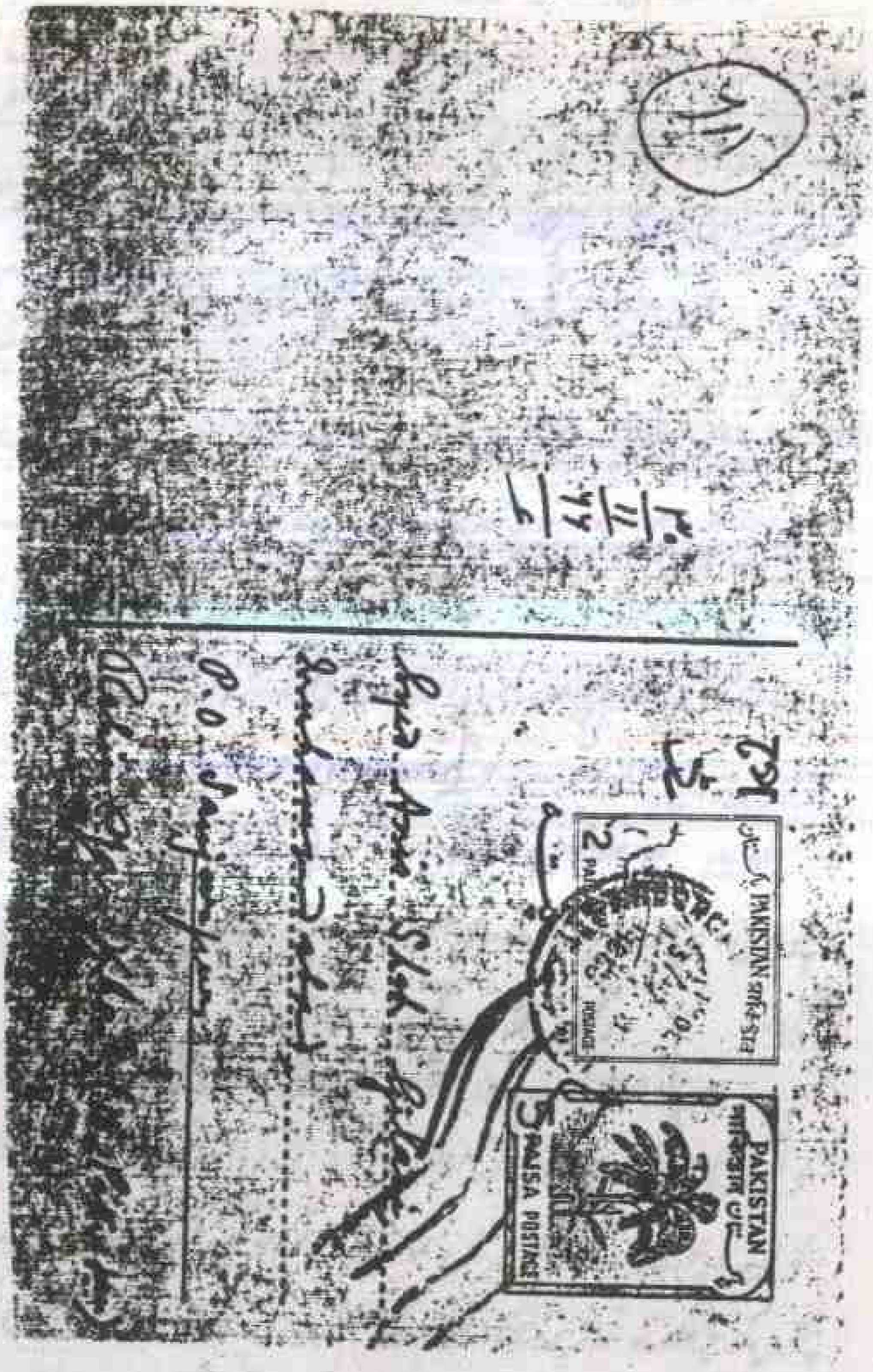
[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

مخلص

[illegible]

۳۰ نومبر ۱۹۶۶


PAKISTAN
PAISA POSTAGE

کرنے کے مشورے دیا کرتے تھے، مرحوم یہ بھی مانتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام بے باپ
کے پیدا ہوئے۔ ولادت مسیح پر زیادہ سے زیادہ تحقیق ہو اور جتنی مشکلیں ہیں حل
ہونی چاہئیں، عیسائیت پر ایک معرکے کی کتاب لکھنے میں مصروف تھے ثابت یہ کیا جا
رہا تھا قرآن نے حضرت مسیح کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس کی پوری تائید
موجودہ اناجیل سے بھی ہوتی ہے انھوں نے موجودہ عیسائی مذہب اور انجیل کی لغو
باتوں اور خرابیوں پر بائبل کی آیات کی روشنی میں بحث کی ہے کئی عیسائی پادری اس کتاب
کے ابواب سن کر چراغ پا تو بہت ہوئے لیکن جواب کسی سے نہ بن پڑا، حدیث پر توجہ
کم تھی، برگشتہ تو وہ مرزائیت سے تھے مگر مرزا بشیر الدین کی موت کو بڑا سانحہ اور عظیم نقصان
لکھا ہے، مرزائیوں کی کتابوں پر تبصرے ٹھنڈے دل سے کرتے، رسول اللہؐ سے محبت تھی
اگر شان اقدس میں کوئی کسی کتاب میں گستاخ ہوتا تو حکومت وقت کو فوری ضبطی کا مشورہ
دیتے، مذہبی کتابوں کے ادبی پہلو کو کسی طرح نظر انداز نہ کرتے۔ نواب محسن الملک کی آیات
بینات کو رد شیعیت کی بہترین کتاب فرماتے تھے، تعزیہ داری کے خلاف تھے نذیر احمد
کی امہات الامہ کے بارے میں کہیں لکھا ہے سوائے چند آزاد جملوں کے باقی کتاب ہرگز قابل
اعتراض نہیں ٹھہرائی جا سکتی، یہ کتاب بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے اور ہمارے لٹریچر میں
نمایاں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، برنی صاحب کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ علم ریاضی
ہمارے علماء سے اور اطباء سے جراحی نجانے کیوں اٹھ گیا، بیمے کو جائز سمجھتے اور تصوف
سے بھی شغف تھا، صوفیائے کرام کے فیوض باطنی کے قائل تھے، البتہ رسومات توہمات
اور فروعات کے وہ سختی سے مخالف تھے، ملاؤں کی تقریریں سن کر بے قابو ہو جاتے۔
شرافت اخلاق اور مروت کا پیکر تھے، جناب یوسف دہلوی خطاط اعظم سے تبرکاً کچھ لکھوانا
چاہا تو وہ آجکل پر ٹالنے لگے برنی صاحب کو علم ہوا تو جا کر سخت سست کہہ آئے، یہ دوست
اور ذرہ نوازی ہی تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں کا خاص خیال رکھتے، مثلاً ہر مہینے یہ فکر رہتی
کتابی دنیا مل گیا یا نہیں، تبصرہ شدہ کتابوں میں تمہیں کون کونسی پسند ہیں فوراً لکھو تاکہ بھجوا دیا
ایک ماہنامے کا شوق ہمیں بھی چرایا، اس راہ کی دشواریوں کی نشاندہی کرتے رہے جاؤ تو سودا

زیرِ قلم لا!! کر دکھاتے، دیکھو نیاز فتحپوری نے کیا لکھا ہے۔

میرا اصل مدعا تو "نگار" کے ذریعہ اشتراکیت کی تبلیغ کرنا ہے

اسے حذف نہ کردوں، نیاز پر حرف آئے گا، میں نے زور دے کر کہا سارے دفتر کی جان یہ خط بلکہ یہی جملہ ہے اور آپ اسی کو اڑا دینے کی فکر میں ہیں، میرا اصرار بڑھا تو مان گئے۔ اچھا تم کہتے ہو تو رہنے دوں گا، اس مجموعہ مکاتیب میں چار خط حیرت شملوی کے بھی شامل کر دیئے تھے حیرت چونکہ میرا موضوع اور ممدوح ہیں اس لئے بطور خاص بتایا، اپنی تصنیف عظمت رفتہ کے ہر خاکے کی تصویریں دوسری اشاعت میں شامل کرنے کی فکر میں رہتے تھے، مجھے دیکھتے ہی دیا نرائن نگم کی تصویر لاکر دکھائی۔ یہ جنگ ستمبر کے دن تھے، بہت مسرور کہ اس طوفان بلاخیز سے بچ کر یہ نادر تصویر آ پہنچی، عبدالمجید سالک کی دستخطی تصویر میں نے بھی پیش کر دی تھی۔

میں حاضر ہوتا تو رخصتی مصافحہ دروازے پر ہوتا، حالانکہ میں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ وہ اپنے مطالعہ کی میز سے ہٹنے نہ پائیں، دمے کے شدید دورے پڑ رہے ہیں مجھے کیا معلوم تھا، کراچی جاتے ہی حسب معمول جا دھمکا، اندر بلا لیا اٹھ کر بیٹھ گئے، دیکھ رہا ہوں آرام کی ضرورت ہے لہٰذا رخصت ہوتا ہوں، نہیں مانتے، اتنی دور سے آئے ہو، بیٹھو کہاں جاتے ہو، اللہ اللہ وہ اگلی شرافت کے نمونے، حیرت شملوی رام پور سے کراچی پہنچے، ریڈیو نے پذیرائی کی، یوم آزادی یا کسی ایسی ہی تقریب پر خالقدینا ہال کے مشاعرے میں بلائے گئے، حیرت کی جسمانی معذوری کے پیش نظر سب سے پہلے انہی کو پڑھوایا گیا، بھرے مشاعرے میں صرف برنی ہی اسٹیج سے استقبالیہ دروازے تک رخصتی سلام کے لئے ساتھ ساتھ رہے، ایک دوست اپنی بعض بے سروپا تحریروں کی وجہ سے افشائے راز کی رشوت کی زد میں تھے، یہ بغیر کسی کو اطلاع دیئے گئے اور تمام خطوط نکلوا کر جلوائے، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، مرنے والے دوستوں کی پیشانیاں دفور محبت سے چوم لینا اور تجہیز و تکفین کے جملہ مراحل میں شرکت ان کا معمول تھا۔

قد کاٹھ کے تو برنی صاحب ذرا سے تھے مگر اس چھوٹے سے خاکی وجود میں بے خوفی

اور بے باکی کا مادہ بھی کچھ کم نہیں تھا، تحریر ہو یا تقریر جس چیز کو بہتر سمجھتے کہہ گذرتے۔ حکومت وقت پر صرف کڑی تنقید ہی نہیں کرتے تھے بریوں مشورے بھی دیتے رہے، عام زندگی میں بھی منافقت سے کوسوں دور اچھے خاصے منہ پھٹ تھے ایک ہی بات بار بار لکھی گئی کس مزے سے لکھتے ہیں، بس آپ کو ایک رٹ لگی ہوئی ہے قطع نظر اس کے کہ دوسرے کی کیا حالت ہے، علی برادران کے سلسلے کی ایک کڑی "ریئرڈ اکومنٹس"، رئیس احمد جعفری نے آراستہ کر کے چھپوا دی ہیں، سنتے ہی بیقرار ہو گئے کہنے لگے کہیں سے لا کر دکھاؤ، آج ہی شام کو، میں نے کل پر ٹالنا چاہا، جھڑک کر کہا چھوڑو تم اپنے سیر سپاٹے جاؤ کتاب لاؤ، آزادی کا متوالا کوئی ہو بلا امتیاز حوالات میں جا کر دریافت حال کرتے، سرکار کے معتوب لوگ دفتری اوقات میں ملنے چلے آتے، یہ برنی صاحب کا کردار تھا، ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

مولانائے دیا باد مولانا عبدالماجد نے بائیں ریش دفش اور زہد و تقوٰی اپنی خود نوشت میں کذب وریا اور افترا کا ایک دفتر باندھا، مرحوم دوست کی حسین و جمیل بیوہ کو تین مہینے نکاح کی آڑ میں تختۂ مشق بنائے رکھا، خونخوار پہلی بیوی سے چونکہ اس بڑھاپے میں بھی خائف رہتے ہیں اس لئے مظلوم بیوہ کے ذکر سے قلم کو آلودہ نہیں کیا، عصمتِ قلم کو باقی رکھا، میں نے لکھا یہ بددیانتی کیوں، تو اپنے ہفت روزہ "صدق جدید" میں مولویانہ اشارے کنائے سے طرح دے گئے، برنی صاحب کی نظر سے یہ معمہ گزرا تو مجھ سے پوچھا یہ تم نے مولانا کو کیا لکھ دیا تھا؛ میں نے وضاحت کر دی، بے جھجک لکھتے ہیں

دریابادی نے بنئے پن کا ثبوت دیا تھا
اس وقت بھی یہ حرکت انکی پسند نہیں آئی تھی

کوئی اور ہوتا تو الٹا مجھے جھاڑتا اور مولانا اشرف علی تھانوی کے اس "جانشین" کی شان میں گستاخی کی پاداش میں ہماری عاقبت کی خرابی کی پیش گوئی تو یقیناً کر دیتا۔

تصنع اور تکلف چھو کر بھی نہیں گئے تھے، عیب جوئی کی کثافت سے بچتے البتہ نکتہ چینی کا حق پوری طرح استعمال کر کے چھوڑتے، اسی لئے وہ تمام دوستوں کی دیکھا دیکھی خواجہ حسن نظامی کے مرید نہ ہوئے۔ بھیڑ چال انہیں پسند بھی نہیں تھی۔ حق تنقید محفوظ رکھا، دشمنی عمر بھر کسی سے نہیں کی دوست ہزاروں بنائے۔

ہم سے بچھڑنے والا خاصا غصیلہ بھی تھا، جلال میں ہوتے تو بڑی روانی سے گالیوں کے دریا بہا دیتے، مولانا عرفان سے اکثر و بیشتر خلافت ہاؤس میں معرکے رہتے، بیچ بچاؤ کی ذمہ داریاں رئیس احمد جعفری نے سنبھال رکھی تھیں، نامراد غیض و غضب کی علامتوں کا پہلا پتھر تھا، فیروز نامی ایک دوست کے دفتر میں بغیر اجازت کے چلے گئے ذرا بگڑے ہوئے تیور اور صاحبی کا رعب بھانپ کر مادر زاد ننگی گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل آئے پھر کبھی شکل نہ دیکھی۔

خوش خوراک تھے، چھوڑتے وہ کوئی چیز نہیں تھے، پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے، یہ بھی نہیں تھا کہ بخیل ہوں، قاعدے قرینے اور ضرورت کو دیکھ کر ہاتھ کھولتے بسوں سے کام چل جائے تو رکشا ٹیکسی کے چکر میں نہیں پڑتے تھے، پاکستان میں ان کی زندگی ریٹائرمنٹ کی زندگی تھی، پان اسلامک شپنگ کمپنی سے برائے نام ملازمت کا تعلق آخر دم تک رہا، گھنٹے سوا گھنٹے کی ہلکی سی مشقت ایک طرح کی پنشن سی تھی، اور آخر میں تو دفتر کی حاضری کا تکلف بھی اٹھا دیا گیا تھا، اپنے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کا سامان ایک تو وہی کتابی دنیا تھا ہی "تعلیمی مرکز" بھی کام کر رہا تھا۔ انفرادی سعی و سفارش اور کاوش سے اچھی اچھی کتابیں منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

برنی صاحب مغفور کے چہرے پر جو یتیمی آمیز سادگی برستی تھی اسے دیکھتے ہوئے کیونکر کہئے کہ وہ کسی پر اور کوئی ان پر مرمٹا ہوگا، ہاں ذوق نظارہ اور لطافتِ حسن فی خیال اور چیز ہے، خواجہ حسن نظامی مرشد کے سجدۂ تعظیمی کے موئد تھے یہ کہاں چوکنے والے تھے، معاً کہہ گزرے۔

بندہ مرشد در شد کا قائل نہیں البتہ اگر کوئی نہایت حسین عورت

ہو اور اسے سجدہ کرنے کا سوال ہو تو میں بلا تامل اسے سجدہ کروں گا

دوسری شادی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد کی تھی، نجی زندگی بہت پاکیزہ، بمبئی کی توبہ شکن رنگینیاں متزلزل نہ کر سکیں، ساحل پر کھڑے تماشا دیکھتے رہے خود تماشا نہ بنے دل کے صاف شفاف آئینہ،

بالکل کھرے اور اکھڑ بھی نہیں تھے، بذلہ سنجی اور لطیفہ طرازی نے ان کے مزاج کو ظریفانہ شائستگی مزاح سے بہرہ ور کر دیا تھا، بھری محفل میں فقرے بازی سے نہیں چوکتے تھے، میرا بچہ ابوالکلام ذرا سا تو تھا سوال و جواب کیا کرتا منہ لٹکائے کھڑا رہا، ہنسے اور فرمایا، ارے یہ ابوالکلام تو نہیں ابوالسکوت ہیں

کھیل تماشوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، مگر صحت کیلئے ورزش ضرور کرتے تھے جسمانی صحت کو بہت اہمیت دیتے تھے گاما پہلوان سے بمبئی اور لاہور میں ملے جہاں شبلی اقبال آغا خاں پر لکھا پہلو بہ پہلو گاما کو بھی بٹھایا، ذہنی ورزش کے لئے تاریخی فلموں کی چاٹ تھی، ہٹلر کو فلمایا جائے تو ضرور پہنچتے، ہٹلر کی تصویر تک میز پر سجا رکھی تھی یہ کرید بھی رہتی کہ فلمی دنیا میں اگر کوئی عورت عزت و آبرو سے رہنا چاہے تو کیا رہ سکتی ہے۔ مرحوم کو پکے نہیں کچے گانوں سے بھی یونہی سا لگاؤ تھا۔

مسلم لیگی خلافتی کانگرسی سبھی سے ملاقات تھی، تقسیم ہندوستان کے خلاف تھے اس انتہائی راست اقدام پر مجبور کرنے کا سزاوار ہندوؤں کو ٹھہراتے تھے، پاکستان سے بے حد محبت تھی جو کچھ قربان کر کے آئے تھے اس کا دل پر کوئی اثر نہ تھا، وہ بڑے حوصلے اور ظرف کے آدمی تھے ایسی باتوں کو خاطر میں کیا لاتے وہ عالمگیر انسانی مساوات کے مدعی تھے۔

یوں تو برصغیر کے تقریباً سبھی ادیبوں اور شاعروں سے برادرانہ اور مساویانہ ربط ضبط تھا ایک مفلوج اور معذور مگر خوش فکر حیرت شملوی کا اضافہ خوشگوار محسوس کیا جا سکتا ہے مرکزی سرکار دہلی میں کسی خالی اسامی کے لئے بمبئی سے درخواست برنی صاحب نے اور شملہ سے حیرت شملوی نے گذرانی، برنی کے لئے مسز نائیڈو تک نے زوردار سفارشیں کر رکھی تھیں۔ کیوں نہ کرتیں بیٹا بنا رکھا تھا، وٹھل بھائی پٹیل کے دستخط ہونا باقی تھے۔ اسی دوران میں ان

کی حکومتِ وقت سے ان بن ہوگئی۔ استعفےٰ داغ کر گھر بیٹھ گئے، ان کی جگہ سر یعقوب نے لے لی، حواریوں نے ان کو بھی گھیر لیا، مختصر یہ کہ برنی صاحب کا کامیابی اور حیرت کی ناکامی کی توقع ننانوے فیصد تھی، سر یعقوب نے پوچھا ایک امیدوار اور بھی تو تھا، پلیٹنکار پٹیٹا یا سمجھا ہو نہ ہو دوسرا امیدوار حضرت کا خاص الخاص ہے، پھر کیا تھا برنی کا فائل کھسکا حیرت کے کاغذات آگے بڑھا اور بیسیوں جملے تعریفی توصیفی اضافہ کر دیئے، ہر طرح برتری ثابت کر دی، اسی اکھاڑ پچھاڑ میں دستخط ہوگئے، فون مبارکباد کے آئے، حیرت یہ سمجھے یارانِ بے تکلف یونہی ہوا باندھ رہے ہیں، جب تک مہر تقرری دیکھ نہ لی یقین نہ آیا، حیرت برنی آشنائی اسی وقت سے غائبانہ چلی آ رہی تھی، بقول حیرت یہ رقیب پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کراچی میں ملاقی ہوئے، اور برنی صاحب کو حیرت مرحوم کی قیام گاہ تک لے جانے والا میں تھا۔

اقبال کے تو مرحوم شیدائی تھے علامہ کے آخری دو برسوں کو مومنانہ کہتے تھے کسی کا یہ پوچھنا وبال ہوگیا، علامہ شراب پیتے تھے؟ ڈپٹ کر کہا ہاں پیتے تھے تو کیا ہوا، اس سے تمہیں کیا معلوم کرنا ہے، برنی حیات انسانی کے روشن پہلو اور درخشاں پہلو سامنے رکھنا پسند کرتے تھے، تاکہ اصلاح حال کا سلسلہ دراز تر ہوتا رہے، کہتے تھے علی برادران کی بڑی ہی ناگفتہ بہ باتیں میرے علم میں ہیں، لیکن قلم بند نہیں کروں گا ان کا تو یہ حال تھا اگر پٹیل جیسے وہ دھڑلے سے حرامزادہ اور مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک کہتے تھے اس پر بھی لکھنے بیٹھتے تو خوبیاں ڈھونڈ نکالنے میں کیا کیا جتن نہ کرتے، البتہ اس سے خوش تھے کہ ابوالکلام نے "انڈیا ونز فریڈم" میں پٹیل کو خوب لتاڑا ہے برنی صاحب نے ایک کتاب "تعلیم و تربیت" کے عنوان سے بھی لکھی اور نوجوانوں کی ابتدائی ذہنی اور جسمانی تربیت کے گُر ماہرانہ انداز میں بتائے، ذاتی گفتگو میں زبان دراز ضرور تھے قلم ہاتھ میں لیتے ہی لب و لہجہ مصالحانہ بلکہ مصلحانہ ہو جاتا۔ طبعزاد مضامین کا معاوضہ نہ ملے تو کڑھتے اور بگڑتے، ایک چیز انگریزی میں انھوں نے نئی لکھی، یعنی اپنے دفتر کے حالات قلمبند کئے، مولانا محمد علی پر پہلے بھی لکھ چکے تھے مسودہ محمد علی کو چھنڈوارہ

نظر بندی کے دوران میں جا کر دکھایا، آخری کتاب بی محمد علی کی کو ائف عمری چھوڑ گئے۔ دیکھئے کب چھپے، ہندوؤں سے ٹھن جانے کے بعد محمد علی کی کوشش یہ تھی کہ اب انگریز ہی نہ جائے یہی حکمران رہے یہ مجھے برنی صاحب نے بتایا، برنی اوّل درجے کے مترجم بھی تھے اور ترجمان بھی، گورنروں کے ہاں باقاعدگی سے ترجمانی کے لئے بلائے جاتے رہے۔

حیرت شملوی مرحوم کے تمام و کمال غیر مطبوعہ مواد کی جزوی و کلی اشاعتی ذمہ داریاں جب میں نے اپنے سر لیں تو برنی مصر تھے کہ جس قدر ہو سکے جلدی کرو۔ میں حالات کی خوبی اور خرابی کا ذکر کرتا تو ڈانٹتے پھٹکارتے، میں دیوان حیرت کی فوری طباعت و اشاعت کے لئے دعا کی درخواست لے کر گیا، پوچھا: روپیہ ہے، ہاں ہے تو، پھر دعا کی کیا ضرورت، ایک گفتگو یاد آئی۔

سگریٹ پیتے ہو

نہیں تو

پھر جیتے کیوں کر ہو

یہ کہا اور ایک فارسی شعر پڑھا، مفہوم یاد رہ گیا ہے، جس نے شراب نہیں پی اور گناہ نہیں کیا وہ کیسا انسان ہے، یہ ان کی باتیں ہی باتیں تھیں ورنہ شراب و شاہد سے ان کو کیا واسطہ۔

مرحوم نے پوری زندگی اپنے فرائض کی تکمیل پورے خلوص نیت سے کی، وہ کام سے گھبراتے نہیں تھے، وہ اس لئے نہیں کماتے کہ تن آسانی اور عیش کوشی کا سامان کریں گے وہ اس لئے ہاتھ پاؤں مارتے کہ ایسا کرنا عبادت میں شامل ہے، اپنے بال بچوں کے تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے لئے جائز ذرائع سے اتنا کچھ وصول کر لیتے، جس سے سفید پوشی کی آبرو رہ جاتی، سادہ کھاتے سادہ پہنتے پہناتے، لڑکوں ہی نہیں لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا، خاندان بھر میں اپنا بھرم اپنا وقار مرتے دم تک بحال رکھا۔

صحت جب میں ان سے ملا ہوں قابل رشک ہرگز نہ تھی، بڑھاپا غالب، آنکھیں کچی، ٹانگیں خارش زدہ، بھرا بھرا جسم، پست قامت، گول تالوں کا کمانی دار چشمہ، ٹائی

جناح ٹوپی، پتلون کوٹ ڈھیلے ڈھالے، گھر میں بنیان پتلون بھی، باتیں بڑی دل آویز، لہجا دھیما، ہر بات میں ٹھہراؤ، باتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کریں گے۔

برنی دمہ کو دفتری ابتلا کی گرفت کا نتیجہ سمجھتے تھے واقعہ یہ ہے کہ یہ مرض خاندانی تھا اور ورثے میں ملا، خون کا دباؤ بھی بڑھ چکا تھا، بہترین علاج کرایا، لیکن صحت دن بدن گرتی چلی گئی، یہ خیال دل میں بیٹھ چکا تھا کہ اب یہ بیماری لاعلاج ہے کوئی عیادت کو آتا تو ہنس کر کہتے کچھ اور مہلت مل گئی ہے، رقیق القلب بہت ہو گئے تھے اگلے وقتوں اور پرانی یادوں کا ذکر آجاتا تو آبدیدہ ہو جاتے، صبر و تحمل بھی کم رہ گیا تھا، مگر جب ہسپتال لے جائے جانے لگے تو غیر معمولی صبر و ضبط کا اظہار کیا اور یہ تک کہا ڈاکٹر سے پوچھ لو کیا رشتہ داروں کو اطلاع کر دیں، دو ہرے نمونئے اور بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

۲۲/ستمبر ۱۹۷۱ء

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

انڈا ٹھیک سے نہیں تلا گیا، سالن میں نمک کم ہے، مرچیں زیادہ کیوں ہیں، روٹیاں ادھ جلی اور کچی پکی ہیں، پھلکے کہاں ہیں، شوربا گاڑھا کیوں ہے، یہ خوان نعمت چینی کے برتنوں پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو بے تکلف اٹھا کر پھینک دیتے، برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی جھنکار سے گھر بھر کے کان ہو گئے، آج پاپا کا مزاج برہم ہے، ہر ایک اپنے اپنے کونے کھدرے میں دبک گیا، مگر ممی ہیں کہ خاموش سامنے ڈٹی ہوئی ہیں، اور حضرت قرآن لے کر بیٹھ گئے پڑھے جاتے ہیں، کبھی کبھار اس عالم میں نماز کی نیت بھی باندھ لیتے باوضو ہوں نہ ہوں اسکی کوئی قید نہ تھی، اماں جی پھر چولہا گرم کرنے میں منہمک ہو گئیں، باورچی عبدل منہ چڑھا بھی ہے پٹھان بھی، مکرر سب کچھ سینی میں سجا کر اصرار کر رہا ہے۔ اب کھا کے دیکھئے مزہ نہ آئے تو جو چور کی سزا وہ میری، خوف اور دہشت کے بادل چھٹ گئے صاحب خانہ نے خاموشی اور ایک متکلم وقار کے ساتھ خوش سیر ہو کر ہاتھ بڑھایا اور ذرا سا ستا کر گھر سے نکل گئے یہ معمول ہر ہفتے کا تھا۔

کھانا وہ بھی کھا رہے ہیں ان کے ایک عزیز عزیز کرمانی بھی، گفتگو بعض مذہبی مسائل سے نکلتی ہوئی حضورؐ کی ذات پر آ جاتی ہے۔ غسل خانے میں ہاتھ دھوتے گئے۔ عزیز بھائی پیچھے پیچھے اپنے دلائل کا طومار پیش کئے جاتے ہیں، اب دونوں آمنے سامنے کھڑے ہیں، تڑاخ سے ایک تھپڑ عزیز بھائی کے منہ پر پڑتا ہے، حضورؐ کی ذات پر زباں درازی برداشت کیونکر کرتے، تو بجے ہی سب بستروں میں چلے گئے۔

شاہ جعفر شاہ پھلواروی ندوی، شاہ سلیمان کے بیٹے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رفیق۔ جعفری صاحب بھی اسی ادارے سے منسلک، دونوں ندوۃ العلما لکھنو کے سند یافتہ اور شناسا

قبلولہ لاہور میں یکجا ہوتے تو ربط ضبط بڑھ گیا، پھلواری کبھی کبھی چائے پر آجاتے تھے قبلولہ بھی جعفری صاحب کے ہاں "برگنزا ہوٹل" میں ہوتا، انہوں نے ایک کتاب "اسلام اور موسیقی" لکھی ہے، ذکر آیا تو جعفری صاحب نے فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مشہور ادیب حالی کی آنکھیں اور کتب خانہ دیکھے ہوئے مرنجان مرنج منحنی سے بزرگ تھے، ظاہر اپنے ضرر اور صلح کل انسان نظر آتے تھے، مگر تھے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو اور نہایت خلوص نیت سے اپنے عقائد پر قائم، جعفری صاحب کے ہاں آر جار بہت بڑھ گئی تھی، غالباً پانی پتی کے کتب خانہ سے استفادہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ روز کی ملاقاتیں، کھانے پر موجود، چہل قدمی میں ساتھ، بازار کے پھیرے میں شریک، ادبی و شعری نشستوں میں شانہ بشانہ شامت اعمال مرزا کو حضور کا ہمسر بتانے لگے جوش غضب کو دیکھ کر دم دبائے دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ پشت پر جوتا رسید ہوا، کسی کو بیچ میں ڈال کر پھر آنے جانے لگے۔

"انور" اور "شمیم" دو ناول اردو میں بہت چلے، طویل ضخیم پھر بھی ہاتھوں ہاتھ بکے اور پڑھے گئے، مصنف تھے فیاض علی، اوسط درجے کے تو کیا بس معمولی وکیل تھے مگر کسی کی نظر کرم نے پاکستان میں اٹارنی جنرل بنادیا، سرکاری وکلا کو جو آسانیاں بلکہ تن آسانیاں میسر ہیں ان کو بھی تھیں، سرکاری بنگلہ سرکاری موٹر، خوبصورت اور نازک اندام بیوی اور دیگر ساز و سامان، نئے ملاقاتیوں میں یہ بھی تھے، خصوصاً ان کی بیوی، بیگم جعفری پر بے طرح فریفتہ تھیں، چمبہ ہاؤس میں قیام تھا، حاشیہ برداروں میں ہیں بھی وہاں پہنچا، فیاض علی کے صاحبزادے فوج میں کپتان نئی روشنی کا فوجی دماغ، جعفری صاحب مرحوم نے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک نہایت نرم رواں دواں اور دل نشیں گفتگو میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت اور صداقت ان پر واضح کرنے کی کوشش کر ڈالی،

نعوذ باللہ رسول اللہ پر جب مرگی کی سی کیفیت طاری ہوتی اور آپ اس عالم میں جو کچھ فرماتے اس کو محفوظ کر کے قرآن بنا دیا گیا، اس یا وہ گوئی پر بھری مجلس میں

رئیس احمد جعفری



۱۹۱۲ء —— ۱۹۶۸ء

بدنامِ زمانہ جسٹس منیر سے تلخ کلامی ہوگئی۔

آہنی الماریوں میں کپڑوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ ساتھ چیدہ کتابیں بھی سربمہر رہا کرتی تھیں، بعض گھریلو تصویریں قرآن مجید کے مطبوعہ نسخوں کے بیچوں بیچ یا تو کسی نے جان بوجھ کر دبا رکھی تھیں یا انجانے میں وہاں رہ گئیں، مرحوم کی نظر پڑی فوراً اٹھا کر پھینک دیں اور سب کو تنبیہ کی گئی آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

نماز کے وہ عید کے عید بھی روادار نہیں تھے۔ گھر بھر کے نئے کپڑے خریدے جاتے مگر وہ خود اپنے معمول کے مطابق عام دھلا ہوا جوڑا بدل کر بیٹھ جاتے اور حسب مراتب عیدی بانٹتے۔

غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے ماہنامہ "طلوع اسلام" میں طرح طرح کے شوشے چھوڑنے اور گل کترنے شروع کئے مرحوم نے "زمیندار" میں بھد اڑائی، کہا کرتے تھے بھئی واقعی بڑا احرام اللہ پہ ہے۔

امیر معاویہ متنازعہ فیہ شخصیت ہیں، فرمایا صحابی کے معنی کیا ہیں، رسول صلعم کی اطاعت کرے اور ایک مدت تک ساتھ رہا ہو، معاویہ فتح مکہ پر مسلمان ہوئے۔ اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا، بھاگ کھڑے ہوں یا اطاعت قبول کر لیں۔ ان کی ذات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے

مرحوم خدا اور رسولؐ کے عاشق تھے، قرآن اور حدیث پر بڑی گہری نظر تھی اسلامی تعلیمات کو بخوبی سمجھتے اور سمجھاتے تھے اور ان کا فرمایا ہوا مستند تھا غیر مستند نہیں نہجہ البلاغتہ کا اردو ترجمہ کرنے کے باوجود سنی العقیدہ تھے۔

ندوہ اور جامعہ سے نکلے تو مولویانہ تن و توش کے ساتھ ساتھ داڑھی سمیت بمبئی پہنچے، مولانا شوکت علی گھسیٹ لائے تھے، مگر جب اپنی پسند کی شادی کا مرحلہ آیا تو داڑھی مونچھ صاف کرانا پڑی، وزن گھٹانا پڑا، خاصے جامہ زیب تھے، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، بغیر کالر کی قمیض، اچکن، ناگرا اور پمپ، جاڑوں میں بہت کم نہاتے تھے۔ مگر جوڑا ضرور بدل لیا کرتے، کھچیڑا نامی دھوبی اس کا فائدہ یوں اٹھاتا کہ ذرا سی سلوٹیں

جو پڑ جایا کرتی تھیں تازہ دم استری سے صاف کرلاتا، اگر کبھی کوئی داغ دھبا ہوا بھی تو دو چار روز خود پہنتا تب دھوتا، جوڑے بیسیوں تھے خود نکال کر پہنتے اب اگر ٹھنڈی شیروانیوں کے جگہ جگہ سے دانت نکلے ہوئے ہیں اور انہیں کسی منتخب مجمعے میں جانا اور شریک طعام ہونا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ بدلوا سکے وہی پہن کر ٹھاٹ سے چلے جائیں گے یہی حال جوتوں کا تھا، دو دو چار چار گھِستے ان کی بھی خبر نہ لی جاتی، بے نیازی سی بے نیازی تھی، ہندوستان میں دہلی اور یہاں جناحی ٹوپی سر پر رہی جو تیس چالیس روپے سے زیادہ کی کبھی نہیں خریدی گئی، اور عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے اس کی نجات بھی ممکن نہ تھی بتیسیاں دو تھیں اور وہ باقاعدہ برش سے صاف کراتے، کسی ماہر نے بنا کے دی تھیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دانت مصنوعی ہیں، سردیاں اگر شباب پر ہوں تو شیروانی اور اوورکوٹ کے نیچے گرم کرتا اور گرم پتلون بھی پڑھا لیتے تھے، بند گلے کا سوئٹر بھی یہ لاہور میں ہوا، کراچی کے معتدل موسم میں اس کی ضرورت بھی کہاں تھی، کف اور گلے میں معمولی بٹن لگاتے اور وہ پیتل وغیرہ ہی کے ہوا کرتے تھے، ایک آدھ انگوٹھی ہمیشہ بائیں ہاتھ میں رہی اس میں ایک فیروزہ جڑا ہوا، کہتے تھے یہ میرے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے سگریٹ اور پان کے رسیا تھے، سگریٹ ہمیشہ بڑھیا پیتے، کریون اے مرغوب ترین تھا، لوہے کی الماری میں خاصا ذخیرہ مقفل رہتا، پاندان کا اہتمام اُن کے بس کا روگ نہیں تھا مگر گھر میں تھا، معمولی زردہ پھانک لیتے، چونا کتھا، بغیر دیکھے بھالے چاٹ لیتے لکھنے بیٹھتے تو سگریٹ سے اجتناب فرماتے، اس لئے کہ روانیِ تحریر میں روڑے اٹکاتا ہے، کبھی جلا بھی لیا تو پاؤں کے انگوٹھے میں اٹکا رکھا ہوا، پانوں کی ڈبیہ یا پڑیا پہلو میں رکھ لیتے اور جب قلم ہاتھ سے چھوڑتے تو کاغذ اور اگالدان دونوں کا پیٹ بھر چکا ہوتا شراب پینے والے کہاں تھے، دیکھی ہو اس کا بھی کیا یقین ہے دل کے ہاتھوں بے حال ہوئے اطباء نے دو گھونٹ پینے اور دورانِ خون تیز کر دینے کا مشورہ دیا، نہ مانے اور حرام کو حرام ہی سمجھا، البتہ پان اور سگریٹ کے معاملے میں بلا نوش اور بلا نوش تھے، اس پر بھی بات نہ بنی تو حقہ پینے لگے۔

خود تو شراب نہیں پیتے تھے مگر شرابیوں سے نباہنا جانتے تھے۔ رشید اختر ندوی ندوہ کے باقاعدہ سند یافتہ نہ ہونے کے باوجود ندوی لکھنے والے ان کے بچپن کے ساتھیوں میں ہیں خود بیڑی پیتے مگر اپنے محبوب دوست کے لئے قینچی مارکہ سگریٹ یاروں کی یلغار سے بچا کر رکھتے، رشید کراچی آنے کرائے کے مکان لیتے کرائے ہی کا فرنیچر ڈالتے، ہر روز ہر جگہ رئیس ان کے ساتھ، جاتے جاتے مالکان سے کہہ کر جاتے تو یہ جاتے کرایہ ہمارے دوست رئیس احمد جعفری سے لے لینا اور وہ بلا چون و چرا دے بھی دیتے آسمان نامی لڑکی نے ڈورے ڈالے، طرح دے گئے، رشید اختر کا پتہ بتایا وہ دو ایک مہینے جی بہلا کر لاہور جانے لگے تو ہم مذاق اور ہم مزاج مجید لاہوری کی گود میں ڈال گئے، انہوں نے نکاح کر کے گھر میں ڈال لینے کی حماقت کی اور اس کا خمیازہ بھی بھگتا، وہ اس پر بھی دوسروں کے پہلو گرمانے نکل جاتی، س واسطی نامی ایک لاہوری لڑکی نے بڑے طرح دار خط لکھے، جعفری بھرے میں آگئے، اشتیاق دید میں لاہور پہنچے، برگنزا ہوٹل میں اسے بلایا، دیکھتے ہی بدک گئے، قبول صورت بھی تو نہیں تھی وہ لڑکی، مدقوق اور بدصورت پنڈ چھڑانا کیسا بڑی ہمت دکھائی بڑی بے حیا نکلی، دست درازی کرنے لگی کمربند بچانا مشکل ہو گیا، تاہم وہ خوش فعلیوں سے باز نہ رہ سکی، مرحوم گھر کی لونڈیوں باندیوں سے چھیڑ خانیوں پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اس سے بھی آگے نکل جانے میں بیباک تھے مگر س واسطی کو چھونا دشوار ہو گیا، بکراہت بھی اسے قبول نہ کر سکے، یہ خطوں میں بے حد حسین نظر آنے والی لڑکی آبرو باختہ اور جنس زدہ ثابت ہوئی، اس کے خطوط کا بڑا ذخیرہ میرے ہاتھ سے نکل گیا، جسے جعفری صاحب نے بڑے سلیقے سے ایک فائل میں ترتیب دے رکھا تھا، کاغذات کے انبار کو اگر ٹٹولا جائے تو چند منتخب چیزیں اب بھی ہاتھ لگ جائیں گی، ایک ناول غالباً "سیما" س واسطی کے نام معنون بھی کیا گیا، یہ قصہ بہت چلا ایک بار تو اپنی بہن اور مجھے لے کر بیگم جعفری لاہور میں چھاؤنی کے علاقے میں س کے گھر جا دھمکیں، پتہ ریڈیو سٹیشن سے معلوم کر لیا تھا، وہاں جس نے بھی سنا ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی، وہ تو نہیں ملی، صورت

آشنا رہی ہو گی محسوس یہ ہوا ، ہے مگر ٹل گئی ہے ، بیگم نے اپنی جھلاہٹ کا نشانہ اس کی ماں
کو بنایا اور بے نقط سنا ڈالیں ، سنبھالو اپنی بیٹی کو ورنہ ٹانگیں توڑ دوں گی ، لڑ جھگڑ
کر ہم پلٹے اور پلٹ کر جو دیکھا خاصی دور تک ایک تانگے پر ہمارا پیچھا کیا گیا اور تانگہ روک
لینے کے اشارے دو نوجوانوں نے کئے ، مگر اب ہم نے عافیت اسی میں سمجھی جس قدر
برق رفتاری سے ممکن ہو نکل جانا چاہیئے . اس کا علم جب جعفری صاحب کو ہوا تو حیرت
زدہ رہ گئے ، کہتے تھے اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا بڑی حماقت کی تم لوگوں نے ،

اپنی غیر آبادی دلہن کو انھوں نے چھوئے بغیر طلاق دے دی تھی ، نکاح ہوا
اور غالباً رخصتی بھی ہوئی ، بمبئی میں بے حد حسین نوخیز لڑکی سے جسے وہ کندھوں
پر بٹھا کر سیر کرایا کرتے تھے شادی کی ، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا رفیع احمد جعفری حیات
ہیں اور بیگم بھی ، میں اگر نہ ہوتا تو رفیع احمد انیس احمد جعفری ہوتا ، اکلوتے بچے کے جس
قدر ناز نخرے ہونے چاہئیں وہ میں نے اس گھر میں نہیں دیکھے ، ایک بار تو ایسا ہوا چھ
برس کا رفیع تین چار سو میل کا سفر کر کے میرے ساتھ میرے گاؤں میں آگیا ، پھٹی ہوئی ڈیڑھ
روپے کی باٹا کی لبریاں ، کپڑوں کا ایک ہی آدھ جوڑا ، بیوی نے ایک ریشمی جوڑا بنایا موتی
ٹانکے ، میں جوتا خرید لایا ، گھر میں سلیقہ ہو تو غربت میں بھی بھرم رکھا جا سکتا ہے ، مگر
جعفری نہ کماتے ہوں نہ کماتے ہوں تو تین چار ہزار روپے ماہانہ ضرور کما لیتے تھے ،
بلکہ اس سے بھی زیادہ ، وہ لٹاتے تھے مگر ذرا قرینے سے ، بیوی پھوہڑ ہوں تو کوئی کیا
کرے ۔

قالین نہیں ہیں ، کرسیاں بھدی اور بد وضع ہیں ، صوفے اگر خرید لئے جائیں
تو کیا مضائقہ ہے ، خوش رنگ پردے لٹکائے جائیں تو بھلے لگتے ہیں ، ریڈیو بھی
گھر کی زینت اور ضرورت ہے اور مکان اپنا نہ سہی کرائے کا ہو ، ہو تو ڈھنگ کا ،
مرحوم ان سب بکھیڑوں سے آزاد تھے ، وہ تو تخت پر بیٹھ کر لکھتے اور اسی پر قیلولہ
فرماتے ، یا پھر مسہری سے کام چلاتے ، ایک قطعہ زمین پیر الٰہی بخش کالونی میں ہاتھ
آیا تو اسے بھی تین ہزار روپے میں بیچ کھایا ، بیوی جلتی اور کڑھتی رہتیں ، طرح طرح

سے مادی ضروریات کی تکمیل پر اکتاتیں، مگر میاں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے، یہ تو نہیں کہ وہ کر نہیں سکتے تھے، کر سکتے تھے مگر ان سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ کھانے کی میز اور کرسیاں ہی آجاتیں، ایک صوفہ سیٹ بیوی کہیں سے قرض لے آئیں، ادا نہ ہوا اور اس علت میں کمرہ بھر بھائیں بھائیں کرنے لگا، فریئر روڈ پر دوسری منزل کے فلیٹ میں تین کمرے تھے، کمرہ استقبالیہ رات کو سونے کا کمرہ بن جاتا، پیر الٰہی بخش کالونی میں صرف دو کمرے، برآمدے کو جالیاں لگا کر دو ڈربوں کا اضافہ کر دیا تھا، نل اور بجلی غائب لکھنو میں رہے، دلی میں بسیرا کیا، بمبئی کو گھر بنالیا۔ مگر ان کی خیر آباد یت گئی نہیں، طبعاً گنوار ہی رہے، جدید طرز بود و باش سے زیادہ مانوس نہ ہو سکے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان معاملات میں وہ خاصے جزرس اور بخیل تھے، الغرض گھر بھر میں جسے گھریلو آسائش کہنا چاہیئے کسی کو میسر نہ تھی، میاں نرے کھرے ادیب ہی تھے اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، وہ تو جنسی وظیفہ تک نہایت شائستگی سے ادا کرتے تھے "جھنجھوڑنا اور جھنجھوڑا گیا" تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے، جنسی ناآسودگی کے ساتھ ساتھ جسمانی راحت و آرام کے فقدان کا نفسیاتی ردعمل یہ ہوا کہ بیوی کھڑکیاں بے در پردہ بیگانہ کر گیا، اس میں بے پناہ شہرت پسندی اور پیدا ہو گئی تھی کہ یہ شادی میں نے تو نہیں کی یہ تو یک طرفہ ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ بیگم نے تاک کر نشانے پھر بھی نو عمروں پر نہیں لگائے ادھیڑ ہی تختۂ مشق بنے، ایک ڈاکٹر، ایک حکیم، ایک جج صاحب، یہ تو وہ ہیں جن کے والہانہ مراسم تھے

[redacted]

کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

جج [redacted] سے روز کی ملاقاتوں نے معاشرتی اور معاشی سطح کسی قدر بلند کر دی تھی، آگے چل کر تو [redacted] وہ خیالی صاحب کے حاشیہ بردار ہو کر رہ گئے بیوی بچوں کو

[redacted]

[redacted] لاہور سے کراچی اور کراچی سے لاہور موٹر میں سوار کرا دیئے اور یہ قافلہ ملتان بہاولپور وغیرہ کے مرکٹ ہاؤسوں میں شب باش ہوتا ہوا منزل مقصود تک پہونچتا، ایسے ویسے نہیں نہایت سنگین حالات سے بچ نکلتے کوئی

شاید مرتبہ ہی گر سنا ہے ... جعفری مرحوم نے یہ مجموعہ ۱۵۰ ... [illegible]

[redacted] گر گئے گا،

ہم سفروں کی کانا پھوسی جہاں گنتی کے چار آدمی سفر کر رہے ہوں راز تو نہیں رہ سکتی، یہ تم ہر اسٹیشن پر اتر اتر کر کیا دیکھتے ہو، چلو آرام سے بیٹھو، آرام سے بیٹھوں، ادھر آئیں تمہیں ایک شعلہ رو کے درشن کراؤں، حضرت بھی ان کے پیچھے پیچھے، اور جب وہاں پہنچے تو اپنا ہی گریبان تھا، یہ لطیفہ جعفری صاحب مرحوم نے خود گھر بھر کو سنایا، اس میں کوئی شبہ نہیں آفتاب بیگم رئیس احمد جعفری فی الواقعی آفتاب ہی ہیں، خوبصورت تو خیر وہ ہیں، کاٹھی کچھ اس ڈھب کی ہے چھوٹی بہن تو کجا بیٹیوں اور ماں میں کچھ یونہی سا فرق رہ گیا تھا، مگر یہ کیسی روح فرسا حقیقت ہے کہ یہ آفتاب اب روبہ زوال ہے۔

مالک مکان ہر مہینے مکان خالی کرنے کی دھمکی دیتا، کرایہ زیادہ دو یا مکان خالی کرو، مکان کیا خالی کرتے، کرائے میں اضافہ ہوتا رہا، بس اسی ادا پر الٰہی بخش صاحب خمیاتی لہلوٹ ہو گئے، واللہ کیا سادہ لوح کراچی میں بستے ہیں، اجازت لے کر مالک مکان کے خلاف مقدمہ کھڑا کر دیا، اچھے وکیل تھے دلبوچ لیا، جعفری بے حد متاثر ہوئے، کسی جانے گھر یہ بلا لیا، [redacted] چھوٹے بڑے سبھی بچے جاتے تھے، وہ کیوں پیچھے [redacted] رہتے بیگم صاحب کو دیکھتے ہی سدھ بدھ کھو [redacted] کے کوٹھے کا خیر لور ہاؤس انہی کے توسط سے جعفری صاحب کے [redacted] لیے مخصوص ہوا [redacted]

اور تقدیر دل ہار بیٹھے

نوٹ: فون پر دل کی باتیں کرنے میں حجاب ذرا کم ہی محسوس کیا جاتا ہے

اٹارنی جنرل سے عدالت عالیہ کے جج بن گئے، موٹر پر جھنڈا نصب ہوا، جھنڈے کے لہرانے سے دلوں میں لہر اٹھتی تھی، لاہور کے ٹیگور پارک میں معزز مہمان کی آمد پر ہر شخص مودب کھڑا تھا، کھانا ہوا، ہاتھ بڑھا کر اٹھے، میں لوٹا لے کر آگے بڑھا، معاً فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے آپ سید ہیں، میں سید سے ہاتھ نہیں دھلوانے کا [redacted]

مگر یہ کیا کر دو مہرے ... ڈال دیا عورت ایک معمہ ہے سمجھنا نہ سمجھانے کا ہے ... [illegible]

... میاں کو تنہا چھوڑ چھاڑ کراچی جا کر دم لیا۔

صبح ہوئی پورا گھر جاگ رہا ہے صاحب خانہ ظاہر ہے نو بجے سے پہلے بیدار نہیں ہونے کے۔ بیگم صاحب منہ اندھیرے

[redacted]

معرکہ ہوا خوری میں ساتھ دو دو میں اگر کترا جاتی تو کسی کے حکم سے سرتابی کہاں ممکن تھی اور ہم بلا کشان
محبت دو چار سڑکیں پھلانگ کر جنبش عیسائی کے محل نما بنگلے کو جا لیتے، میں تو ایک

[redacted]

بھیگی بھیگی پلکوں
[redacted] صاحب اگر
دو ایک بچے شریک

اونگھنے لگتا البتہ گھنٹے ڈیڑھ بعد چائے، بسکٹ کا اعزاز بخشا جاتا جہاں
کونے میں دبک کر
اور ہیر نہ لگا ہوں کا سنبھالنا اور چہرا نا لطف دے جاتا" شام کی نشست میں جعفری
کراچی میں جب ہیں تو وہ خود، بیگم صاحب، بیگم کے بہن بھائی یعنی جعفری صاحب کے سالے سالی
ہوتے کھانا کھاتے اور رات گئے تک پلٹتے

بنائے جانے لگے
ممکن نہ تھی یہ سچ ہے
وانی، اپنے فرائض
[redacted] ہمہ گیری پائی

جج صاحب کا جادو اس قدر سر چڑھ کر بولا کہ منصوبہ میاں کو ختم ہی کر ڈالنے کے
بجے معتمد جان کر مشورہ کیا گیا بلکہ تم ہی کسی طرح یہ قصہ پاک کر دو نا" اب مجھ سے منافقت
وہ عدالت عالیہ کے جج ہیں ان کی کار پر پرچم لہراتا ہے پر خوشامدیاں روپے پیسے کی فرا
منصب سے عہدہ برآ ہوئے اور سبکدوش کر دیئے گئے مگر ایک عالم ایک ادیب میں بلا کی
جاتی ہے وہ

[redacted]

کبھی مرتا نہیں، اس کی تحریریں ہر دور میں اسے زندہ رکھتی ہیں، اس کا پیغام ہر دور میں
قابل قبول ہوتا ہے، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس کا تجویز کردہ لائحہ عمل ہر گھڑی
آپ ... کرنے کے در پے ہیں تو شوق سے طلاق لیجیے [redacted] کراچی دنیا الگ بعد لیجیے مجھے
دعوت عمل دیتا رہتا ہے

خیسانی سے
ہوا ایسا شدید
جدائی تو نہیں
گئی

دیکھ کر واقعہ یہ ہے کہ روحانی تعلق زور صدمہ ہوتا ہے وہ ہر لحاظ سے
جعفری کی امانت میں خیانت ہوتے
عجیب سی لگ گئی جیسے لٹک گیا اعتماد متزلزل ہی نہیں
برتر ہیں، بیگم پروس کا ہر ... آواز آئی بھی تو یہ آئی ہماری کوئی
دیکھا لگا جس سے بے شمار دراڑیں پڑ گئیں قبر میں سے
ہے نہ ہو مگر اسے اچھائی کون کہتا ہے میرے اور بیگم کے تعلقات میں ایک خلیج سی حائل ہے
جعفری

[redacted]

صدا ... نہیں

[redacted]

وہ میرا اٹھارہ سے بیس برس کی عمر کا زمانہ تھا، جسمانی اور ذہنی ارتقا ہی نہیں انتشار
کا بھی دور دورہ تھا، بلوغ عقل کی نوبت کب آتی ہے، مجھے کیا کسی کو نہیں معلوم، کمسنی میں بھی اتنا ہوش بہرحال
تھا، اے کاش میرا کردار اس کم عمری کے باوصف بہتر ہوتا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا پڑتا ہے جو کچھ کیا با دل نخواستہ
[redacted] پہ مشقت
گیا میں بیگم جعفری، خیسانی تعلق خاطر پر لوٹ گئے میں تنہا منکر تھا دل پر جبر کر کے ابھی نہیں
جبری لی گئی بہرحال لی گئی اس جرم کی سزا زندگی بھر کے مسلسل کرب کی شکل میں میرے سینے
میں ترازو ہے
[redacted] زندگی بھر کے مسلسل کرب کی شکل میں میرے سینے میں ترازو ہے۔ بڑی حماقت ہوئی
[redacted] وہی میری ذہنی علالت، اس وقت میرے پھیپھڑے بھی
تو مجروح تھے، خباثت نفس کہ ہر ذی روح کا حصہ ہے اس کی زد میں آگیا، بیچ کھیت
انداز میں لکھا آپ سب کچھ جانتے، لوچھے خیسانی کا دامن چھوڑتے کیوں نہیں
نہایت بھونڈے [redacted]
[redacted] جواب روح فرسا آیا "تم یہ کیوں نہیں [redacted] سمجھ لیتے کہ میں مر چکا ہوں مُردوں سے نہ گفتگو کی جاتی ہے نہ خط کتابت"
[redacted]
مسلسل تین میں نے بیٹے بھر [redacted] کے کرم فرمی دکھائی "ایک خط اور لکھ مارا" برافروختہ ہوئے "پیترا بدل کر
ترا شیاں چار خطوں میں عاشق اپنی محبوبہ کی صفائیاں پیش کرتا رہا اور میں جواب الجواب (الزام)
علاج بھاگور [redacted] اعتراف واقعہ کے باوجود یہ بھی کہ وہ جو تمہاری سترسالہ ماں ہیاں بغرض
کے لیے میرا [redacted] پارک میں گل کھلا گئی ہیں اس کا کیا کرو گے، چاہتے تھے ٹھوس ثبوت" اس
ظاہر کی مگر کراچی جانا ضروری تھا ان کا بھی، میں نے حامی بھر لی آمادگی انہوں نے بھی
فراہم کردہ کچھ سوچ کر ان سطور پر خط کھینچ دیا جو میری نگاہوں سے بچ کر نکل سکیں، ان کے
وہاں بانو مگر خط کشیدہ ہے، پر جب وہ لاہور سے کراچی پہنچے میں نے لکھا بھی مگر میں سمجھ کر ہوں
سے بہلا دیے گئے اور تحقیق اور تجسس کی چنگاری فریب نظر کی راکھ میں دب گئی
[redacted]
[redacted] تجسس کی چنگاری فریب
نظر کی راکھ میں دب گئی
خیسانی کھلے بندوں رقیب روسیاہ، یہ بیچارے انجان بنے رہتے، سب کیا دھرا اپنی تغافل شعاریوں ڈھیل اور
[redacted]
بغرض دری رواداری کا نباہ کیسے نہیں، طاہرہ رشتہ مہر و مودت ٹوٹا نہیں ہاں تی رہا مگر آشفتہ دل

عبارآلود کہاں چکنا چور ہو چکا تھا یہ مصنف بے بس ۵۹؟ اور خاموش تماشائی تھے مرمر کے جیتے رہے کسی [redacted] سے کچھ نہیں سکتے تھے فریب کھاتے اور دیتے رہے،

لکھتے وہ بہت تھے، قلم میں بے پناہ روانی تھی، اسلوب بیان سادہ، پرکار نہیں جو کام آپ ایک دن میں کریں گے جعفری صاحب ایک گھنٹے میں کردیں گے اور ایسا کہ آپکو کہیں انگلی رکھنے کی حسرت رہ جائے گی، ہر موضوع پر لکھ سکتے تھے اور لکھا بھی، لوگ کہتے ہیں ان کا اجالا مانگے کا تھا، قینچی مار مشہور تھے، معمولی منشیوں کی چیزیں اپنا نام ڈال کر اشاعت کے لئے دے دیتے تھے/ یہ سراسر بہتان اور جھوٹ ہے، رات گئے تک تین تین چار چار بجے لکھتے میں نے دیکھا ہے، شب بیداری معمول بن کر رہ گیا تھا، بلکہ یہ بھی ایک اصول تھا، کام حد سے بڑھ جاتا اپنے مجذوب دوست سے ترجمے کراتے نوک پلک خود درست کرتے سعید اشرف ندوی بلاشبہ مجذوب ہی ہیں، میرے سامنے دس برسوں میں اتنا کچھ لکھا کہ اگر تصانیف چن دی جائیں تو قبر تیار ہو جاتی، بیکار کبھی نہیں رہے، میں ایک بار گستاخ ہوا تھا، یہ آپ کیا خاموش بیٹھے رہتے ہیں لکھئے تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، فرمایا مواد سمیٹ رہا ہوں اور یہ واقعہ بھی تھا جب لکھنے بیٹھتے تو رات رات بھر لکھتے، ترجمہ عربی ہو یا انگریزی بے تکان کرتے تھے جرجی زیدان کا ایک ناول تین چار نشستوں میں املا کرا دیا تھا، طریقہ یہ تھا کہ کتاب ہاتھ میں لے کر نیم دراز ہو جاتے اور اس روانی سے املا کراتے گویا عربی نہیں اردو مواد پیش نظر ہے، میرا ہاتھ شل ہو جاتا وہ تازہ دم رہتے، لکھتے وہ ظاہر ہے پیٹ کے لئے تھے، اچھے برے کی قید تو تھی مگر ایک معیار جسے کہنا چاہیئے وہ میں سمجھتا ہوں نہیں تھا کوئی معرکے کی تصنیف مرحوم نے یادگار نہیں چھوڑی تاہم بحیثیت مجموعی ہر موضوع پر اتنا مواد چھوڑ گئے ہیں کہ اہل پاکستان اور اردو دنیا نظر انداز قطعاً نہیں کر سکتے، سینکڑوں کتابوں کے مصنف کا آج بظاہر کوئی نام لیوا نہیں ہے حالانکہ اس کی تحریریں سوچنے سمجھنے کی تحریک پیدا کرتی ہیں،

محمد علی اکیڈمی کے قیام کے بعد تحریک پاکستان سے متعلق "اوراق گمگشتہ" خاصے کی چیز شائع کی۔ اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی "انڈیا ونز فریڈم" کی

تلخیص اور ترجمہ کیا، وہ کانگرسی ذہن کا شاخسانہ تھا، جعفری مرحوم نے مسلم لیگی نقطۂ نظر سے جواب ترکی بہ ترکی دیا، ہندو اور کانگرس کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا، "زرڈ اکومنٹس" علی برادران، اوراقِ گم گشتہ کشمیر اور جونا گڑھ کی کہانی، حیدرآباد جو کبھی تھا، آزادیٔ ہند حیاتِ قائدِ اعظم، خطباتِ قائدِ اعظم، یہ سب مختلف نہیں ایک ہی سلسلہ ہے دید وشنید مختصر چہرہ نمائی کی ایک نئی چیز اردو ادب میں رئیس کے قلم سے نوش نما اضافہ تھا، اربابِ نشاط میں فلمی شخصیتوں کی نقاب کشائی کی گئی تھی وہ غیر مطبوعہ ہے مجھے انتساب یاد رہ گیا ہے۔

رشید اختر ندوی کے نام جنہوں نے سومناتِ فلم پر تیرہ حملے کئے

اس پر بھی بیچارے کو منہ کی کھانی پڑی، محمود غزنوی نہ بن سکے، جہاں تک میں نے دیکھا ہے رشید اختر بدنیت انسان ہیں، عورت اور نوعمر لڑکے ان کی کمزوری ہیں عورتوں کو لوٹتے اور [redacted] صنفِ کرخت اور صغیر السن نوعمروں سے [redacted]، یہ ہنر اُن میں بے مثال ہے [redacted] رہے ہیں

کی متضاد [redacted] صفات اس احمہ صفت موصوف میں بدرجہ اتم موجود ہیں، بات کہاں کہاں اور چلی گئی "دامانِ باغباں" ایک اور مجموعہ ہے جس کی اشاعت کی منتظر ہے نگاہ، یہ بھی میری نظر سے گذر چکا ہے، سیاسی شخصیتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے داغ دھبا کسی چہرے پر نہیں پایا گیا، لیپا پوتی ہر ایک کی کر ڈالی، مگر ایوب کی فوجی حکومت نے نقشہ ہی بدل ڈالا، اسکندر مرزا کی شرافتِ نفس کے جو پل باندھے گئے تھے مسمار کرنے پڑے اسی طرح دیگر اربابِ اقتدار کی نقاب کشائی اور کہیں پردہ داری کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ فوری طور پر مرحوم سے غالباً ممکن نہ ہو سکا،

قلم بہت عمدہ پارکر شیفرس رکھتے اور دو دو تین تین، لکھتے لکھتے ایک کی زبان خشک ہو جاتی تو دوسرا اٹھا لیتے، نیلی نہیں سیاہ نہیں ہری روشنائی پسندیدہ تھی اور وہ بھی بڑھیا، البتہ کاغذ کی کوئی قید نہ تھی، ردی سے ردی کاغذوں پر پوری پوری کتابیں لکھ ڈالتے، قلم روک کر لکھتے تو ان کا یہ فرمایا ہوا مستند ہی نظر آتا تھا کہ انہوں نے کتابت باقاعدہ سیکھی تھی، مگر کثرتِ کار نے گھسیٹ نگار بنا دیا تھا صرف ایک کاتب محمد علی یا علی محمد جو

بمبئی سے ان کے مسودات کی کتابت کر رہے تھے پڑھتے اور صاف لکھتے ورنہ عام طور پر مجھے یا تنخواہ دار منشی کو صاف صاف لکھنا پڑتا ہم اس کے عادی ہو گئے تھے کہ وہ جو کچھ جس انداز میں بھی لکھیں کہیں اٹکے بغیر پڑھ لیں،

سیاسی سمجھ بوجھ بھی بہت اچھی تھی، اول و آخر مسلم لیگی تھے، مخلص اور بے ریا بمبئی کے انقلاب، خلافت، کراچی کے خورشید، انجام، ریاض، لاہور کے زمیندار اخبار میں پاکستان کے لئے بہت کچھ لکھا، سیاسی حلقوں میں پذیرائی قطعاً نہ ہوئی، اول تو یہاں مزاج سیاسی تھا ہی نہیں، صفِ اول میں انگریزی کلر کی کرنے والا طبقہ ایک ہی جست میں رہبر عوام پاکستان بن گیا، وہ ان کی خدمات سے بے خبر اور یکسر بیگانہ، خوشامدی اور چاپلوس یہ بھی زیادہ نہیں تھے، قلم ان کے ہاتھ میں تھا جب بھی ضرورت پڑتی بلا جھجک اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے، پاکستان اور مسلم لیگ ہی کی یاداش میں بمبئی سے نکالے گئے، مرارجی ڈیسائی نے دیس نکالا دیا، یہ بمبئی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، نیا پریس انگلستان سے منگوا لیا تھا وہ بندرگاہ پر ہی پڑا رہا، اپنے موقف پر سختی سے جمے رہتے اور جب تک دلائل و براہین سے کوئی قائل نہ کر دے کسی کو خاطر میں نہ لاتے، صاف اور سادہ زبان لکھتے، ہر شخص پڑھ کر بات کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔ ابوالکلامی اردو وہ نہیں جانتے تھے۔

لکھنے پڑھنے سے وہ کہیں نہیں چوکتے تھے، بیت الخلا میں بغیر اخبار کے جانا ممکن ہی نہیں تھا، یہ بھی ایک لطیفے سے کم نہیں کہ روزنامہ زمیندار لاہور کے تقریباً تمام اداریئے بیت الخلا ہی میں لکھے گئے، مگر وہ خوبو جو اس مقام سے مخصوص ہے ان اداریوں میں نہیں پائی جاتی، صبح ہی صبح ادھر چپراسی آیا ادھر وہ کاغذ قلم سنبھال کر پہنچے مرزا صاحب کے حضور بے تکلف قادیانی احباب کو اڑانے اور چڑھانے کے لئے انہوں نے مرزا صاحب کی اصطلاح گھڑ رکھی تھی، جب بھی بیت الخلاء جانے کی ضرورت پڑتی، کہتے: بھئی ہم تو چلے مرزا صاحب کے ہاں،

فرمائشی مضامین بھی لکھا کرتے تھے، غلام علی اینڈ سنز اور تاج کمپنی کے لئے

The "REYAZ" Monthly.

ماہنامہ ریاض

آرام باغ روڈ کراچی

ARAMBAGH ROAD,
KARACHI.

مورخہ .... Dated, 8.12.53

عزیزی — السلام علیکم۔

تمہارا خط ملا! —— ابھی ابھی فرصت ہوئی ہے

پڑھ کر دے!

میں نے مولانا ابوالکلام کو سمجھا ہے، اتنی [illegible]

یہ تھا کہ ابوالکلام صاحب ایک "نبی" کی طرح [illegible]

[illegible] اور یہ لفظ [illegible]

ابوالکلام صاحب [illegible] مجھے بہت ہی [illegible]

ابوالکلام صاحب ہر حیثیت سے [illegible] ([illegible])

[illegible] یہ لفظ ہے! ——

—— میرا اب [illegible] ارادہ تھا!

—— تم میرا کہا [illegible]

[illegible]

بھولی، جب تمہارا ذکر ہوتا ہے، میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں

آنکھوں سے آتی ہے کہ " بڑا پیارا دیکھ، میں

رنیت ہم بہاری جادو گھا!"

تب جب ہم سے زیادہ بچوں سے

" زحمت " ہے۔

دعا

[illegible]

[illegible]

بعض مذہبی کتابوں کے دیباچے لکھے، پبلشروں کے نام سے شائع ہوئے، جسٹس کھیسانی کو لاہور کی ایک ادبی نشست میں بلایا گیا، جعفری صاحب نے حق رفاقت ایک شستہ مضمون لکھ کر ادا کیا، یہ مضمون "نوائے وقت" میں کھیسانی کے نام سے شائع بھی ہوا، حکیم محمد سعید کے "یورپ نامہ" اور "جرمنی نامہ" وغیرہ کی زبان بھی مرحوم ہی درست کرتے رہے ابراہیم جلیس سے روایت ہے ایک مقالہ اے کے سومار کے لئے بھی سپرد قلم فرمایا۔

بمبئی سے ہجرت کرکے جب کراچی وارد ہوئے تو اسّی ہزار روپیہ جیب میں تھا۔ آتے ہی ایک روزنامے کا ڈول ڈالا، خورشید نام تجویز ہوا، بمبئی کی ہوا بھری ہوئی تھی، آجکل کے مولانا، اسمٰعیل ذبیح نے پیٹ بھر کے لوٹا، غالباً سال بھر کی عمر پائی اس اخبار نے مجید لاہوری نے بھی اس میں کام کیا، اس کے بعد ایک اشاعتی ادارے "تاج آفس" سے منسلک ہو گئے" یہ تمام ہوا تو ایوانِ اشاعت ایک دوست کے اشتراک سے قائم ہوا۔ دو چار کتابیں چھپوائی بھی گئیں، دکان کی بکری برائے نام ہی رہی، اسی زمانے میں ماہنامہ "ریاض" کا اجرا ہوا، یہ ایک سنجیدہ ادبی رسالہ تھا، سیاست پر بھی طبع آزمائی فرماتے، تین برس یہ چلا اور دو ایک بہت ہی اچھے نمبر یادگار چھوڑ گیا، مثلاً سید سلیمان نمبر، شوکت علی نمبر اگر لاہور منتقل نہ ہو گئے" ہوتے تو یہ پرچہ تیجانے اور کیا گل کھلاتا، پورا مجموعہ عبیر کتب خانے میں محفوظ ہے۔

کراچی سے پہلی بار سیاحت یا سعی واسطی کے چکر میں نکلے تو لاہور میں ظفر علی خاں کا "زمیندار" گور کنارے موجود تھا، اختر علی خاں نے زبردستی ٹانک لیا، اور بغیر اجازت اعلان بھی کر دیا یہ سنبھالا اخبار کے دو چار روز اور بڑھا گیا، بعد میں شورش کاشمیری نے بھی اس تنِ مردہ میں " نئی روح پھونکنے کی کوشش کی مگر بے سود، لاہور ناشروں کا گھر اور منڈی ہے، مسلمہ ناشر غلام علی اینڈ سنز بھی یہیں تھے اور خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم نے بھی ادارہ ثقافت اسلامیہ کی رکنیت کے لئے منتخب کر لیا، یہ لاہور کے ہو رہے، مرکز کراچی ہی کو رکھا، یہ کچھ تو ان کے اپنے دل کی بات تھی کچھ ان کی بیگم کا اصرار بھی تھا، اس طرح اخراجات دوہرے تو ہو گئے مگر وہ جھیلتے رہے اور!

ناول مرحوم نے بھی بہت سے لکھے ایہ سارے ڈھیر کے ڈھیر، ایم اسلم کا پلہ بھاری تو پڑے گا مگر کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں، ایم اسلم جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ایک مقصد لے کر قلم اٹھاتے ہیں، جعفری صاحب پیسے کھرے کرنے کے لئے قلم چلاتے تھے، اس لئے عشق و محبت کے فرسودہ قصوں سے بات آگے نہ بڑھی، کوئی انقلابی قدم اس میدان میں ان سے بھی نہ اٹھ سکا، تاہم بعض جاندار چیزیں بھی مل جاتی ہیں مثلاً چنگاری، ایک اور ناول چاندنی کے باب میں کسی نے لکھا ہے کہ یہ خود ان کی آپ بیتی ہے، اور یہ کچھ اچنبھے کی بات نہیں مرحوم فلمی دنیا سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اور وہاں خوب خوب داد عیش دے چکے تھے گلچھرے اڑانا صرف محاورہ نہیں حقیقت بھی ہے، ناول لکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ذرا جیب ہلکی ہوئی اور ایک ہزار روپیہ کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی ناول کا آجاتا۔ البتہ ثناء اللہ بھٹہ جیسے پبلشروں نے ناول تو دس دس پندرہ پندرہ میں بیچے، جنھوں رات کا کھانا پوری پلیٹن کے ساتھ ڈکارتے رہے، معاوضہ رلا رلا اور رو رو کر دیا اور وہ بھی پورا سارا نہیں، دو بار تو میں بھی بیگم جعفری کے ساتھ تقاضے کے لئے بھٹہ کے ہاں ریلوے اسٹیشن کے "بک اسٹال" پر گیا اور تلخ کلام ہوا

غلام علی اینڈ سنز اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے تنخواہ دار تھے، باقاعدہ معاہدہ ہوتا ماہانہ تنخواہ ملتی، سال بھر میں چار یا شاید چھ کتابیں پیش کرتے، بہادر شاہ ظفر بھی اسی لپیٹ میں آگئی، جیسی چاہیئے تھی ویسی چیز نہیں ہے، ناشر چونکہ مالدار تھا زبردست مشتہری اور چلتے ہوئے کاروبار کی بنیاد پر نکال لے گیا، ادارہ ثقافت اسلامیہ میں حسن کارکردگی اور حسن اخلاق کو دیکھ کر خلیفہ صاحب نے منیجر بنا دیا، مگر ان کی نیک نامی اصول پسندی اور دیانت داری کو ان کے مصاحبِ خاص حسین الزماں نے بٹہ لگا دیا، یہ حضرت ناٹے سے چیچک زدہ کریہہ الصورت خبیث الفطرت انسان تھے زبان میں موہنی تھی مصاحبانہ گُر جانتے تھے، بڑے حاضر باش حاضر جواب حاضر دماغ، دونوں ہاتھوں سے ادارے کا روپیہ اپنی ذات پر لوٹ کر لگا لیا، یہ حرکتیں چھپنے والی نہ تھیں، چہ میگوئیاں ہونے لگیں، جعفری صاحب کے اعزاز و اکرام پر ناخوش حضرات لگائی بجھائی کرنے لگے خلیفہ

کے کان بھرے جانے لگے، ہزاروں روپے کا خسارہ ہی نہیں غبن کھل کر سامنے آگیا جعفری مرحوم کے غیر ضروری اعتماد اور بے خبری پر یقین کون کرے گا، ان کے گویا نفس ناطقہ تو بے اعتدالیوں میں پیش پیش ہوں اور یہ قدر دونوں میں مشترک نہ ہو، ناچار علیحدگی کا ارادہ کرلیا، خلیفہ عبدالحکیم کی شرافت اپنا کام کرگئی۔ گریہ بہ الزماں نکالے گئے، مرحوم کی رکنیت بحال رہی، دیگر ذمہ داریوں سے سبکدوش کردیئے گئے اور یوں ایک اچھا خاصا شریف آدمی نکو بن کر رہ گیا، پیٹ کا معاملہ تھا اور بال بچوں کا ورنہ یہ ذلت برداشت کرنا کچھ آسان نہ تھا، حسین صاحب دو تین مہینے کراچی کی سیر دیکھ کر پھر لاہور آگئے۔ ادارے سے تو نہیں جعفری صاحب سے نتھی ہو گئے اور مرتے دم تک ساتھ رہے، یہ ٹھگنا بے پناہ صلاحیتوں کا حامل تھا۔ خوش مذاق ایسا کہ روتوں کو ہنسا دے، معاملہ فہم ایسا کہ ایک ہی نظر میں بات کی تہہ تک پہنچ جائے، بلا کا دور اندیش، تیز طرار، جفاکش ایسا کہ ذرا اپنے ممدوح کی طبیعت ناساز دیکھتا رات بھر پلنگ کی پٹی سے کرسی لگائے خراٹے لیتا رہتا، کئی کئی راتیں کرسی پر گذار دیتا، پڑھا لکھا اور سخن فہم، بس عیب تھا تو یہی، بدنیتی اور ریاکاری، بیگم جعفری بہت جلتی کڑھتیں مگر بے بس تھیں، میاں کی ناک کے بال تھیں تو سکتی تھیں اکھاڑتے کا بوتا کہاں تھا ان میں

اپنے مضامین میں اشعار بھی ٹانکتے تھے، شیفتہ کا ایک شعر بہت پسند تھا، مگر بے دردی سے جھٹکا کرتے مشہور شعر ہے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

جعفری مرحوم کا تصرف دیکھئے -

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جھٹکے سے

میں نے ٹوکا بھی مگر وہ اپنی اصلاح نہ کرسکے۔ کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے۔

غزل

دل کے قرباں خوب چیز یہ ہے ‫—‬ ایک فتنہ ہے اک قیامت ہے
پوچھتے کیا ہیں آپ حال میرا ‫—‬ مہربانی، کرم، عنایت ہے
آپ کی یاد آپ کی باتیں ‫—‬ ہم کو حاصل یہی تو نعمت ہے
بس سنے جائیں اور کچھ نہ کہیں ‫—‬ یہ تقاضائے رسم الفت ہے
تجھ سے آنکھیں ملا کے بات کرے ‫—‬ کس میں یہ حوصلہ یہ ہمت ہے
آپ کا لطف آپ کا اخلاق ‫—‬ دل ناچیز کی یہ قیمت ہے
ان کو چاہا تو چاہ بھی نہ سکے ‫—‬ کتنی چھوٹی سی یہ حکایت ہے
نام ان کا لے نہیں سکتے ‫—‬ ہائے یہ عشق بھی مصیبت ہے

میکدہ میں رئیس ملتے ہیں
اڑتی اڑتی سی یہ روایت ہے

روزنامہ "زمیندار" لاہور میں فکاہات کے عنوان سے ایک کالم میں ناظر تخلص کرتے اور طبع آزمائی فرماتے،

مرحوم اپنی دالی کوشش ہوا کا رُخ دیکھ کر چلنے کی بھی کیا کرتے تھے، اس کا زور لاہور میں بندھا، کامیابی بھی ہوئی ایوب خان کی تقریروں کا ایک پلندہ محمد علی اکیڈمی نے شائع کیا، ادبی تمغہ خدمت ملا، تمغے کے ساتھ ساتھ پانچ دس ہزار نقد چہرہ شاہی بھی وصول کیا، گھر میں چاہے شور قیامت ہی کیوں نہ برپا ہو وہ لکھتے رہتے تھے، بیک وقت دو دو تین تین کتابیں زیر قلم رہتیں، تحریک پاکستان خاص موضوع تھا، خود بھی لکھا اور انگریزی سے ترجمے بھی بہت سے کر ڈالے، ترجمے کی افادیت حاشیہ آرائی سے بڑھائی، ہندوستانی مورخین کی تردید یا تصدیق کا فرض بھی بخوبی ادا کیا، مسلم لیگ کی گویا تاریخ تھے، کٹر مسلم لیگی تھے، جب یہ دیکھا جوش ملیح آبادی جیسے منکرینِ پاکستان لوٹ کھسوٹ کے لیے ترک وطن کیا چاہتے ہیں تو "زمیندار" میں مسلسل کئی اداریے سپرد قلم فرمائے، مولانا نے دریاباد نے بھی لکھنؤ سے ایک خط میں جوش صاحب

کے لیے جعفری صاحب کو ایک عنوان تجویز کر دیا تھا وہ پیارا سا عنوان ایک مصرع ہے۔

ع تو برونِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

سندھ اور پنجاب میں سیدوں اور شاہوں کی بڑی خاطر داریاں ہوتی ہیں، سید اور شاہ کا دم چھلّہ کہیں زندگی کرنے کے لیے کافی وشافی ہوا کرتا ہے، کتابوں پر سید اور زیدی کی دھجّیاں اڑنے لگی تھیں، شاہ کا اضافہ بھی کر ڈالتے تو ہم اور آپ کیا کر لیتے، کرنسی نوٹوں پر انگریزی میں دستخط باقاعدگی سے کرتے تھے، برسوں یہ معمول رہا مگر پلٹ کر ان کے ہاتھوں میں کوئی نوٹ آیا نہیں، چیک پر بھی دستخط انگریزی ہی میں کرتے تھے جو اکثر و بیشتر بھول جاتے، روپے پیسے کی آمد اور خرچ کا حساب باقاعدہ رکھتے تھے، اس قسم کے چند روزنامچے میرے پاس محفوظ ہیں، اپنی دن بھر کی دیگر مصروفیات کو بھی انہوں نے ایک بار سال بھر قلم بند کیا تھا، رات کو لکھ کر رکھ دیتے صبح وہ دفتر جاتے اور ہم سب مل کر مزے سے پڑھتے، ایک سال کہیں صدیوں میں تمام ہوا، بھاگم بھاگ لاہور پہنچا، وہ پوچھتے رہے میں حواس باختہ رہا، جی کڑا کر کے زبانِ قلم کو ترجمان بنایا، وہاں کیا دیر تھی بے تکلف اٹھا کر عرش پہ جا بٹھایا، نادر روزگار روزنامچہ میرے حوالے ہوا، اسی طرح دیگر مسودات بھی بعد از کتابت مجھے نصیب ہوئے، افسوس اس روزنامچے میں سعیدہ واسطی کا ذکر کہیں نہیں ملتا یہی وہ دن تھے جب اس کی آمد و رفت زوروں پر تھی، وہ تقاضے کر کے خود بر گنزا ہوٹل آتی یہ خط لکھ کر بلاتے، وہ فون کو ترجیح دینے کی تاکید اپنے خطوں میں کیا کرتی تھی ہزار حیف بیگم جعفری نے خیسانی سے والہانہ مراسم کی بھینٹ ان خطوں کو بھی چڑھا دیا،، حفظ ماتقدم کے طور پر مجھ سے لے لیے، جعفری اگر چوں چرا کرتے تو یہ پلندہ دکھا کر منہ بند کیا جاتا رو رہا جاتا ہم سے کتنے ہو پیلے اپنے گریباں میں کبھی جھانکو، دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ، میں نہیں کہہ سکتا ایسا ہوا بھی یا نہیں۔

بخیل تو وہ قطعاً نہیں تھے، ہاتھ روپے پیسے ہی نہیں قلم پر بھی کھلا ہوا تھا بڑی شان اور ڈھٹائی سے خیسانی پر بھی لکھا اور مدلل مداحی کا حق ادا کر دیا، اعزہ و اقربا کے علاوہ خیر آبادی درزیوں چماروں وغیرہ سے بھی سلوک کرتے تھے، کسی کو کپڑے سینے والی

مشین دلا رہے ہیں، کسی کو "کھوکھا" (لکڑی کی گویا گشتی دکان) بنوا کر دے رہے ہیں گروہ بندی، سازش، فتنہ وفساد سے کوسوں دور تھے، بے انتہا خلیق مرنجان مرنج متواضع ملنسار، ہر ایک کا بھلا چاہنے والے، علمی وادبی دنیا میں معاصرانہ چشمک سے بھی محفوظ رہے ہر ایک سے مروت اور شرافت سے پیش آئے، ضرورت مند یار بار اور طرح طرح سے جیب ہلکی کرتے رہتے، انکار نہیں کر سکتے تھے، بعضوں کے تو وظیفے مقرر کر رکھے تھے، آفتاب اکیڈمی کے نصیر کرمانی (منجھو بھائی) اور عزیز احمد کرمانی جعفری صاحب کے پروردہ ہیں والدہ اور برادر بزرگ عقیل احمد جعفری کا وظیفہ الگ الگ تھا، سسر اُن کے قطب الدین صدیقی کٹر کانگرسی تھے، دوسری شادی بھی کر لی تھی، بمبئی ان سے چھٹ نہ سکی اور اس طرح ساس سالی اور سالا جعفری صاحب کو یہی کہنا چاہیئے جہیز میں ملے، جیتے جی سب کے کفیل رہے، سالے کی جنسی کجروی کا یہ حال کہ بھانجیوں سے دست درازی کرنے لگا، لاہور کے پاگل خانے میں بھجوایا گیا "ٹھیک" ہو کر آیا تب بھی مجنون، صاحبِ خانہ بے چارے گھبرا کر "ایوان اشاعت" میں شب باش ہوتے لگے، اس لاؤ لشکر کی وجہ سے گھر بلا شبہ گھر نہیں رہا تھا بھلی بازار بن گیا تھا، آئے دن کی دانتا کل کل نے جان عذاب میں ڈال دی ماں بیٹی کی تھکا فضیحتی الامان والحفیظ، ساس بہو کے روایتی بیر کو بھی مات کر دیا، طرہ یہ کہ سچ مچ کی ساس، بھاوج دیور کھوکھرا پار سے گذر کر کراچی پیر الہٰی بخش کالونی آپہنچے، گنجائش ہی کتنی تھی، ایک ڈربہ سا تو تھا وہ مکان، تاہم محاذ آرائیوں کی گرم بازاری دیکھ کر پانی پت کے تاریخی میدان کو بھی شرمندہ ہونا پڑا، یہ حالت اور انتظامی آپا دھاپی دیکھ کر ایک روز عقیل احمد جعفری نے سرگوشی یہ کی۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لاہور بھاگ نکلنے کی رم بھی بہت کچھ یہی گھریلو عوامل تھے، وہاں آزادی سی آزادی تھی، مردانہ نشست، یاروں کے مجمعے، ہر چیز کا آرام، نہ چیخ نہ پکار نہ جوتم پیزار، مبارک اردو لائبریری کے لئے کتابیں میری تحریک پر عطا فرمانے لگے تھے ذاتی

کتب خانہ ان کا تھا ہی نہیں، کمرہ استقبالیہ میں پندرہ بیس کتابیں زیب و زینت کیلئے ضرور سجی رہتی تھیں، ضرورت پڑے تو مقامی کتب خانوں سے استفادہ کرتے، ایک بار ناشر بننے کا شوق ہمیں بھی چرایا تھا، مرحوم نے انتہائی کشادہ دلی سے کہہ دیا تھا، میرے غیر مطبوعہ سودات بلا اجرت تمہارے لئے ہیں، جس موضوع پر کہو گے مواد فراہم کردوں گا، ایسے سرپرست کی موجودگی میں بھی یہ خوں شدہ دل کسی کام نہ آیا، نقوش کے منٹو نمبر کتابوں کے انبار میں چلے آئے، مجھ سے دریافت کیا گیا، اچھا تو ہم سے بدگمانی، دوسری ڈاک سے مطلوبہ پرچہ پارسل کردیا، کس محبت سے لکھتے ہیں۔

"تم نے نقوش ناحق بھیجا، تنقید کے لئے چند منٹ کے لئے درکار تھا وہ کام کہیں سے بھی چلا لیتا، تم نے کوئی چیز مانگی ہے تو میں نے فوراً دے دی ہے، اسے بھی بتا دیتے میں چند منٹ میں تنقید لکھ کر واپس کردیتا، میں ایسے رسائل کے فائل تو رکھتا نہیں، اب کوئی صاحب لے جائیں گے اور پرچہ نصیب اغیار ہو جائے گا۔"

دلداری کا ایک اور نقش

"ریاض کا چندہ بھیجنے کی آپ ہرگز زحمت نہ فرمایئے اگر بھیجا تو واپس کردوں گا ریاض تمہارا پرچہ ہے اور اپنا پرچہ خریدا نہیں کرتے۔"

یہ بھی پڑھیئے

"تم نے جتنے روپے لکھے ہیں وہ بھی ضرور ملیں گے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مرحوم مجھے بچوں کی طرح گیا بالکل اپنا بچہ سمجھتے تھے، کسی طرح کلفت تکلف روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹے بڑے ہر معاملے میں رہنمائی کرتے، میری عاشقانہ وحشت کو ایک زمانے میں ان کی بزرگانہ شفقت نے جنون خیز ہونے سے بچا لیا تھا، ان کا موقف یہ تھا کہ تمہاری نسبت طے ہو چکی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارا ساتھ دیتا، اب اگر میں تمہارا بنوں تو شاہ صاحب (والد مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی) کو کیا منہ دکھاؤں گا، سچ تو یہ ہے کہ ان میں اگلے وقتوں کے لوگوں کی تمام تر خوبیاں اور خامیاں یکساں

کار فرما تھیں۔

ادبی بددیانتی ان سے صادر تو نہیں ہوئی مگر یہ ضرور تھا کہ آپ نے پچاسوں مضمون لکھ کر لکھوا کر جعفری صاحب کو فراہم کر دیئے، بیسیوں چیزیں صاف نقل کر کے اعانت کی گئی، وہ ہیں کہ مجموعہ مرتب کرتے وقت غیر متعلق حضرات کو یاد رکھیں گے اور بھول جائیں گے انیس اور محمد ایوب قادری کو، کتابیں رکھ کر بھول جاتے کوئی اڑا لے جاتا، ڈھونڈیا پڑتی، ہو تو ملے، ردی میں بکنے چلی گئی ہو گھر والوں سے یہ بھی بعید نہ تھا، اور کتاب مستعار دینے والے یہ تاثر لے کر اٹھے کہ جعفری چور ہیں جان بوجھ کر ہتھیا رہے ہیں، یہ شکایت ضیاء الدین احمد برنی مرحوم کو بھی تھی، میں واقف حال تھا مگر برنی صاحب کی بدگمانی بدستور رہی، ندوہ کے تعلیمی دور میں شعلہ بیان مقرر تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تک یہ خصوصیت نمایاں رہی مگر بمبئی اور پاکستان میں منقار زیر پر رہے، لاہور میں دو ایک ادبی نشستوں میں چند ورق لکھ کر پڑھ دیئے، شعر کہے ضرور مگر کسی مشاعرے میں پڑھ کے نہیں دیئے، ہمیشہ سامع ہی رہے،

حیات محمد علی جوہر کے مصنف کو مولانا شوکت علی زبردستی لے گئے، اخبار خلافت لاددیا، شروع میں تو دبے دبے رہے، مگر کب تک، بمبئی کی فلمی دنیا سے بچ نکلنا ہر ایک کے بس کی بات کہاں، وردنامی ناول اے آر کاردار نے فلمایا، بہت چلی یہ فلم بھی، جدن بائی سے یارانے رہے، پاکستان میں بھی شوکت حسین رضوی اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے ڈورے ڈالے مکالمے لکھوائے، کہانی لکھوائی، گھنٹوں بیٹھ کر سنی گئیں سب چیزیں، ناپسند کر کے چلے گئے شاہ صاحب مگر "چھوٹی بیگم" میں جعفری کی خوشہ چینی کا پرتو بالکل نمایاں تھا، ہندوستانی فلمیں پاکستان میں دیکھا کرتے تھے، ایک بار میں اسکول سے نکل کر کتابیں لٹکائے "جوبلی" سینما میں جا بیٹھا، کیا دیکھتا ہوں مرحوم اور حسین صاحب چلے آرہے ہیں آ کر میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے، میں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور سر جھکائے ہوئے باہر نکل آیا۔ دو دن تک ایک دوست کے ہاں پڑا رہا، کس منہ سے جاتا، انہوں نے گھر جا کر یہ لطیفہ سنایا مگر مجھ سے کچھ نہ کہا، چسکا ہمیں سگریٹ کا بھی پڑ چکا تھا، ایک سفر میں میں نے سلگایا ہی کہ وہ غسل خانے سے برآمد ہو گئے کنکھیوں سے دیکھ لینے کے بعد نیچے اتر

کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اور اس طرح ان کی ڈبیہ سے نکلا ہوا کرَے وَن اِے ضائع ہو گیا، آگے چل کر تو یہ بھی ہوا سگرٹ انیس صاحب کے لئے چلا آرہا ہے، یعنی لو بیوا ب ہم قلم ہاتھ میں لیتے ہیں۔

فریئر روڈ سے پیر الٰہی بخش کالونی منتقل ہونے کا مشورہ نجانے کس خبیث نے دیا تھا، نہ بجلی نہ پانی نہ سڑکیں نہ سواری، دو کمروں کا ذرا سا مکان، کاغذی دیواریں، چھت کا یہ حال کہ لمحے بھر کی بارش سے گھنٹوں ٹپکتی رہتی، ایک مدت تک یہیں رہنے وہ لاہور سدھارے ہم نے بھاگ دوڑ کرکے ناظم آباد کے گول مارکیٹ کے پاس ایک سلیقے کا مکان لے لیا، اچھا خاصا مکان تھا مگر بدبختی ملاحظہ فرمایئے کینٹ سے ہمیں کوئی ٹیکسی نہ مل سکی، تھکے ہوئے تو سفر کے تھے ہی، گھوڑا گاڑی ریں ریں کرتی ہوئی کہیں گھنٹوں میں وہاں پہنچی، سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور صاف صاف کہہ دیا شہر سے اتنی دور میں تو نہیں رہنے کا، تلاش بسیار کے بعد سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں تین آڑھے ترچھے کمرے ملے پھر وہیں قریب میں مکان بدل لیا تھا، تھا اس لئے کہ اس وقت تک آسمان میرے سر پر نہ رہا تھا، اور میں راندۂ درگاہ ہو چکا تھا، کیوں نہ ہوتا کہ میں بضد ان کی سالی سے شادی کرنے پر تھا اور یہ جوڑ ان کی نظر میں بے ڈھب اس لئے تھا کہ میرے گھر میں ایک نیک بخت ایک بچے سمیت موجود تھی۔

بسا اوقات خوش مزاجی کے مظاہرے بھی ہوتے، قہقہے گونجتے، حکیم نیّر واسطی ایک مشاعرے میں پڑھنے کے لئے بڑھے پاؤں فرش زمین پر بچھی ہوئی دری سے رپٹا گرے تو سیدھے شہ نشیں پر بیٹھی ہوئی بیگم جعفری کے قدموں میں، بالکل سجدہ ریز ہو گئے یہ نقشہ جب میں محمد آباد سے لاہور پہنچا دیگر دار داتوں کے ساتھ ساتھ ہو بہو عملی طور پر کھینچ کر دکھایا، خمیسانی کی چال میں ایک خاص طرح کی لٹک تھی، جس کی نقل کمال استادی سے جعفری مرحوم ہمارے سامنے اتارا کرتے تھے۔ کوئٹہ میں تصویریں اتاری جانے لگیں، جب وہ کیمرے کی زد میں آئے تو منہ بنا لیا، بتیسی دکھانے لگے، میں رکا تو فرمایا اسی طرح اترے گی تصویر، چونکہ خوب صحت مند تھے، بھولا بھولا چہرہ، اس لئے یہ منہ چڑانے کا

انداز ہنسی میں بدل گیا ہے، کراچی سے نکلنا شرط تھا، صرف بیوی ہوں اور بچے ہوں، خوش توش رہتے، بو پیڑ خانے میں کون شریف آدمی آسودہ خاطر رہ سکتا ہے۔

ریڈیو بہت کم سنتے تھے، کبھی ہلکی پھلکی موسیقی اور گانوں کی بھنک پڑ جاتی تو پوچھتے یہ کون تھا یہ مناڈے تھے، ارے ہاں یہ کے سی ڈے کا بیٹا ہے، کے سی ڈے میرے دوست تھے اور بہت اچھے لوگ تھے، اس وقت تو سب کی عید ہوگئی جب کراچی میں برپا ہونے والی عظیم الشان بین الاقوامی پہلی صنعتی نمائش کے منتظمین نے حسن صورت سے متاثر ہو کر شوقیہ گانے والوں میں سر فہرست بیگم جعفری کو رکھا اور ایک ٹائم پیس انعام دیا گیا بیگم صاحب باقاعدہ تربیت یافتہ گانے والیوں کو بھی برابر سرابر کا جاننے لگیں اور اس ہنر کی تصویر بن کر رہ گئیں۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

پکے گانے جعفری صاحب نہیں سن سکتے تھے، کہیں لکھا ہے، بڑے غلام علی پر لوگ سر دھن رہے تھے مجھے چکر آ رہا تھا،

رنگ کھلتا ہوا گندمی کسی قدر لمبوترے چہرے کا تھا، بھرا بھرا جسم بالکل سفید میدہ کھڑی ناک جڑی ہوئی بھنویں ان کی تراش خراش قینچی سے ہوتی رہتی تھی، دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گہری اور روشن، سینہ کشادہ، بازو کھلے ہوئے، قد نکلتا ہوا، ہونٹ پتلے دہانہ تنگ تھا، ہاتھ لمبے اور انگلیاں مخروطی، بال کھچڑی اور سلامت، کراچی میں یہاں وہاں سے کٹوا لیتے تھے البتہ لاہور میں ایک خلیفہ لگائے گئے تھے جو بال ہی نہیں داڑھی بھی بناتے لگا اور حضرت اس مشقت سے بھی بچ گئے۔

ذاتی کتب خانہ مبارک اردو لائبریری کے بانی سید مبارک شاہ جیلانی مرحوم و مغفور اردو کے عاشق اور یوپی والوں پہ جان چھڑکتے تھے، حکم یہ تھا کہ شلوار مت پہنا کرو پاجامہ زیب تن کرو اور اردو بولو، خود تو وہ تہبند باندھتے تھے اور اگر بہاولپوری زندگی ترک کرنے کا اتفاق ہو جاتا تو وہ یقیناً لباس اپنا بھی بدل لیتے، ۱۹۲۵ء میں نیاز فتحپوری کے عشق

میں بھوپال جا پہنچے تھے، مسافر کے قلم سے اس سفر کی روداد بڑی دلچسپ غیر مطبوعہ موجود ہے، نیاز بھوپال سے لکھنوٴ گئے وہاں وصل بلگرامی اور ریاض خیر آبادی سے ملایا اور ان کے حوالے کر دیا، ابا مرحوم ریاض کی منکسر المزاجی محبت اور خلوص سے بہت متاثر تھے ریاض کے خطوں سے بھی ان کی شرافت نفس ٹپکی پڑتی ہے تقسیم ہندوستان کے بعد جب جعفری صاحب نے پہلی ملاقات میں اپنے نانا ریاض کا ذکر کیا تو ابا بس فریفتہ ہی تو ہو گئے، وہ چاہتے یہ تھے محمد آباد کی سرزمین یو۔پی ثانی بن جائے، اردو کا چلن عام ہو، ہزار جتن کر کے خاصی بڑی متروکہ جائیداد جعفری صاحب کے نام الاٹ کرائی، یہ سمجھے اس طرح پنچھی خود بخود پنجرے میں آجائے گا مگر وہاں تو شہری زندگی رگ و ریشے میں رچ بس گئی تھی، کیونکر بیابانوں میں صحرا نوردی کرتے، یہ زرعی زمین ناچار ٹھیکے پر اٹھا دی گئی اور اس طرح ایک معقول رقم ہر سال والد مرحوم کے توسط سے جعفری صاحب تک پہنچنے لگی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ روپیہ اپنے صرف میں لے آیا جاتا، ادا ہونے میں تاخیر ہو جاتی، جب بھی تاخیر ہوئی مرحوم بے قابو ہوئے اس بری طرح اور اکھڑ کر تقاضے کرتے کیا کوئی سود خوار پٹھان کرے گا، بھلا ہو ایوب خاں کا، فوجی ڈنڈا لے کر کھڑے ہو گئے اور تمام الاٹمنٹ منسوخ کر کے نئے سرے سے کلیم جانچے گئے اور قصہ پاک کیا، جعفری صاحب نے اپنی کسی چیز کا کلیم ہی داخل نہیں کیا تو معاوضہ کہاں سے ملتا، اور اگر کچھ تھا بھی تو وہ تھوڑی ساری شہری جائیداد تھی جو وہاں چھوڑ کر آئے تھے، یہ عجیب تضاد میں نے مرحوم میں دیکھا، ابا کے ہزار اخلاص اور بے ریائی کے باوجود اک ذرا سی چوک پر آتش زیر پا ہو جاتے، یہاں تک کہ اپنے ماہانہ ریاض میں لکھا بھی کہ بہاولپور میں لوگ فرضی الاٹمنٹ کرا کے روپیہ بٹور رہے ہیں خطوں میں دھمکیاں دیا کرتے، حسن محمود وزیر اعظم ریاست بہاولپور اور ان کے پدر بزرگوار سے بے تکلف ملاقات رہی اگر میں چاہتا تو ان سے کہہ کر اپنی زمینوں کا انتظام کرا سکتا تھا، غرض جعفری صاحب یہاں بونے نظر آنے لگتے تھے۔

حکام بالا اگر ذرا بھی مروت کرتے یا توقع ہوتی کہ اس طرح کوئی بڑی نہ سہی چھوٹی مشکل آسان ہو جائے گی تو باقاعدہ بڑے خاص انداز میں دلداری فرماتے تاہم

ان پر چاپلوسی کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی، اے ٹی نقوی کمشنر کراچی نے ایک دکان الاٹ کر دینے کے بیسیوں وعدے کئے اور بھول بھول گئے بالآخر جل کر ایک کتاب کا انتساب ان کے نام کیا اور لکھا۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ابا نے مجھے جعفری صاحب کے گھر میں ڈال تو دیا تھا، مگر یہ میرے لئے تھی بڑی آزمائش ڈھنگ سے اردو بولنا تو کہاں۔ سمجھنے میں بھی اچھی خاصی دشواریوں کا سامنا تھا، عمر ہی کیا تھی، یہی کوئی دس گیارہ برس، میری کائنات میرا دیہات بلکہ بیٹھک اور گھر کی چار دیواری تھی، ناگہاں چار سو میل دور اجنبی لوگوں اور بیگانے شہر کراچی میں جا پڑا، ذہنی کیفیت ایک ڈراؤنے خواب سے کچھ مختلف نہ تھی، کھوئے کھوئے رہنا اور چھپ چھپ کر رونا اور جب بالکل نئی غذا ابلے ہوئے چاول (خشکہ) اور پتلی پانی دال میرے سامنے رکھے جاتے تو جان پر بن جاتی اور ہزار ضبط کے باوجود دو چار آنسو ڈھلک ہی جاتے، زہر مار کئے ہی بنتی، افراد خانہ سے مانوسی پر چھ مہینے تو ضرور گذرے ہوں گے، اس عالم برزخ میں واحد سہارا تھا تو محض صاحب خانہ کی ذات والا صفات کا، دفتر ان کا بندر روڈ پر میونسپلٹی کے سامنے کتب خانہ تاج آفس میں تھا، وہ تو دن چڑھے پہنچتے مگر میں منجھو بھائی کی انگلی پکڑ کر آٹھ ہی بجے دکان پر چلا جاتا، وہاں بچوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھتا رہتا، پڑھا کیسے جاتا گو ظاہر یہی کرتا، دل ڈوبتا اور خون کے آنسو روتا رہتا، تمام تر روحانی توجہ اور دل اپنے گاؤں اپنے بہن بھائیوں اور ابا اماں میں لگا رہتا، میرا جسم ہی جسم وہاں تھا، میں اب کسی قیمت پر اپنے بچوں کو اس قسم کے ذہنی کرب روحانی اذیت سے دو چار کر کے ان کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دینے کی جرأت نہیں کر سکتا، رات کو مرحوم دستر خوان پر اپنے پاس بٹھا کر ایک سے زیادہ روٹی کھانے پر اصرار کرتے، شام کو میرے ہاتھ پر داد کا زخم دکھانے ڈاکٹر کے ہاں لے جاتے اور جب تک میں سب سے گھل مل نہ گیا دلجوئی فرماتے رہے اس سرشت اس وضع اس محبت کے لوگ اب کہاں،

جعفری صاحب کی خوش دامن نے شوہر دو کئے، پہلے کا تو مجھے علم نہیں، دوسرے وہی مولانا قطب الدین صدیقی تھے، یہ شادی بھی رومان کا نتیجہ تھی، پہلے شوہر سے ان کی اولادوں میں سے ایک بھائی جان سے بیاہی گئی تھیں، لطف یہ کہ بھائی جان سے بیاہی صاحبزادی کی بھی دوسری شادی تھی، بھائی جان کا نام خدا جانے کیا تھا چھوٹے تو خیر بڑوں نے بھی بھائی جان ہی کہا، درمیانہ قد، کالے بھٹ، چپٹی ناک، کم گو کم آمیز، شام کو عموماً سرشار مگر خبردار، چندیا صاف، ننگے سر، ہاتھ میں چھڑی منہ میں سگرٹ، کاغذی ہونٹوں کی آڑ سے جھانکتی مصنوعی بتیسی، بے پناہ محبت کے آدمی، عمر کا بڑا حصہ شملے میں گذرا کراچی کی سردی کو کیا خاطر میں لاتے، مہمانوں کے بہتات، دسمبر جنوری کا جاڑا، ایک ہی پلنگ پر برآمدے میں سونا پڑا، بہت کہا بھائی جان لحاف اوڑھ لیجئے، مگر وہ ایک ہلکے سے نام کے کمبل میں رات بھر کانپتے اور یہی کہتے رہے میاں شملے میں رہا ہوں یہ کیا سردی ہے، تو صاحب اس ہٹ اس وضع کے یہ بزرگ ہفتے کی شام کو آجاتے، رات گئے تک تاش سے شغل رہتا جس میں جعفری صاحب پوری دلجمعی اور دلسوزی سے پیش پیش رہتے، اتوار بھر یہی عالم رہتا یہ چکر چار برس تک باقاعدہ چلا۔

بیگم کی جنسی ناآسودگی کی بڑی وجہ مرحوم ہی کی ذات تھی، میری عمر اتنی زیادہ تو نہ تھی، تاہم خود لذتی کا دور دورہ تھا، دھان پان اس قدر کہ مجھ سے ٹانگیں دبوانے میں کبھی ہچکچاتی نہیں تھیں اور ضرورت پڑنے پر دروازے کی آڑ سے غسل خانے میں کپڑے بھی لے لئے جاتے تھے، گھر کیا تھا مجموعۂ اضداد اور قمار خانۂ عشق و محبت تھا، حیرت یہ ہے اس مسموم فضا اور گھٹن میں نزاکت احساس کی یہ کارفرمائی کیونکر جنم لیتی تھی، ایک کونے میں میں اور میرا گوہر مقصود محو راز و نیاز دوسرے میں تجمل اور نعیمہ تیسرے میں جیسانی اور بیگم صاحب جعفری، کہیں نیلوفر کی نگاہیں فرش راہ، طاہر صاحب اور شمع میرے رقیب، ایک جیمن بھی اسی مد میں آیا کرتے تھے رشید اختر ندوی بھی بیگم جعفری کے غمزہ و ادا کے شیدائی تھے شراب پی کر تصویر اور تصور سے باتیں کیا کرتے

اتنا ضرور تھا، جعفری کی بیوی ہے ورنہ زبردستی اٹھا کرلے جاتا، رشید اختر نے جعفری صاحب کی سالی پر بھی ڈورے ڈالے، نکاح کرنے کی طرح ڈال دی تھی میں نے جوشِ رقابت میں بھانڈا پھوڑ دیا، لاہور اس کی بیوی کو لکھا تب یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

جعفری صاحب مرحوم نے اپنا وزن میلوں ٹہل کر اور فاقے کر کے گھٹایا تھا کراچی، لاہور، بمبئی ہر جگہ ان کا معمول یہ تھا کہ شام کو پان سات میل کا چکر لگا کر گھر پہنچے، آرام باغ روڈ سے پیر الٰہی بخش کالونی مزے سے آجاتے، کھانا وہ شکم سیر ہو کر کبھی نہیں کھاتے تھے، ندیدوں کی طرح کسی چیز پر ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، عموماً وہ دس بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتے تھے مگر بھائی جان ہوں تو چار بجے نہاری لینے چلے جاتے، سیر بھی ہو جاتی، ایک پنتھ دو کاج۔

ایک دور وہ تھا جب شمع معموں کی دھوم مچی ہوئی تھی، اس وبا کی لپیٹ میں ہم بھی آئے، جعفری مرحوم پوری توجہ اور بحث مباحثے کے بعد خانہ پُری کرتے، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، تین سے کم غلطیاں کبھی آئی ہی نہیں، یہ ایک فنی معاملہ ہے جس کے دروبست کو سمجھنا کھیل نہیں، تُک بند زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

ماں کا رشتہ آپ جانیں کیسا دلربا اور دلکش ہے، عقیل احمد جعفری بڑے، چھوٹے رئیس احمد جعفری، بڑے کی عمر پچاس سے زیادہ غالباً ساٹھ کے پھیر میں، چھوٹے چالیس کی سرحد پار کر چکے ہیں، یہ دونوں بوڑھے بچے اپنی ماں کے آگے پیچھے جاتے تھے عقیل تو دن بھر گھر پہ شروع شروع میں رہتے اور ماں کی ناز برداری کیا کرتے، چھوٹے کی سعادت کا یہ حال کہ صبح سے شام تک کی درماندگی کے باوجود سیدھے ماں کے کمرے میں حاضر ہوتے، وہ ماں جس نے خیرآباد کی لق و دق حویلیوں میں ایک بڑی برادری پر حکم چلائے تھے، نزاکت مزاج ان کا خاصہ تھا، چھ فٹ چوڑے چھ فٹ لمبے کمرے میں مقید اور فروکش ہیں، بڑی بہو تو روزِ اوّل بلکہ ازل سے ساتھ ساتھ رہیں، اپنے کنبے کی اپنا ہی خون، ساس کی خاندانی عظمت اور قدر و منزلت سے آگاہ، مزاج شناس مزاج دال اطاعت گزار، اور یہاں چھوٹی بہو بمبئی کی چھلاوا، بچے بھی اولاً خود بھی نام خدا نئی روشنی

میں رنگے ہوئے چھکے ہوئے، مدہوش اور برخود غلط، کبھی فلم کبھی بازار کی سیر، آج ڈاکٹر کے یہاں جا رہی ہیں کل کسی سہیلی کے ہاں، پرسوں پورا لشکر کلفٹن کے پانیوں سے کھیلنے چلا جا رہا ہے، ہر ایک سے بے حجابانہ گفتگو، ہنسی ٹھٹھہ مخول مزاج کی افتاد ایسی ہی تھی، اگلے وقتوں کے غیور لوگ، ستر برس ایک چار دیواری میں گزار کر آئے ہوئے، وہ بھلا ایسی کھلی چھٹی کہاں سہہ سکتے تھے، جونہی بیٹا چھٹیوں میں پلٹتا، باقاعدہ حاضری ہوتی، بیگم کڑھتی کلستی اور انگاروں پر لوٹا کرتیں، دیوار کے کان بن جانا عیب نہیں ہنر تھا، ماں بیٹوں کی گفتگو کھڑکیوں کی آڑ سے سنی جاتی، فرشی نشست دو دو گھنٹے رہتی، دن بھر کی ہنگامہ آرائیوں کی روداد سنتے، بات کے پکے مگر کان کے کچے بھی تھے، اس پر بھی پی جاتے، کبھی کبھار منہ پھول بھی جاتے، کھنچاؤ اور تناؤ بڑھ جاتا، خاموشی کے گہرے بادل چھائے رہتے، بڑھیا کی ہنسی اڑنے لگی، باتوں کے طوطا مینا اڑائے جانے اور دبی زبان سے آوازے کسے جانے لگے، تیوریاں چڑھنے لگیں جبینیں شکن آلود، تو تو میں میں، بات بات پر تکرار سامنے والے مُلّا جی انڈے والے کی صحت اور توانائی کا ذکر ساس کی زبانی سن کر اس سے اس سے کہا جانے لگا، دیکھا بڑھیا کا بھڑ بھس، علیحدہ کرائے کا مکان جعفری صاحب نے تلاش کر کے دیا تب سکون ہوا۔

ابا کی اردو دوستی کا ذکر جس قدر کیا جائے کم ہے، اردو بے چاری تو آج بھی کہ اس کا دامن مختلف علوم و فنون سے مالامال ہو چکا ہے، بے یار و مددگار سر چھپاتی پھرتی ہے، وہ دور جب ریگزار بہاولپور پر اردو کا علم بلند کیا گیا، بڑا ہی گیا ہوا گزرا ہوا تھا، شرفا عزیب جان کر منہ نہیں لگاتے تھے، گلستاں بوستاں آرائش محفل کا طوطی اب بھی بولتا ہے اُس وقت تو راج بھی تھا، مشاعروں کی طرح ڈالنا، کتب خانے کا قیام، مشاہیر سے مراسلت، میل جول، ابا کی اِن کاوشوں کو بنظرِ استحسان گنتی کے چند دور دراز کے عیزوں نے تو دیکھا مگر اپنوں میں سے کوئی اس گوں کا تھا ہی کہاں جسے قدم ملا کر چلنے کی توفیق ہوتی، وہ بھی ہمت ہارنے والے کہاں تھے، بڑے بیٹے اور بھتیجے کو کالے کوسوں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھیجا، مجھے بھی اردو ہی کی لگن میں جعفری صاحب کے حوالے

کر دیا، پڑھ کے تو ہم نے کچھ دیا نہیں، فلمیں دیکھیں یا سٹریکیں ناپیں، البتہ زبان کسی قدر صاف ہوگئی، خود مرحوم نے اپنے ماہنامے ریاض میں لکھا تھا، کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی زبان اردو نہیں ہے، انیس غیر اردو ہے،

معاصرانہ چشمک کسی سے تھی ہی نہیں، ہو تو میرے علم میں بہر حال نہیں ہے، معاصرین کا بہت خیال کرتے تھے، گفتگو میں ممکن ہے دشنام پر اتر آتے ہوں قلم کو بہت کم آلودہ ہونے دیا، البتہ نیاز فتحپوری سے مذہبی معرکے رہے، عام طور پر بحثیت خورد کے ملتے، مولانا دریابادی گورنر غلام محمد کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے لاہور سر راہ تھا چندے قیام یہاں بھی رہا، ناشتے پر مدعو تھے، ناشتہ ہو چکا، کہیں اور ملاقات طے تھی، میزبان جعفری صاحب اچکن زیب تن فرما کر برآمد ہوئے، سینے پر داہنا ہاتھ، چپ کھڑے ہیں مودّب، یہ نہیں کہ اُٹھیے میں تیار ہوں مولانا خود متوجہ ہوئے، اٹھے اور فرمایا اب چلنا چاہیئے، جب تک رہے جعفری مرحوم ننھی رہے، ان کی خواہش بھی یہی تھی اور ان کا حکم، مولانا کی صحت قابلِ رشک تھی اب بھی ہوگی، لیاقت علی خاں کی شہادت کی خبر جب گھر میں پہنچی تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا، حزن و ملال کا پیکر نظر آتے تھے، ماہر القادری کہتے ہیں جماعت اسلامی کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی تھی، بہت پوچھا نام تو وہ بتا نہ سکے، اصرار یہ کہ لکھی ہے اور ضرور لکھی ہے۔

گھریلو وہ اس حد تک تھے کہ کوئی نہ ہوا تو دھوبی کو کپڑے گن کر دے دیئے اور لکھ لیے کسی چھوٹے موٹے کام سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ وہ گھر میں ہوں یا باہر خرچ کریں، کوڑی کوڑی کا حساب لکھتے تھے، ایسی متعدد ڈائریاں اس وقت میرے سامنے رکھی ہیں، نوکروں کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے خواہ کتنے ہی خبیث النفس ہوں، ایک منشی سے تو گاڑھی چھنتی تھی ملازمت سے علیحدگی کے بعد جب بھی وہ آیا ملا سر راہ آلتی پالتی مار کر کسی دکان کے سامنے بیٹھ جاتے اور گپ کرتے رہتے کوئی گواہی کے لیے عدالت میں بلواتا تو سمن والے کو کچھ دے دلا اور کھلا پلا کر رخصت کر دیتے،

تاریخ پیدائش تو نہیں سال پیدائش معلوم ہے اور وہ ہے ۱۹۱۲ء بیکھم پور میں پیدا ہوئے، خیرآباد میں پلے بڑھے، ریاض شاعر خمریات نے خیرآباد کو زندگی جاوید بخشی، ریاض خیرآبادی کے دوسرے بھائی سید نیاز احمد، باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو ماں اور نانا سید نیاز احمد نے سنبھال لیا، لکھنؤ دہلی بمبئی کے بعد کراچی آ گئے، موت لاہور میں آئی، معمول کے مطابق ٹہلنے نکلے، زیادہ دور بھی نہیں گئے، اسٹیشن ریل کا قریب ہی تو تھا، گاڑیوں کی سیر بھی دیکھتے جاتے ٹہلتے بھی رہے، نفس ناطقہ حسین الزماں اک ذرا ٹلے ہی تھے کہ فرشتہ اجل نے آلیا وہ جان لیے بغیر کیونکر ٹلتا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

۲۸/ اگست ۱۹۷۴ء

لاہور کا ادبی قطب

مولانا غلام رسول مہر ایک ماہر سیاست دان تھے، پاکستان کس ڈھب سے وجود میں آنا چاہیئے، اس منصوبے کا خاکہ مرحوم نے اڑایا نہیں بنایا اور سنوارا، چونکیئے نہیں یقین کر لیجئے، یہ واقعہ ہے، اصل مسودہ پیر علی محمد راشدی کے ہاں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، ہاں یہ اور بات کہ جونہی پاکستان وجود میں آیا، ہم نے ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے کام لینا غیر ضروری سمجھ کر فراموش کر دیا، وہ بڑے اعلیٰ ظرف لوگ تھے، ہوا کا رخ دیکھ کر کیا چلتے خانہ نشین ہو گئے، بھول کر بھی پھر اس وادی میں قدم نہیں رکھا، داد قوم کو دیجئے ایسے عالی دماغ کی غیر حاضری کو نہ ان کے جیتے جی محسوس کیا نہ مرنے کے بعد خبر لی، ایسی مثالیں دنیا میں خال خال ہی ملا کرتی ہیں، لیکن مسلمان کی شان بہرحال یہی ہے،

قلم بچپن سے لے کر مرتے دم تک ہاتھ میں رہا، تک بندی نہیں تک سک سے درست شعر گوئی سے ابتدا ہوئی، یہ ان کا میدان نہ تھا، ادب و صحافت میں آئے اور اردو اداریہ نگاری کو معزز اور محترم بنا دیا، ان کے اداریوں میں محققانہ آن بان پائی جاتی تھی، یہی حال سوانح نگاری کا تھا، تحقیق اور تفتیش کی چاٹ تھی، وہ بلاشبہ فسانہ طراز نہیں بھاری بھرکم تاریخ داں تھے، اردو انگریزی عربی فارسی چاروں زبانوں پر یکساں قدرت تھی، ترجمہ بے تکلف کرتے تھے، اور کہا جا سکتا ہے کہ بہترین مترجم تھے، انکی طبیعت میں جھلاہٹ کا عنصر گو کسی قدر غالب تھا مگر مزاج میں شاعرانہ شگفتگی اور لطافت بھی تھی غالبؒ کو جس انداز میں انہوں نے پیش کیا اور سمجھا وہ انہی کا حصہ تھا، خوب سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے اور حق ادا کر دیتے لیکن "نوائے سروش"۔ شرح دیوان غالبؒ میں یہی بات

یہ ہے کہ یہ حق ادا نہیں ہوا،

غالبؒ پر مرحوم نے سینکڑوں مضمون لکھے، خطوں سے پوری سوانحعمری مرتب کر ڈالی تاہم وہ مجھے یہ نہ بتا سکے غالبؒ کو جیل میں شراب کون مہیا کرتا تھا، شیفتہ یا کوئی اور، شیفتہ ہی ہوں گے، یہ سعادت اسی مردِ درویش کا حصہ بن سکتی تھی اور بنی کیا لوگ تھے، پیار آتا ہے بے اختیار ایسے لوگوں پر، قول و فعل کے سچے اور کھرے ایک کام اور ذرا سلیقے سے اگر کر سکتے تھے تو مہر صاحب، ان سے ہوا نہیں، وہ یہ کہ لاہور کے دفاتر میں غالبؒ کی حکام انگریزی کے حضور پیش کردہ درخواستوں کا مجموعہ نکلوا کر چھپوایا جائے یا چھپوایا جاتا، ایک صاحب ہیں اکبر علی خاں، تعریف ان کی یہ ہے کہ مولانا امتیاز علی عرشی کے بیٹے ہیں، کچھ پڑھ لکھ بھی لیا ہے۔ نیاز فتحپوری لکھنؤ چھوڑتے بھی نہ پائے تھے کہ یہ حضرت نگار رام پور یا زار ادب میں لے گئے، امروہہ کے توفیق چشتی نے غالبؒ کا قلمی دیوان کھوج نکالا، اکبر علی لے اڑے، چھپوایا اور لے کے لکھ ڈالا "نسخہ عرشی زادہ" سبحان اللہ سبحان اللہ، مہر صاحب سے اس خفیف حرکت کا ذکر آیا تو فرمایا، کیا ہوا اگر ایسا ہوا، اب ہم کیا کہتے، لیکن سچی بات تو قلم کی زبان بنے بغیر نہ رہی، شیر بہادر پنی کے نام ایک خط میں مہر صاحب نے بے اختیار نسخہ امروہہ ہی لکھا ہے، پڑھ کر جی خوش ہوا، اسے کہتے ہیں حق بہ حق دار رسید غالب کو مرحوم سبقاً سبقاً پڑھ چکے تھے،

بہت بڑے اور منتخب کتب خانے کے مالک تھے، کچھ بیچ کھایا کچھ باقی تھا اسے بھی بیچنے کی فکر میں تھے، مشاہیر کے خطوں کا بے نظیر ذخیرہ منتظر اشاعت پڑا ہے تعریف سے پھولتے نہ تھے، طعن سے گھبراتے نہ تھے، انداز تحریر خطیبانہ ابوالکلام کے تتبع میں تھا، قلم سحر نگار بھی تھا سحر طراز بھی، اقبال کے صحبت یافتہ نہایت مہذب خلیق شریف اور نستعلیق آدمی تھے، بزم آرائی سخن وری اور نکتہ سنجی میں یکتا، شیخ مبارک علی سے تعلق خاطر بے پناہ تھا، تو تکار اور لے دے سے کم یہ بات نہ ہوتی تھی، زیادہ سے زیادہ کا اندازہ آپ خود کر لیں، ابوالکلام کے تو مرید تھے اقبال کے شیدائی تھے

غلام رسول مہر



۱۸۹۴ء ـــــــ ۱۹۷۱ء

محبت بھی تھی، اختلاف رائے سے چوکتے بھی نہ تھے، بڑی پامردی سے اپنے عقائد اور آرا پر قائم رہے، پاکستان کے حامی اور تقسیم پنجاب وبنگال کے مخالف تھے، سنی العقیدہ حیات مسیح کے قائل نہ تھے، نماز روزے میں باقاعدگی تھی حج بھی کر چکے تھے، یورپ کی سیر بھی دیکھے ہوئے، حقہ اور سگرٹ دونوں کے رسیا، جہاندیدہ آدمی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن سے مسلم ٹاؤن کتنی دور ہے، شوق ملاقات پا پیادہ کاشانہ مہر تک لے گیا وہ تو تھے نہیں پیغام دے کر چلا آیا، ایک آدھ روز کا وقفہ بہت ہوا۔ ملے اور کامل دو گھنٹے مجھ سے باتیں کرتے رہے یہ محض اس مرحوم کی بزرگانہ شفقت تھی مسافر جان کر اپنا وقت ضائع کیا، دلجوئی فرمائی، والد مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی، خواجہ حالی کے پرستار، کلیات حالی بہ طرز جدید شائع ہو، یہ تھی ان کی آرزو، مہر صاحب نے باتوں باتوں میں اپنی تجاویز لکھ کر میرے حوالے کر دیں

میرے علم کے مطابق خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی مسدس اور دوسری طویل نظموں کے علاوہ مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے

۱۔ دیوان حالی

۲۔ جواہرات حالی

۳۔ فارسی اور عربی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جس کا نام ضمیمہ کلیات حالی ہے

اگر تمام نظموں کو یکجا چھاپنا منظور ہو تو مضائقہ نہیں تاہم یہ مجموعہ ضخیم ہو جائے گا اور مطالعے میں سہولت نہ رہے گی میرے نزدیک مناسب یہ ہے،

۱۔ غزلیات اور رباعیات الگ چھاپی جائیں۔

۲۔ قومی نظمیں، مرثیے، ترکیب بند، ترجیع بند اور قطعات الگ شائع کئے جائیں،

۳۔ مسدس اور دوسری لمبی نظمیں الگ رکھی جائیں اس طرح ایک تقطیع پر تین حصوں میں پورے کلام کی اشاعت مناسب ہوگی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری مجوزہ ترتیب کے بجائے پورا مجموعہ دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے یعنی غزلیات، رباعیات، قطعات تاریخیں وغیرہ یکجا، قومی نظمیں، مرثیے، ترکیب بند وغیرہ یکجا،

مقدمہ جس میں خواجہ حالی مرحوم کے حالات اختصاراً درج ہوں صرف اس حصے کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے جو حجم اور ضخامت میں سب سے چھوٹا ہو، میرے اندازے کے مطابق غزلیات و رباعیات والا حصہ سب سے چھوٹا ہوگا تاہم یہ مشورہ سرسری ہے جو صاحب پورے کلام کی ترتیب کا اہتمام فرمائیں گے وہ غور و فکر کے بعد احسن صورت ترتیب تجویز فرما سکیں گے، حواشی مختصر ہونے چاہئیں یعنی صرف غریب و مشکل الفاظ و محاورات کی سرسری تشریح،

وہ لگی لپٹی رکھے بغیر لکھتے تھے، انداز خطیبانہ، زبان اور بیان لطف دونوں کا پایئے گا، اشعار خصوصاً فارسی کا برمحل استعمال اور بڑی کثرت سے" ایک خاص ادیبانہ بھی اور ناصحانہ شان، طوالت کلام کے ساتھ ساتھ بیزاری اور احساس ذمہ داری، خط کی رسید مرتے مرتے بھی ان کے قلم سے نکلی، جوابی لفافے بخوشی قبول کر لیتے، ٹکٹوں سے گھبراتے تھے، ٹکٹوں کا سنبھالنا دراصل مشکل تھا، اس تاک میں ہرگز نہ رہتے کہ کوئی چیز مفت ہاتھ آجائے تو برا کیا ہے، نہایت غیور خوددار اور بااصول سانچا تھا مرحوم کا، خط لکھنے کے لئے معمولی کاغذ بالکل ردی استعمال کرتے تھے، سرنامہ میں نے کبھی اردو میں چھپا ہوا تو دیکھا نہیں انگریزی ہی کو ترجیح رہی مرحوم بدخط تھے جوش میں آ کر اور بے رنگ ہو جاتے، اپنے قلم سے نکلی ہوئی بعض چیزیں خود ان سے بھی نہ پڑھی گئی ہوں تو کچھ بعید نہیں، پھر بھی خط انگریزی اردو شکستہ اور پختہ تھا، ہر خط کا جواب دیتے تھے اکثر بادل نخواستہ مگر دیتے ضرور تھے کافی وشافی، علمی ادبی، مذہبی سیاسی معلومات کا خزینہ تھے اور خوب پھیلا کر لکھتے تھے، پورے دستخط بہت کم کئے، البتہ رجسٹری سے بھیجے گئے لفافوں کی

رسیدوں پر اردو انگریزی میں پورے دستخط غلام رسول مہر موجود ہیں، مرحوم کی بدخطی سے میری نگاہوں کو اک گونہ مناسبت پیدا ہوگئی تھی، چند ایک ہی لفظ ہوں گے جو مجھ سے پڑھے نہ گئے ہوں، دو سو چونتیس خط اٹھارہ برسوں میں میرے نام آئے ہر تحریر میں نے سنیت سنیت کر رکھی جس کی داد ایک خط میں مہر صاحب نے بھی دی مکتوب نویسی ایک مشغلہ کم از کم میرا تو ہے اور یہ مجھ سا جھکی ہی تھا جس نے مکتوب نگار سے زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت اگلوا لیا، ایک خصوصیت ان خطوں کی یہ بھی ہے کہ میری حاشیہ آرائی پر مرحوم نے بھی جگہ جگہ اپنے اختلافی حاشیے سپرد قلم کئے ہیں بے حد گرم اور خشک، یہی نہیں بعض اصل تحریروں میں ردو بدل کے مرتکب بھی ہوتے، یہ تمام مکتوبی ذخیرہ " متاعِ نوش قماش " کے عنوان سے مرتب کر کے ابن مہر امجد سلیم علوی کے حوالے ہو چکا چھپ ہی جائے گا عنقریب،

مطالعے کی لت کیوں نہ ہوتی بلکہ دھت، مہنگی کتابیں خریدنے کے حق میں نہ تھے، معمولی کاغذ ہو، غیر مجلد ہو، چھپائی ناقص ہو، کتاب ہو، دقت نظر سے پڑھتے اور جگہ جگہ حاشیہ آرائی پورے اہتمام سے کرتے چلے جاتے، یہاں تک کہ کسی نے انشاء اللہ لکھا تو ان شاء اللہ، بدتوفیقی کو بے توفیقی، عزیزان کو عزیزوں، تقاضہ کو تقاضا، پتہ کو پتا ۵۲ء کو ۱۹۵۲ء بنا دیا، میں نے ایک بیاض میں یونہی ایک کونے پر غلط سلط ان کے بارے میں لکھ رکھا تھا، اوّل و آخر کانگرسی تھے، ان کی نظر کہاں چوکنے والی تھی، لکھا ہے، کون؟ اسی پر بس تھوڑی کرتے تھے اگر ایک نقطے ایک شوشے کی کمی بیشی ہوتی تو اس کی بھی چول صحیح بٹھائے بغیر دم نہ لیتے، مولانا مودودی کی تفہیم القرآن پر مرحوم کی حاشیہ آرائیاں معرکے کی چیز ہیں، دیکھئے کب روشناس خلق ہوتی ہیں میری کتابوں پر جہاں جہاں مرحوم نے کچھ لکھا ہے یکجا کر کے پیش کر دیا گیا ہے، لاکھوں صفحے پڑھے اور لاکھوں ہی لکھے ہوں گے، اخبار نویسی کے علاوہ بے شمار مضامین کتابیں اور رسالے مرتب فرمائے، خط نویسی میں بھی کمال رکھتے تھے، تصانیف کی فہرست بے حد طویل ہے، ان کے مرنے کے بعد جو کتاب میری نظر سے گزری وہ رسولِ رحمتؐ تھی، ایسے آدمی کا خاتمہ

مسلم ٹاؤن - لاہور

۱۰-دسمبر 1955 پاکستان

مکرمی - سلام نیاز دہلی جانے سے

پیشتر ایک ملفوف آپ کو بھیجا تھا - چونکہ

اس کا کوئی جواب نہیں آیا مجھے اس لیے تشویش رہی

ہے کہ خدانخواستہ آپ کو علالت نہ ہو -

الحمدللہ کہ عرصہ کے بعد آج آپ کا عطوفت نامہ

ملنے - میں پرسوں رات دہلی سے لوٹ آیا - بخیریت پہنچا

لیکن طبیعت بحال نہیں - اس خیال سے کہ

شاید آپ تک میرا خط نہ پہنچا ہو ورنہ جواب

لکھنا آپ کی طرف سے تاخیر ناقابل تصور تھی -

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے والسلام مخلص

نیاز مند


POST CARD
THE ANNEXED CARD
FOR THE
ADDRESS ONLY
PAKISTAN
POSTAGE

ظاہر ہے یا الخیر ہونا تھا، آخر آخر میں وہ سوشلزم کی طرف بھی مائل ہو گئے تھے، ایک ہفت روزہ لیل و نہار لاہور کی عامیانہ زبان کو نہایت عالمانہ تحریر کہتے ہی نہیں قصیدے لکھتے تھے، برسوں نظر انداز کئے جانے کا ردِ عمل ہی اسے کہئے، باقاعدگی مرحوم کی زندگی کا ایک حصہ بن کر رہی، معمولات میں یکسانی پیدا کر لی تھی، وقت ضائع کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے، کام گھٹی میں پڑا ہوا، کسی کے دستِ نگر نہ تھے، اپنے دست و بازو سے کمایا اور کھایا، گھر کے اندر اور باہر ساکھ بنی ہوئی تھی، بخیل تو نہیں جزرس ضرور تھے، اچھا کھایا اچھا پہنا، بچوں کو پڑھایا لکھایا، اپنی تمام تر ملکی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہر شادی غمی میں شریک، اردو کا معاملہ ہو تو جلوس میں پیدل پیش پیش، میری بیاض پر مولانا نے دو بار اپنی پسند کے شعر لکھے یہاں نقل کرتا ہوں

باسمہ سبحانہ

یایں ہمہ بے چارگی در ہیچ کسی — واماندہ بہ نارسائی و بوالہوسی
دادیم نشاں ز گنجِ مقصود ترا — گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

—٥—

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد است — عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است
تاجاں کہ تواند داد حال کہ تواند برد — جاں دادن و دل بردن ایں ہر دو خداداد است

۵۵/۵/۱۴ لاہور — مہر

باسمہ سبحانہ

آنانکہ غمِ تو برگزیدند ہمہ — در کوئے مراد آرمیدند ہمہ
در معرکہ دو کون فتح ز عشق است — با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

—٥—

طعنہ کم تر زن حرم جویانِ رہ گم کردہ را — ایں ملامت بس کہ ما راہ گم کردہ ایم

عرفی

مہر — مسلم ٹاؤن لاہور — ۲- جنوری ۱۹۵۶ء

مجھ سے مرحوم کی ملاقاتیں دو ایک جو ہوئیں وہ نہایت سرسری ہی تھیں، بہت چاہا محمد آباد آجائیں، صد سالہ تقریبات غالبؒ کے سلسلے میں کراچی گئے یہ ایک ترکیب اور تقریب نکلی تو تھی، طرح دے کر بالا ہی بالا نکل گئے۔ برسوں تصویر کے تقاضے کئے آج، کل پر ٹالتے رہے، بعد از رحلت ایک تصویر ملی، پتلون بوٹ چیسٹر ٹائی غالبی وضع کی ٹوپی ایک ہاتھ میں دستانے ایک میں چھڑی، گول تالوں کی عینک، ہلکی مونچھیں، بھاری بھرکم، سیدھے الف، جھکے ہوئے، گول چہرہ، چاہ ذقن، لمبی ناک، رنگ مجھے یاد ہے گندمی تھا، سیاہ فام نہ تھے، تصویر دیکھ کر کہنا پڑا، گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی آخر میں لباس اچکن اور شلوار رہ گیا تھا، قد خاصا کشیدہ، خوش پوشاک، خوش خوراک، مزاج میں نفاست اور شرافت بھری ہوئی، طبعاً لڑاکا نہیں تھے، کسی سے ٹھن جائے تو پیچھے بھی نہ رہتے تھے، صبح کی سیر میں ایک ملنگ کو میں نے ہمرکاب دیکھا ہے، جسم خاصا ورزشی تھا، پابندی اوقات مزاج کی ایک خصوصیت تھی، مقررہ وقت پر اپنے مطالعے کے کمرے میں آکر جاتے نہیں تھے جم کر کام کرتے اور اپنے قلمی معاون حضرت نشتر جالندھری کے ساتھ مل کر کوہکنی کرتے، احتیاج کا مرض عام ہے، بیسیوں غیر ضروری کتابوں کے ترجمے اچھی خاصی اجرت پر کر ڈالے، تحریک پاکستان کی کہانی لکھنے کا وقت نکل سکتا تھا، اگر کوئی اس کا معاوضہ دینے کیلئے تیار ہو جاتا، مرحوم نے پاک و ہند کے تقریباً ہر رہنما اور ہر تحریک کو قریب سے دیکھا ہی نہیں پرکھا اور برتا بھی تھا، وہ خود اس کا ایک حصہ اور سچ تو یہ ہے کہ تاریخ تھے، بہت کچھ لکھ سکتے تھے لکھنا چاہیئے تھا، لکھنا چاہتے بھی تھے، تاکہ نئی پود پاکستان اور اس کے وجود میں آنے کے محرکات کو سمجھ سکتی۔

لاہور مرحوم کا مرکز اور محور تھا، تقسیم ملک کے بعد وطن چھوڑنا پڑا، پنجاب کے حصے بخرے ہونے کا مرحوم کو بے حد قلق تھا، اس کی تلافی بہاولپور کو پنجاب میں ضم کرنے سے ہوتی ہے تو وہ اس کے حق میں تھے، مجھ سے خاصی جھڑپ بھی ہوئی، بدقسمتی یہ ہے کہ بہاولپور کا نام لیجئے تو تخریب پسند اور پاکستان دشمن کہلائیے، رشک ہندو پر آتا ہے اپنے انتظامی معاملات کو روبراہ کرنے کے لئے دس گیارہ صوبوں کا اضافہ کر لیا۔ اس

پر بھی خوش و خرم، نہ ملنے کا غم نہ کوئی اور اندیشہ، روس اور امریکہ بھی آخر مختلف قومیتوں اور صوبوں کا ملغوبہ ہیں اور کمال یہ ہے کہ زندہ ہیں، چھوٹی موٹی تو بس ہم ہی ہیں، مرحوم نے اپنی جائیداد کا کلیم بھی داخل کیا تو تھا شائد خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی بہر حال وہ اس سلسلے میں خاصے متحرک ہی رہے۔

انقلاب مہر اور سالک نے ظفر علی خاں سے ان بن کے بعد نکالا، نام علامہ اقبال کے دولت کدے اور موجودگی میں تجویز ہوا، علامہ نے ایک انقلابی سا شعر اور نظم بھی لکھی یہ اخبار بہت چلا، لاہور کی جان تھا یہ اخبار، مسلم لیگیوں سے اس کی بنتی نہ تھی، معرکے زمیندار سے بھی رہے، قومی مفادات پر لکھنے کا حق مہر صاحب ادا کرتے رہے، اپنے قلم سے مرحوم نے اتنا کچھ کمایا کہ مسلم ٹاؤن میں ایک شاندار بنگلہ بنوایا، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی جس سے دس بچے ہوئے۔

پھولپور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے، دس سال کے تھے کہ والد چوہدری محمد علی خاں کا انتقال ہو گیا، والدہ نے پال پوس کر جوان کر دیا، پڑھایا لکھایا، بی اے کر کے حیدر آباد دکن چلے گئے، وہاں محکمہ تعلیم میں گردش کرنے کے بعد پھر لاہور ہی کے ہو کر رہ گئے، ادبی سیاسی صحافتی حلقوں میں مقبول اور محترم، مقبول کم محترم زیادہ، ستر برس جیئے لاہور ہی میں دفن ہوئے۔

ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

۱۹/ جون ۱۹۷۶ء

[illegible]

غریقِ شعر و سخن

اذان انہوں نے کبھی دی ہی نہیں، اونچی آواز میں کم بولتے تھے، ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے تو لہجے کی درشتی میں ٹھہراؤ اور دھیما پن ضرور پایا جاتا تھا، غصہ پینے میں بلا نوش تھے، اپنا نقصان برداشت کرتے، اپنی جان پر کھیلتے رہتے زبان سے کچھ نہ کہتے، صبر و ضبط کا پیکر تھے، صدمات سے بچپن میں سابقہ پڑا، عمر بھر بڑے حوصلے سے سہے، بدمزاج ملازمین سے برسوں معاملہ رہا، خوش مذاقی سے بدکلامی کے نشتر سہتے اور ہنسی میں اڑا دیتے، صابر و شاکر تھے، بیشتر اوقات ان کی بے زبانی زبان بن جاتی، ہنستے مگر قہقہے بہت کم لگاتے، خندۂ دنداں نما تک پہنچتے ضرور ہوں گے، مگر رومال کو ہمیشہ آڑ بنا لیتے، کالعدم الوجود، اجڈ کم عقل مزارعین ہوں یا ملازم یکساں مہر و مروت سے پیش آتے، خفا ہوتے تو کام بند کرا دیتے، جسمانی سزا کبھی کسی کو دی نہیں، زباں دراز تو تھے ہی نہیں گالی بکنا کیسا، "بیوقوف" جلالی کیفیت کا آخری ہتھیار تھا، جسے وہ بڑی احتیاط اور تحمل سے استعمال کرتے، غلط کارکردگی پر جرمانے عائد کرتے، سال بھر میں ایک بار سب مل بیٹھتے سب کا کچا چٹھا بالفاظ دیگر نامۂ اعمال پیش ہوتا، جرح قدح ہوتی، مین میخ نکالی جاتی، بجائے اڑتی، کپاس کتنی آئی کس حساب سے بکی، سب کی بے اعتدالیاں درجِ بیاض، کوئی لاکھ مگرے حوالے اور گواہ ایسے کڑے اور سخت کہ بچ کر نکلنا محال تھا، ردوکد بہت کر لی، اب منت سماجت ہو رہی ہے، یہ کھیل ہر سال ایک بار ضرور ہوتا، سبھی جانتے تھے حق کسی کا مارا نہیں جانے کا، جرمانے معاف ہوئے، سخت سست بھی نہ کہا گیا۔ جلی کٹی سننا سنانا کیسا، گویا ایک کنبے کے افراد مل بیٹھے اور اپنے سرپرست اعلیٰ سے اپنا دکھ درد بیان کیا، کاشتکار تین تین پشتوں کے ساتھی، اتنا کام کئے ہوئے کہ جی مرحوم کا

یہ چاہیے تھا ایک ایک سال کی تمام پیداوار ان کے حوالے کر دی جائے، جوانی میں خود بھی ہل چلاتے، کھیتوں میں کام کیا، وجع المفاصل نے قبل از وقت حجرہ نشین کر دیا تھا اس معذوری میں بھی چارپائی پر لد کر کھیتوں کی دیکھ بھال کو نکل جاتے،

اسراف سے بچتے تھے، بلا کے کفایت شعار، جزرس ضرور تھے، بخیل اور کنجوس مکھی چوس قطعاً نہیں تھے، احباب اور معززین کی پذیرائی دل کھول کر کرتے اور ایک کی جگہ دس لٹاتے، جی لگا کر خرچ کرتے اور حوصلے نکالتے، ہر چیز پر نظر رکھتے، بلا ضرورت اگر لالٹین کی بتی بھی اونچی دیکھتے تو اس اسراف سے منع فرماتے، خصوصاً ایسے مہمانوں سے بہت چڑھتے تھے جو لمبی تان کر سو جاتے اور لالٹین پوری آب و تاب سے رات بھر جگمگاتا رہے، کہنا چاہیئے خواب دیکھنے کے لئے بھی روشنی کی ضرورت ہے۔ اس وقت ان کی خفگی اور بے بسی کا عالم دیدنی ہوا کرتا جب کوئی دوست خواہ مہمان ناوقت آتا، گھر میں بیچارگی کے ساتھ بڑبڑاتے اور تلملاتے رہتے، تاؤ کھا رہے ہیں، خون کھول رہا ہے مگر پاس وضع یہ ہے کہ جو دل پر گزرتی ہے زبان پر نہیں لاتے، آنے والے کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا، یہ علم ہی نہیں ہوتا درویش نے کیا قہر اپنی جان پر توڑا، خواتین کے لئے چولہے اور ہر چیز کا دوبارہ تازہ کرنا وقت طلب اور مشقت آمیز تھا، لیکن یاروں کی وضع بھی ایک ہی رہی، بچپن کے ایک دوست مولوی غلام حسین عمر بھر تو برسوں عشاء کے بعد ہی پہنچتے رہے، بڑبڑ ہوتے مگر کہہ کچھ نہیں سکتے تھے، بارہ بجے رات تک عموماً نشست رہتی، برسوں یہ معمول رہا، بے حد قلیل آمدنی اور ایک بڑے کنبے کی ذمہ داریوں اور کفالت کے باوجود اچھی خاصی شہری جائیداد بنالی تھی، نقشہ نویس تھے، ہر سال کوئی نہ کوئی تعمیری سلسلہ کھڑا کر لیتے، کچے پکے کمرے کوٹھریاں بنتے اور ٹوٹتے رہتے، استاد لقمان سنجر پوری سے باقاعدہ سیکھے ہوئے بہت اچھے بڑھئی تھے، ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھڑکی تو اس وقت بھی موجود ہے، البتہ آرے اور دیگر ساز و سامان برسوں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد غائب ہو گئے، سخت جسمانی مشقت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے جس کام کو ہاتھ میں لیا تمام کر کے چھوڑا، دھوپ ہو، لو ہو، دسمبر کے جاڑے ہوں ڈٹے رہتے، وہ اعلیٰ درجے

سیّد مُبارک شاہ جیلانی



۱۳۱۷ھ ——— ۱۳۸۹ھ

کے منتظم اور کارکن تھے،

ہلکے پھلکے مزاحیہ فقروں سے رنگ محفل نکھر جاتا، گھٹی گھٹی فضا میں ان کا دم گھٹتا تھا، امراء اسی لئے دور دور رہتے تھے، غربا اور مساکین سے انتہائی رواداری، میل جول اور نشست برخاست بھی چلتے پھرتے رہتے، اک ذراسی تحریک پر موالی نامی مجذوب کی بے لگام گفتگو کا آبشار بہہ نکلتا، سبھی محظوظ ہوتے، ایک دوست کو گاندھی کے نام سے چڑ تھی یہ ہر وقت اسی کا نام کیا لیتے اس کے نام کی مالا جپتے رہتے، ظرافت پر خود بھی مرحوم نے لکھا ہے، اُسے یہاں نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

"صفات کی تکمیل تو اولیائے کرام ہی کر سکتے ہیں، ہم لوگ ایک صفت کو جزوی طریق پر اگر بناہ لیں تو ہمارے لئے بڑا کارنامہ ہے، میں بالطبع خوش مذاقی زندہ دلی کا جویا رہتا ہوں، ظریفانہ شاعری کو پسند کرتا ہوں گھنٹوں لطف اٹھاتا ہوں، جب کوئی ہنسوڑ مل جاتا ہے خوب خوش ہوتا ہوں، عامیانہ ظرافت میں بھی بعض لوگ کمال کر دکھاتے ہیں، اس کمال کو تلاش کرتا ہوں، بعض لوگ فطرتاً "مزاح" ہوتے ہیں، ان کی شکل دیکھنے سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے ان کے طرز عمل میں ہنسی ہی ہنسی ہوتی ہے، تمسخر ان ہی سے ادا ہو سکتا ہے جن کی گھٹی میں مسخرا پن ہوتا ہے، عامیانہ ظرافت و مطائبات میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، شوکت تھانوی اخبار میں روزانہ لکھا کرتے ہیں، میں نے ان سے زیادہ لطف حاصل نہیں کیا، یہ چیز بھی ارزاں نہیں ہے اور اخبار نویس اپنے کالموں کی دکان اچھی چیز سے کم اور فضول سے زیادہ سجایا کرتا ہے، ایک آدھ فقرہ میرے معیار کا نکل آتا ہے بعض ان پڑھ بھی غضب کے ہوتے ہیں ایسی باتیں کرتے ہیں کہ میں لوٹن کبوتر بن جاتا ہوں اس علاقے میں کالو میزبجر اچھا نقال ہے، تھانیدار زمیندار واعظ کے پارٹ طنزیہ ادا کرنے میں اچھا سلیقہ رکھتا ہے، ایک صاحب بہاولپور کے رہنے والے

تھے وہ دیوارِ قہقہہ تھے، بات بات میں ایک عالم ظرافت رکھتے تھے
میں نے خط وکتابت میں مزاحیہ فقرے بہت کم استعمال کئے ہیں اکبرؔ
کے کلام کے سوا کوئی اور نہیں جچتا۔"

گھنٹوں اپنے کاشتکاروں سے زمانے بھر کی باتیں کرتے، وہی ان کے دمساز اور غمگسار بھی تھے، اولاد تو گویا نہ ہونے کے برابر ہی رہی۔ یہی حال بھتیجوں کا تھا پال پوس کر مثل اپنی اولاد کے جوان کر دیا، چھوٹے میاں تو خیر چھوٹے میاں تھے ہی بڑے میاں واقعی نکلے سبحان اللہ، اپنی اولاد، اعزہ واقربا کی دنیاوی دینی ہر طرح کی ترقی کے جویا رہتے تھے، عام لوگوں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھتے تو مشفقانہ رشک مسرت آمیز کا اظہار فرماتے اور سب کو کارزار زیست میں بڑھ بڑھ کر جادہ پیمائی کی تلقین تو بہر حال کیا کرتے واعظانہ نصیحت بھی نہیں بس مشورہ ہی کہہ لیجئے، لطیف اور لذیذ انداز فہمائش، نہ کسی کے احساسات مجروح ہوں نہ عزت نفس پر حرف آئے، ہاں بیکاری کھلنے لگے۔ بیگار بھلی لگے، خاندان کے ایک نوجوان پیر علی شاہ نے بی لے کر لیا، ہر ایک سے کہتے تھے اور اپنی یادداشتوں میں ہمارے خاندان کا پہلا بی اے کے عنوان سے لکھا بھی، کفِ افسوس یہاں بھی ملتے ہیں۔

"زمانہ کی پکار تھی کہ اے سادات لو شریف (لوگ احتراماً گھوٹکی کو اس نام سے یاد کرتے ہیں) جدید تعلیم حاصل کرو، مقتضیات وقت کا ساتھ دو، ہوا کے رخ کو دیکھ کر کشتی چلاؤ، یہ للکار سرسید دے رہے تھے لیکن ہم خوابِ گراں سے اب چونکے، حیرت ہے کہ سرسید کی گونج نے ہمیں آج بیدار کیا ہے، اگر آج سے ساٹھ ستر برس بیشتر ہندو کی طرح ہم نئی تعلیم میں لگ جاتے تو ہمارے گھرانے کے افراد جماعت بن کر سندھ میں پھیل جاتے چھا جاتے اور ترقی یافتہ ٹولی میں پیش پیش رہتے،"

کام چور سست رو اور کاہل الوجود لوگوں سے گھبراتے تھے، مشٹنڈے

بھک منگوں کو قطعاً خاطر میں نہ لاتے کوئی گن کوئی ہنر ہونا چاہیئے، بڑا بیٹا پرلے درجے کا نافرمان خودسر خودرائے بالکل الگ تھلگ، مگر کماؤ اور محنتی، اس سے غرض نہ تھی چالبازی سے روپیہ بٹورتا ہے یا چوربازاری سے، مرحوم کی طمانیت کے لئے یہی کافی تھا کسی کا دست نگر نہیں ہے خود کماتا اور خود ہی لٹاتا ہے، جھانسہ دے کر چونتیس ہزار روپیہ خزانۂ سرکار سے قرض کی مد میں نکلوالے گیا، بیسیوں تقاضوں کے بعد صرف تین ہزار روپے اس بھاگتے چور سے نکلوائے اور توب زہر اگلا گیا، خاموش سنتے رہے، کہا تو صرف یہ کہ تین ہزار ہی سہی اس نے دیئے تو، کیا حوصلے کے لوگ تھے،

مرحوم کے مزاج میں عاجزانہ انکسار تھا، عجز و تواضع کا مرقع تھے، جس سے ملتے نہایت خوش دلی اور مسرت کا اظہار فرماتے، بے تکلف دوستوں کی آمد پر کھل اٹھتے بعضوں کی تو ضرورت سے زیادہ آؤ بھگت کرتے بچوں کی ذہنی نشوونما کا تماشا گھنٹوں دیکھتے اور اس مطالعے کو سب سے افضل جانتے، بچوں کے برتن توڑنے پر بھی لطف و مسرت کا پیکر بن جاتے ان کی پلیٹ میں سے اچھی اچھی بوٹیاں ان کی پوتی تمکنت چن چن کر کھالیتی تو بس مسکراتے رہتے ہاتھ اس کار دکتے ہرگز نہ تھے، وہ بڑے بے ضرر، صلح کل شریف النفس رقیق القلب خوددار انسان تھے ان کے مزاج میں بلا کا انکسار تھا طبیعت میں بے پناہ نوازش تھی، سادگی اور فروتنی کا یہ حال تھا کہ ہم قوم امرا سے نہایت عاجزانہ اور نیازمندانہ ملتے، پاؤں تک چھولیتے، یہ سب ظاہری یا ظاہرداری نہیں صدق دل سے تھا، ٹوکا تو فرمایا وہ اسی احترام کے مستحق ہیں۔ وہ بے ریا بے غرض بے لوث آدمی تھے خوشامد اور چاپلوسی کے فن میں کورے تھے، دل میں درد تھا کسی پر ہاتھ کیا اٹھاتے ظلم سہتے اور اٹھاتے ہوئے کسی کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے، انسانی مساوات کے حامی تھے

خط بے حد پاکیزہ اور پختہ تھا، اسلوب بیان سادہ مگر پرکار، شاعرانہ مبالغہ آرائی کا ترشیح بس ہلکا سا، قلم برداشتہ نہیں لکھ سکتے تھے، خوب سوچ سمجھ کر لکھتے، بار بار نوک پلک درست کرتے، مضامین ہی نہیں خط بھی بار بار لکھتے، اشعار اور مختلف لطیف تراکیب بڑی خوبصورتی سے کھپاتے، بولی ٹھولی کا مزہ تو نہیں البتہ شعر بلکہ سحر آمیز

۹ مارچ سنہ ۸۵ء

نورِ نظر — انیس

پھر کوئی خط نہیں ملا۔

آج مہدی کو ۲۵۰ روپے تار کے ذریعہ ارسال کر دیے ہیں۔

ان کو لکھ دیا ہے آپ اُن سے لیکر کے بھیجے

میں نے جناب معز الدین صاحب کو خط لکھا ہے۔ جس وقت واپس ہوں گے

یہاں آئیے — [illegible]

آپ کس جگہ قیام رکھتے ہیں ۔ ؟ [illegible]

کس تاریخ تک رہیں گے ؟ [illegible]

آجکل یہاں کے حالات بہت تشویشناک ہیں

بڑی احتیاط سے رہیے ۔

جیسے کمال سکون ہو جائے — گھر آئیے ۔

ادیبانہ شان ان کی تحریر میں پائی جاتی تھی، شوکت الفاظ وصف خاص تھا، عامیانہ اندازِ نگارش نہ پسند تھا نہ اختیار کیا، خود اپنے ہی سوز باطنی سے انہوں نے ایک شمع روشن کی اور ایک راہ نکال لی، صاف سیدھی جھاڑ جھنکار سے پاک، ہریالی اور پھول پتیوں سے لبریز اور سرشار، لکھتے وہ بہت کم تھے بہت ہی کم، جو کچھ لکھتے ایک سے زیادہ بار پڑھتے، تیسری چوتھی پانچویں حتیٰ کہ چھٹی کوشش میں مضمون کچھ سے کچھ ہو جاتا، ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ نظر میں رہتا، جہاں کوئی نیا لفظ نیا فقرہ سوجھتا بدل دیتے، اس پر بھی وہ کہتے یہ سب کچھ حرف آخر بہر حال نہیں ہے، ان کی نگارش کے لئے ہم بغیر کسی الجھن کے کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہے بس انتخاب ہے، مستقل کتاب انہوں نے کوئی نہیں چھوڑی، متفرقات ہی مرتب کر دیئے جائیں تو مقبول خاص و عام ہو جائیں مکتوب نگاری کے گُر وہ خوب جانتے تھے، استقبالیے تو غضب کے لکھے، وزیر زراعت کی آمد پر دیکھئے کس طرح رعایت لفظی کے جوہر دکھائے ہیں۔

" جب موسم گُل آتا ہے تو بلبل حسن پرستی شروع کر دیتی ہے صبا بیدار ہو کر فضا کو معطر کر دیتی ہے، آپ کی تشریف آوری سے وہی گل و بلبل کا طربیہ سماں ہے آپ کے خیر مقدم کے لئے یہاں کی آبادی دعائیہ مدحیہ ترانے گا رہی ہے۔

ع وصال یار کی مسعود ساعتیں مت پوچھو

آپ مختار ہیں شبنم کے نہیں دریاؤں کی عنان آپ کے ہاتھ میں ہے بالفاظ دیگر شراب طہور کے دریا دل ساقی، ہماری ضروریات عندیات داعیات، جس نوع کے ہیں آپ اس سے باخبر ہیں سوتوں کو جگانے والے، ہمیں یقین ہے جدید زرعی ترقیات سے ہمیں مالا مال کیا جائے گا اور عملی پروگرام میں برق رفتاری فرما کر ہمیں اس مقام پر پہنچایا جائے گا۔ جس کے ہم اور آپ خواہاں ہیں۔

سوئے غریباں بنگری ...."

مرحوم کی تحریروں میں جدت اور ندرت پائی جاتی تھی، بیگم رئیس احمد جعفری مہمان ہوئیں، گھر میں کہیں پچکی سے شغل فرمایا، دیکھا تو سامان ہو گیا پورے ایک مضمون کا، پچکی کا سپاسنامہ عنوان باندھا اور اس پتھر کارتبہ حجرِ اسود سے ثابت کر کے چھوڑا چونکہ یوپی والوں پر جان چھڑکتے تھے تان اس پر توڑی کہ

"آپ کی تہذیب اور زبان پر یہاں کے پتھر بھی مرتے ہیں"

سیاسیات حاضرہ اور ملکی امور سے عملی دلچسپی تو مقامی اور واجبی سی لی لیکن بالکل کورے بھی نہیں تھے، ایوبی بنیادی جمہوریت کے دور میں یونین کونسل کی رکنیت کے لئے انتخاب لڑا اور بڑی اکثریت سے جیتے، یہ محض اس لئے تھا کہ اپنے بھتیجے کو صدر یونین بننے میں دقت نہ ہو، مشکل نہ پڑے، کانگریسی ٹولے میں ابوالکلام آزاد بھی سکھر پہنچے، بطور خاص جاکر ملے، سکھر سے پیدل خیرپور میرس سیاسی اجتماع میں شریک ہوتے تقسیم ملک کے خلاف تھے مگر جب پاکستان بن گیا تو اس کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا، مودودیوں کی تنگ نظری سے گھبراتے تھے، جماعت اسلامی کے بارے میں کہیں لکھا ہے۔

"اس جماعت کی اولین تعلیم یہ ہے کہ مقابر اور پیرانِ عظام سے نفرت اور احتراز کیا جائے جو لوگ جماعت سے باہر ہوں انکو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے، غیر جماعتی سے محبت و میلان نہ رکھا جائے صرف کاروباری تعلقات تک روابط ہوں"

نئی روشنی کا آدمی خواہ وہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کیوں نہ ہو، آجائے تو ان کا خیال تھا پاکستان سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہو جائے گا، یہ وہ دن تھے جب بھٹو کے برسراقتدار آنے کا سان گمان بھی کسی کو نہیں تھا ملکی معاملات میں ان کے معتقدات بڑے دلچسپ تھے، مثلاً تعطیلات کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، جو قوم عورتوں کا رتبہ مردوں سے کم جانتی ہے وہ ظالم ہے، بدقسمت ہے وہ ملک جس میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے نہ ہوں، زبان ایک اور وحدت خیال نہ ہو تو خانہ جنگی

جاری رہے گی۔

چہرہ کتابی، نوکیلی چبھتی ہوئی ناک، نکلتا ہوا قد' بھاری ڈیل، کشادہ پیشانی زیادہ کشادگی فارغ البالی کی وجہ سے بھی آگئی تھی اور بھلی لگتی تھی، داڑھی خشخشی بس داڑھی کی معذرت ہی کہہ لیجئے، سخت ناپسند مگر بزرگوں کی روایت پر کاربند، مونچھیں اور پٹے، کلے بھرے ہوئے، گندمی رنگ عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا، آنکھیں چھوٹی مگر چمکدار، آنکھوں سے یاسیت آمیز رومانیت ٹپکتی تھی، موٹا جھوٹا پہنتے، تہبند اور بغیر کالر کی قمیض لباس تھا، شلوار بھی پہنی جب آتش جواں تھا، طبعاً اردو تھے اس لئے ٹخنوں پر گرتے پاجامے کی قید لگا دی' عمامہ سبز، کسی تقریب میں جانا ہو تو اس کا باندھنا ایک مسئلہ بن جاتا، یار بار کھولتے باندھتے / جی تب بھی نہ ٹھکتا، ہرا رنگ ہی پسند تھا' سبز پگڑی والے کسی قدر مشہور بھی ہوئے' خاصے جامہ زیب، جو کچھ پہن لیا سج گیا' جوڑے الغاروں نہیں دو حد تین سے زیادہ کبھی نہیں دیکھے گئے، گھر میں عام ربڑ کی چپل، کہیں جانا ہوا تو بہادرپوری سادہ نرم جوتی، کسی پہلونشیں کی قوتِ شامہ آلودہٴ خلش نہ ہو اس لئے عطر ضرور لگاتے تھے جوانی بڑھاپے میں وزن قریب قریب دو من دو سیر سے نہ گھٹا نہ بڑھا، آخری دو سال البتہ دھوپ چھاؤں سی رہی، ہاں یہ تو میں بھول ہی رہا ہوں، بتیسی ہم نے ان کی دیکھی ہی نہیں، اتنا ضرور تھا کہ ایک ہی داڑھ رہ گئی تھی جس پر وہ پیسٹ اور برش گھسا کرتے تھے،

اشعار ایک خاص ترنم سے گنگناتے، نفسِ مضمون اور موضوع سے انہیں زیادہ دلچسپی نہ تھی بس چست فقرے شعریت سے لبریز اور ادبیت سے معمور جملے لطف لے لے کر پڑھتے سینکڑوں مصرعے اور اشعار زبان پر تھے حالی اقبال سعدی کا انتخاب نہایت کڑا کیا اور خوشخط لکھوا کر محفوظ کر دیا، آیئے دو رئیسوں' رئیس احمد جعفری اور رئیس امروہوی کی آرا بھی ان انتخابات کے باب میں پڑھتے چلیں،

"انتخاب کلام اقبال کے سلسلے میں ان کے رہنما اصول یہ تھے

کہ اقبال کے پیغام کی تصویر سامنے آجائے اپنے مذاق کا بھی پاس رکھا جائے ایسے اشعار

چنے گئے ہیں جو حسن بیان اور معنویت کے لحاظ سے گل سر سبد کی حیثیت رکھتے ہیں

انتخاب کرنے والے کی نظر مغزِ سخن پر رہی ہے، اس نے پتھروں سے ہیرے نکالے ہیں اور خس و خاشاک سے موتی چنے ہیں "۔

(رئیس امروہوی ۱۹۶۷ء)

" اقبال کے کلام کا انتخاب بہت بڑی جرأت ہے اس کا تسلسل اس کی روانی اس کی معنویت اس کا جوش و خروش انتخاب کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، یہ کام ایک بالغ نظر اور پختہ کار انسان ہی کر سکتا ہے، شاہ صاحب کی اصابت رائے وجدان صحیح اور ذوق ادب کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں لیکن اس انتخاب نے ان کی شخصیت کا ایک غیر معلوم گوشہ بے نقاب کیا، واقعہ یہ ہے کہ اگر اقبال کے کلام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے تو اس سے اچھا نہیں کیا جا سکتا، انتخاب کے سلسلے میں شاہ صاحب نے اپنے اوپر کچھ پابندیاں بھی عائد کر لی ہیں عام اشعار، منظومات تراکیب جدیدہ نیز اخلاقیات رومانیات اور سیاسیات کے عنوانات بھی پیش نظر رکھے ہیں اس طرح یہ کام اور دشوار ہو گیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ دشوار کام بڑی خوبی سے شاہ صاحب نے سرانجام دیا ہے "

(رئیس احمد جعفری ۱۹۵۴ء)

حافظ کی خمریات کو جوں کا توں نقل کرایا، فرماتے ہیں۔

"میں اردو فارسی نثریات نظمیات سے ایک جامع انتخاب کر رہا ہوں، جسے زبور اردو اور انجیل فارسی کہنا بے جا نہ ہوگا اردو میں اپنی نوعیت و افادیت کے لحاظ سے یہ پہلی کوشش ہے اس کے مطالعہ سے ادب عالیہ کا ذوق پیدا ہوگا ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی کا مفہوم سمجھ میں آئے گا، خمریات حافظ میں انتخاب کو دخل نہیں دیا گیا شراب اور اس کے متعلقات میں جو اشعار ہیں

ان کو یکجا کر دیا گیا ہے،

(سید مبارک شاہ جیلانی ۱۹۶۸ء)

شادی بیاہ کے ہنگاموں میں بھی مشاعروں کی صرف انہی کو سوجھتی تھی سفر میں کتاب ضرور ہاتھ میں رکھتے تھے، نمائش کے لئے نہیں بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ کتاب کے بغیر آدمی ادھورا رہ جاتا ہے، ڈوب کر پڑھتے تھے، لکھنے کا ڈھنگ بھی مشق و مزاولت سے آگیا تھا،

شاعرانہ ذوق ادبی نفاست مذہبی فراست تاریخی بلوغت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، وہ کہیں سرزمین یوپی میں پیدا ہوئے ہوتے تو حالی شبلی نذیر احمد سے کسی طرح کم نہ پڑتے، کتابوں کے بے طرح عاشق تھے، پرانی کتابیں جمع کرنے کا لپکا تھا، اسی پھیر میں نئی بھی خرید نہ پاتے اور یہ نئی پرانی بن جاتیں، کلاسکس کو خاص اہمیت تھی، گلستاں کے آپ بیسیوں ایڈیشن چھپوا ڈالئے، آپ چھاپتے چھاپتے عاجز آجائیں گے مگر وہ ہیں کہ ہر نئی اشاعت کو اشاعت اول سمجھ کر خریدتے رہے، البتہ مخطوطات کو تبرک جان کر رکھ لیتے اپنے آپ پر مسلط نہ ہونے دیتے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ یونہی ڈال دیتے تھے، ایک حصہ مخطوطات کا بھی یادگار ہے، ڈیڑھ پونے دو سو قلمی نسخے کچھ کم تو نہیں ہوتے، ایک ایک پرزہ سنبھال کر رکھا، یہی حال خطوں کا تھا مشاہیر عصر ہی نہیں عام دوستوں کے خط بھی سینت سینت کر رکھے اور خوش نویس تو چاہے کوئی ہو ان کی کمزوری تھا، جو کچھ لکھتا حرز جاں بنا لیتے اور ہر ایک سے تعریف کرتے اور کہتے، دیکھو کتنا اچھا لکھنے والے نے لکھا ہے، مرحوم کے مزاج کی افتاد کا تھوڑا سارا اندازہ ان کے بیان سے بھی کر لیجیے،

"میرا موضوع مطالعہ شاعری ہے یا پھر ادب عالیہ، سائنٹفک مضامین سے دلچسپی ہے، مطبوعات جدیدہ کا عنوان بڑے شوق سے پڑھتا ہوں خود نوشت حالات یا آپ بیتی سے لگاؤ ہے، مختصر افسانے پسند کرتا ہوں، ادبی شاہکاروں کو جمع کرنے کا عشق ہے اگرچہ

ان کو تو پڑھ سکوں لیکن جھپا کرنے کا شوق ہے، تذکرۃ الشعراء سے رغبت ہے تاریخ سے گریز ہے اور اندازہ ہے کہ تاریخ دفتر مناقب ہے قیاسی اور غیر یقینی باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے، بیشتر حصہ کذب وافترا ہے اور باقی حصے کے متعلق بھی حسن ظن نہیں، کذب وصدق گڈمڈ ہو گیا ہے، مفروضات اور موضوعات کے مطالعے سے ضیاع وقت کے سوا اور کیا ہے،

ع ~~ اک دلچسپ مشغلہ ہے بیکاروں کا

جو ادیب نہیں شاعر نہیں ادبی ذوق نہیں رکھتا اس کی بدقسمتی پر جس قدر رو دیا جائے بجا ہے،

بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں

"انسان کامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعر ہو سخن سنج ہو"

یہ بہر صورت اپنے اپنے ظرف اور فکر و نظر کی بات ہے،

سندھی اور سرائیکی مادری پدری زبانیں تھیں مگر وہ مرحوم اوّل و آخر اردو تھا اردو سے ان کی شیفتگی کی داستان طویل نہ سہی مختصر بھی نہیں، تعلیم مرحوم کی مکتبی نہیں مسجدی تھی، میلوں پیدل چل کر کبھی اس مُلائے مسجد سے کریما و "جلی قلم" کا سبق لیا کبھی اس مُلّائے حجرہ گیر سے گلستان کا کوئی باب پڑھ لیا، سند اُن کے پاس کوئی نہ تھی حرف شناسی کا جوہر یقیناً اکتسابی ہی نہیں الہامی بھی تھا، ایک ذوق تھا اور یہ وہ چیز ہے جو کسی کی میراث نہیں، یہ عطیہ غیب کا ہے، سُنیے سو برس کیا پچاس برس پہلے اردو کا چلن یہاں عام تو کیا، تھا ہی نہیں فارسی دفتری زبان تھی، سرکار دربار میں اسی کا طوطی بولتا تھا، مرحوم کی گھٹی میں اردو نجانے کیوں کر پڑی، سرزمین بہاولپور کے صحرائے شعر و سخن میں تنہا یہی ایک مجنوں جادہ پیما نظر آیا اور آبلہ پا بھی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں یہ بھی کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، میلوں، میلوں کوئی صاحب ذوق نظر نہ آئے بس اپنی ذات ہی کو انجمن تصور کر کے چند مجھے جیا دادا کے مزے لوٹے جا سکتے تھے، کوئی

اچھا سا نثری مجموعہ کوئی پھڑکتا ہوا مصرع دلگیر ہوا، اب آپ لاکھ چاہیں جس لطف سے آپ شادکام ہوتے اس کی لذت میں کسی اور کو بھی شریک کریں تو یہ ممکن ہی نہ تھا۔ خود اپنی ہی آگ میں جلئے اور کڑھیے سر دھنئے چاہے خاک ڈالیے کوئی پرسانِ حال ملنے کا نہیں، ہم مذاق ڈھونڈے سے نہ ملا، کتابیں رسالے اخبار پڑھنا اور آتشِ تنہائی میں سلگتے رہنا قحط الرجال کی شکایت بھی کس سے کرتے، اپنے آپ سے باتیں کی ہیں۔

"میرا ماحول جہلستان کے نام سے موسوم ہے کتابیں پڑی ہیں اور میری خام نویسی کاغذ پر نقوش چھوڑ رہی ہے لیکن نہ کوئی داد دینے والا ہے نہ مطالعہ کرنے والا، میری چالیس سالہ زندگی میں یہاں کی سرزمین کوئی لالۂ صحرائی نہیں پیدا کر سکی، جب مادرِ محمد آباد کی حقارت کا یہ عالم ہو کوئی ادبی فرزند پیدا نہ کر سکی پھر مستقبل جو تاریک نظر آتا ہے اس پر کیا اظہار مسرت کیا جائے، ادبی دور اس وقت ہوگا جب زمانہ بہ اندازہ پچاس سال ضعیف ہو چکے گا شاید یہ بھی غلط ہو، اس وقت نہ میرے نام لیوا ہوں گے، روح بھی یارانِ وطن کی بدذوقی سے تنگ آکر وطن کو خیرباد کہہ دے گی" (۱۹۳۸ء)

اس یکتائی نے اُس مرحوم کو ٹھٹھرایا نہیں گرمایا، اپنی دھن میں اور پکا کر دیا، لگن میں یکسوئی اور اضافہ ہوتا چلا گیا، زمانے کی ستم ظریفیوں نے سخت کوش بھی بنایا، وہ سچ مچ کے جنگل میں رہتے تھے، نہری آبپاشی نظام تو کہیں برسوں کے بعد جاری ہوا اور اب جہاں ہرے بھرے کھیت نظر آتے ہیں، یہاں درندوں کے مسکن تھے، آمد و رفت کے راستے مسدود، اب تو خیر جگہ جگہ پختہ سڑکیں ہیں تب کیا تھا، دن کے اجالے میں بھی سفر کرنا جواں مردوں کا کام تھا، ریاست بہاولپور کا وہ حصہ جو سندھ کی سرحدوں کو چھوتا ہے۔ یہیں تحصیل صادق آباد کے ایک منے سے گاؤں محمد آباد کا یہ ادبی مجاہد ہمارا ممدوح اور موضوع ہے جی ہاں وہی سید مبارک شاہ جیلانی، نیاز فتحپوری کے نگار کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے معارف بھی

آتا رہا، ابوالکلام کے الہلال کو بھی پڑھا، متاثر وہ نیاز زیادہ ہوئے تھے، خصوصاً ان کی انشاپردازی سے، جملوں کی ساخت کیسی اور کیوں کر ہونی چاہیئے اور چول کس طرح بیٹھتی ہے یہ انہوں نے میرا خیال ہے نیاز ہی سے سیکھا بلکہ وہ توان کا سورما کس ڈھب کس دھج کس پہلو سے بیٹھ کر لکھتا ہے یہ دیکھنے کے لیے بھوپال جا پہنچے تھے گوہر مقصود کے انتظار میں ڈیرے ایک سرائے میں ڈال دیئے، نیاز آئے تو اپنے دیوانے کو لے جاکر اپنے پہلو میں ٹھہرایا، لکھنؤ لے گئے، وصل کدے میں ریاض خیر آبادی کی ہم نشینی کا مزہ چکھایا، پھر کیوں نہ اپنی خوبی قسمت پہ ناز کرتے کہتے تھے میری کیفیت ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم سے مختلف نہ تھی جو کچھ سنا بہت کم سمجھا اپنی کیا کہتے، اس عقیدت کے باوجود لکھا ہے

"نگار کا مذہبی حصہ تیس برس کے بعد مطالعہ کیجیے
عنفوان شباب میں اس جام لبریز کو ہاتھ نہ لگایا جائے،،

یہ سفر ۱۹۲۵ء میں کیا، ۱۹۲۶ء میں مبارک جیلانی لائبریری کا سنگ بنیاد کوئی اور کیا رکھتا خود ہی رکھا جو آگے چل کر "مبارک اردو لائبریری" بن گئی، یہ بیٹھک کی بیٹھک بھی تھی اور ہے اور دارالمطالعہ بھی، لائبریری اور اس کے قیام اس کی عمارت کی تعمیر کے مشورے مولوی عبدالحق۔ نیاز فتحپوری، سید سلیمان ندوی وغیرہ سے ہوتے نیاز نے تو نقشہ بھی عمارت کا بھجوایا، مولوی عبدالحق نے بھی یہی کیا، خصوصاً ہمارے برادر بزرگ پیر احمد شاہ نے اسے بینک جان کر ہنسی اڑائی، یہ دھڑا دور افتادہ ادبی مجنوں سے روتے، وہ دم دلا سادے کر رام کر لیتے یہ پھر جت جاتے، بس ایک جنون تھا گرہ میں مال نہ تھا، تاہم ہمت ہارنے والے نہ تھے، چار چھ ہزار کتابیں چھوڑ کر مرے، نہ کسی جماعت کی سرپرستی نہ دربار سرکار میں رسائی، انفرادی کوششیں تو اسی طرح مر مر کے ہی سہی مگر جیتی ضرور رہتی ہیں،

اچھی کتابوں کی جستجو رہتی تھی، خرید نہ بھی سکیں تو دیکھ لینا ایک سعادت سمجھتے تھے، لائبریری اور اس کے قیام میں ذاتی اغراض نمود و نمائش کو ذرا بھی دخل اگر تھا،

تو اس میں پہلو مکر و ریا کا کہیں سے بھی نہ نکلا، وہ اس دیوی کی پرستش میں تقریباً راہبانہ زندگی گزار گئے، وہ چاہتے تھے بہاولپور کے لوگوں میں علمی ذوق تصنیفی شغف اور ادبی اخوت ایک اصولی حیثیت اختیار کرلے، شبلی حالی اور شرر کی روح حلول کرجائے، لکھتے ہیں

"شاہد ادب کا ریاست میں میں واحد عاشق ہوں - اور مقصد حیات اس کی پرستش قرار دیا ہے لائبریری کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے، نثر نویس پیدا کئے جائیں، ذوق مطالعہ پیدا کیا جا سکتا ہے"

لائبریری کی عمارت بیٹھک کا کام دے سکتی ہے مگر وہ بیٹھیں گے سامنے ذرا فاصلے پر کچے چھپر میں، وہیں سے درود و سلام بھیجتے رہیں گے، نئی کتاب آئی دستخط ہوئے تاریخ بھی ثبت کردی اب وہ لائبریری میں محفوظ، یہ اور بات کہ بہت سے کاغذات اور کتابیں کچی دیواروں میں چنی ہوئی الماریوں میں دیمک چاٹ گئی، کیا کرتے نون تیل لکڑی کے دلدل سے نکل نہ پاتے تھے، ذوقِ کتب اندوزی میں کیا کیا کھکھیڑیں اٹھانا پڑتی ہیں، کس کس طرح پیٹ کٹتا اور ریتہ مرتا ہے، کوچۂ رقیب میں جانا اور وہ بھی سر کے بل کھیل نہیں، ایک شعری مجموعے پر وہ دیوانہ شعر و سخن کیا لکھتا ہے ذرا پڑھئے -

نہ ستائش کی تمنا ہے نہ انداز تفاخر

(ایک واردات عشقیہ ہے)

یہ انتخاب اس زمانے کی خریدہ ہے جب میری مالی حالت ناگفتہ بہ تھی، فقر و فاقہ تہی دستی بے بضاعتی بے سر و سامانی اور اسی سلسلے کے دوسرے الفاظ کے مفہوم کے لئے ضروری تھا کہ میرا اور میری معیشت کا مطالعہ کیا جائے، باوجود اس دست شکستگی اور بابریدگی کے خریداری کتب کا سودا دل و دماغ پر مستولی تھا، اثاث البیت

بیچ کر روحانی غذا کا سامان بہم پہنچاتا تھا اور نہیں کہہ سکتا کہ اس نوع کی زندگی میں کیا کیا مسکرات دلپذیر پائے جاتے تھے۔ اپنی دستکاری سے ایک میز تیار کی اور مولوی عطاء اللہ صاحب قریشی سنجر پوری نے اسے خرید کیا اس روپے کے ساتھ کچھ رقم ملا کر اس کتاب کا وی پی وصول کیا گیا۔ (۱۹۳۶ء)

اس وضع اس کینڈے اور اس پائے کے لوگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، جب جب کوئی نیا مجموعہ ہاتھ آیا چلو ؤں خون بڑھ جاتا قلم ہاتھ میں لیتے اور کلیجہ نکال کر رکھ دیتے، کلیات شیفتہ دھرتی پر لکھتے ہیں۔

"عرصے کی جستجو کے بعد یہ کتاب لاہور میں بہت ارزاں خرید کی اس سے پہلے بھی لاہور ہی میں دیوان شیفتہ خرید کیا تھا میرے شوق تلاش کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں شیفتہ علیہ الرحمۃ کے پوتے نواب اسماعیل خاں سے ملنے کے لئے کراچی پہنچا، کلیات اور گلشن بیخار کے ملنے کا پتہ دریافت کیا، افسوس انہوں نے کتابوں کے حصول میں میری مدد نہ کی، جس کی مجھے توقع تھی، بامراد و ناکام واپس آیا، اللہ تعالیٰ میری یہ آرزو پوری فرمائیں، وہ یہ کہ متقدمین کی اردو فارسی تصانیف سب مہیا ہو جائیں"۔ (۱۹۵۷ء)

کتابوں کے اعلیٰ قسم کے نسخے باوجود خستہ حال ہونے کے حاصل کرنے کے درپے رہتے اور اسی ادھیڑ بن میں عام اشاعتیں بھی ہاتھ سے نکل جاتیں لائبریری کے لئے چندے بھی کرتے رہتے تھے، روئدادوں کو دیکھ کر معلوم ہوا امراء سے کچھ نہ کچھ پاتے تو تھے لیکن ایسا زیادہ بھی نہیں، ایک رئیس نے تو یہاں تک کہہ دیا، آگ لگا دو اس لائبریری کو تمہیں کچھ چاہئے تو لے لو لائبریری کے لئے کچھ نہ دے سکوں گا، اسی لئے مالدار لوگوں کا ذکر سخت الفاظ میں کیا گیا ہے، کچھ لوگوں نے لیا دیا بھی مثلاً رحیم آباد کے لغاری صاحبان، ایک نام کہیں آگے چل کر بھول ہی نہ جاؤں وہ ہیں حافظ سردار غلام حسن خاں صاحب لغاری، موصوف نے لائبریری اور اس کے قیام

یں مدد کی، وقتاً فوقتاً کتابیں خرید کر بھیجتے رہے قدم قدم پر مشورے بھی دیتے
بندو رعباسیاں کے عبدالحق خان صاحب عباسی نے بھی بہت کچھ کتابوں کی شکل
یں دیا، ربڑ کی مُہر کا چوبی دستہ مرحوم نے عباسی صاحب کے لئے بنایا اور چھ آنے
اجرت لے کر لائبریری فنڈ میں داخل کر کے رسید لکھ دی۔

کتب خانے کو حیات دوام کس طرح مل سکتی ہے، اُس کا ایک حل اُن کی نظر میں یہ بھی تھا کہ اسے کسی مرکزی مقام پر منتقل کر دیا جائے اور وہ اس میں بہت سنجیدہ ہو گئے تھے، بہت کہا گیا کہ حضرت اس ویرانے کا بھرم بلکہ اس ویرانے کے بھرم کا ایک سبب آپ کی ذات کے علاوہ یہ کتب خانہ بھی ہے، سنی ان سنی کر دیتے وہ چاہتے تھے ضلعی صدر مقام رحیم یار خان میں سرکاری سرپرستی میں دار المصنفین اعظم گڑھ کی وضع کا ادارہ اگر قائم کر دیا جائے تو پورا کتب خانہ نذر کر دیں، اس سلسلے میں وہ ڈپٹی کمشنروں کی حد تک ملتے بھی رہتے تھے، تجویز یہ تھی کم و بیش بیس پچیس ایکڑ قطعہ زمین مخصوص کر کے اس میں صدر دفتر اور مشاہیر کی اقامت گاہیں پریس اور دیگر عمارات کھڑی کی جائیں، ایسی سخاوت کون کرتا، ایک ڈپٹی کمشنر جناب غلام فرید خاں نے حاتم کی قبر پر بارہ مربع فٹ زمین دکھا کر دولتی جھاڑ تو دی تھی، غالباً لائبریری کے نام سے وہ بجھکڑ سمجھے یہ کوئی اکنی دونی کمانے کا چکر ہے، ایک عظیم علمی ادارے کے تصور کا متحمل ایک سرکاری دماغ کیونکر ہو سکتا تھا، ایسی خفتہ ملت پر لعنت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

مرحوم کی پیاس لائبریری سے کیا بجھتی، تشنگی کچھ اور بڑھی، گو وہ شاعر نہیں تھے مگر مزاج تو شاعرانہ تھا، آواگون پر ایمان لایا جائے تو کہنے والے نے یہ بھی کہا یہ حضرت تو پچھلے جنم میں میرؔ اور غالبؔ کے ہم نشیں رہ چکے ہیں اپنے اجاڑ اور دور افتادہ گاؤں میں مشاعرہ تک تو کرا ڈالا، غزل لکھنؤ سے ریاض خیر آبادی کی بھی پہنچی، خود بھی آتے لیکن بڑھاپے نے آنے نہ دیا، اور اب تو خود بھی قلم ہاتھ میں لینے کا ولولہ پیدا ہوا، کتب خانے کا نقیب بھی تو ہو، نگارستان، اچھی نہیں فضا کی مناسبت بھی تو آخر کوئی چیز ہے، نیا

نام روشن صدیقی کے مشورے سے تجویز ہوا، "لالۂ صحرا" انگوٹھی میں نگینہ جڑ گیا، روشن ہی کے تعاون سے یہ سہ ماہی عدم سے وجود میں آیا، اس کا آنا تمہید جانے کی ضرور ثابت ہوا مگر یہ سب اس ریگزار میں ہوا تو، بھی چوٹی کے لکھنے والے اس میں نظر آتے ہیں، ادبی پرچہ نکالنے کا حوصلہ آج بھی کس میں ہے پھر وہ تو زمانہ ہی اور تھا، روپے پیسے کی ریل پیل آج جو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں یہ پہلے کہاں تھی، اب تو کوڑیوں کے مول یوں کہیئے اشرفیاں ملتی ہیں، روشن صدیقی کو ہمت ہارتے ہوئے دیکھا تو لکھا۔

"بہاولپور کی آبادی ۸ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے، قلمرو اردو کی آخری سرحد ہے اسلامی ریاست ہے کیا یہاں کی سوسائٹی کے داعیات علمی یہ نہیں چاہتے کہ کوئی رسالہ ان کے وطن سے نکالا جائے اور دوسرے اضلاع کے دوش بدوش سعی علم میں ان کو شامل نہ کیا جائے، اردو کی گنگا جا بجا سیراب کرتی جاتی ہے کیا یہاں کے رہنے والوں کو اس کے برکات سے محروم رکھا جائے"

کمال تو یہ تھا سرزمین بہاولپور سے غیر سرکاری رسالہ پہلی بار نکل رہا ہے

"میرے عزیز دوست جو ان دنوں بہاولپور میں رہتے ہیں ڈکلریشن کے معاملہ میں غیر معمولی انہماک سے کام لے رہے ہیں فارن سیکرٹری صاحب کے محکمہ میں یہ کام ہوگا، دریافت کیا گیا تو ایک ہفتہ کے بعد جواب کا حکم سنایا جائے گا، ریاست میں یہ پہلا ڈکلریشن ہے وہ دریافت کرتے ہیں کہ نوعیت درخواست کیا ہو گی اور تمام جزیات لکھیئے تاکہ صاحب بہادر سے تبادلہ خیال کیا جائے، پچھلے سال میں نے پرنسپل کالج اور افسران اعلیٰ سے اس باب میں خط و کتابت کی تھی جواب ملے ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہنوز جائے استادخالی است اس کوچے سے ناواقف معلوم ہوتے تھے"

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو

"خدا خدا کرکے لالہ صحرا کی اشاعت کے اسباب پیدا ہوئے تو ہیں، مئی ہی ایسا مہینہ ہوگا جس میں لالہ صحرا نشو ونما پائے گا، محمد آباد سے اور میری کوششوں سے رسالہ نکلنا خدا ساز بات ہے اور خارق العادت، اگر غور کیا جائے تو اعجاز ہی اعجاز، ظاہر پرست لائبریری کے قیام پر مضحکہ کیوں نہ اڑائیں لیکن چشم حقیقت بینا دیکھ سکتی ہے کہ محمد آباد ہی ایسا مقام ہے جہاں سے ایک آفتاب عالم نے طلوع کیا ہے اور بہاولپور کی سوسائٹی اب اس قابل ہوگی کہ باہر کی کسی جماعت سے آنکھیں چار کرسکے، اخباری دنیا سے بے خبری ہے، جو جو روپیہ آتا ہے نذر لالہ ہو جاتا ہے، مئی خدا کرے مبارک مہینہ ثابت ہو، قلت سرمایہ سے میرے تمام امور میں تکمیل کا پہلو نمایاں طور پر کمزور ہوا کرتا ہے، برق نظر مبصر کی زد میں آجاتا ہوں اگر لالۂ صحرا کو منصۂ شہود پر لاسکا تو میری کامرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا" (۱۹۳۳ء)

ہمارے ممدوح کے فکر و نظر کے یہ انداز بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہیں، رَوِش صدیقی کے نام کیا لکھتے ہیں،

"اردو پر جو مقالہ آپ لکھ رہے ہیں اس میں فقط مسلم طبقہ متاثر نہ ہو بلکہ ہندو حضرات کے متوجہ کرنے کے لئے بھی اس میں کافی سامان ہو، رسالے کی اشاعت سے بڑا سبب یہ ہے کہ پبلک بہاولپور میں ذوقِ مضمون نگاری پیدا ہو، اور آپ مطمح نظر رسالہ کا ادب عالیہ دے چکے ہیں اور یہاں بہاولپور میں ادب عالیہ کا لکھنے والا نہیں، اگر آپ پبلک بہاولپور کے مضامین درج کرنا معیار رسالہ کے خلاف جاننے لگے تو سبب اشاعت فوت ہو جائے گا اور اس کے ساتھ اس کے یہاں لکھنے والوں کی ادبی امنگیں، پژمردہ ہو جائیں گی، اہل بہاولپور کے مضامین باوجود ادبی معیار کے گرتے کے بھی

درج ہوں گے اعلیٰ ادبی مضامین مخلوط نہ کیجئے اہل بہاولپور کی
دنیا الگ آباد رہے گی اور ان کے لئے ایک حصہ وقف ہوگا، آپ ان
مضامین پر آخر میں تبصرہ کر دیں گے تاکہ ان میں انشائی طاقت ترقی
کرتی جائے"

اور کچھ مت دیکھئے، دیکھئے تو صرف لکھنے والوں کا خلوص اور بے ریائی لالۂ صحرا بالآخر چھپ کر آیا اور اپنی یادگار چھوڑ گیا، سرورق اس کا بھی سرخ تھا، اور کتب خانے کی عمارت کا سامنے کا رخ بھی سرخ، ایک عادت ان میں اور بھی دیکھی گئی آنے والے مختلف رسائل میں سے اگر کسی کا سرورق نفیس ہوا یا اس پر کسی شاعر ادیب سیاست دان کی صاف اور روشن تصویر ہوئی تو فوراً سادہ کاغذ چپکا دیتے، تاکہ خراب نہ ہو، وہ جلد ساز بھی اچھے خاصے تھے، قلم بنانا اور تختی پر لکھنا اور الفاظ کی نوک پلک سنوارنا جانتے تھے وہ عام طور پر لکھتے بھی ہولڈر ہی سے تھے،

مطالعہ اچھا خاصا تھا، اسلامیات سے خاص شغف عنفوانِ شباب ہی سے تھا، سرسید، ابوالکلام مشرقی سبھی کی تفاسیر دیکھے ہوئے، خوب خوب نمازیں پڑھیں بالآخر کچھ تو اضمحلال قوی اور کچھ آزادیٔ خیال سے ترک کر چکے تھے لیکن بعض رازدار تو یہ بھی کہتے ہیں چھپ چھپا کے پڑھا بھی کرتے تھے، واللہ اعلم، وہ خود کیا کہتے ہیں۔

"میں رسمی نماز اور نمائشی عبادت نہیں کرتا، جب سجدہ کے
لئے امنگ پیدا ہوتی ہے، اپنے خالق کے آگے ماتھا رگڑ لیتا ہوں اور
سجدے میں یہی دعا رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حقیقت سمجھا
اپنے دیدار سے مشرف فرما، مجھے حضورؐ کا سچا پیروکار بنا"

مسجد ان کو ورثے میں نہیں ملی تھی خود ہی نقشہ بنایا اور خاصی بڑی مسجد کی بنیاد ڈال دی، نئے متولیوں نے گنبد خوب بڑا سا گنبد تڑوا کر سپاٹ چھت کا اہتمام کر کے تمام حسن غارت کر دیا، سنی العقیدہ تھے، مگر مراثی انیس سن کر آبدیدہ ہو جاتے خدا اور اس کا رسولؐ، بس اسی پر ایمان تھا، آڑے وقتوں میں بس اللہ ہی سے لَو لگاتے یہ کہہ کر آڑے ہاتھوں بھی لیتے کہ یہ کیسا خدا ہے جس کا اقرار آدمی کا نام لئے بغیر نہیں ہوتا۔

ان کا اشارہ کلمہ طیبہ کی طرف تھا، تعویز گنڈے کے بھی اس حد تک قائل تھے کہ اپنے مرحوم باپ کے تعویز کوئی مشکل پیش آتی تو جیب میں رکھ لیتے، اپنے بھتیجے کے لیے یونین کونسل کی ممبری اور چیئرمینی کا ووٹ ڈالنے گئے تو ووٹ کی پرچی پہلے تعویز سے مس ہوئی پھر صندوق میں گئی یہ انہوں نے خود مجھے بتایا تھا، لکھتے ہیں۔

"میرے حضرت والد مرحوم عمر بھر تعویز لکھتے رہے ہیں ان کی تقلید میں میں تعویز لکھتا ہوں، میں جو تعویز دیتا ہوں اپنے اعمال کو دیکھ کر یقین رہتا ہے کہ مجھ گنہگار کے تعویز میں کیا اثر ہو سکتا ہے، لوگوں کا اعتقاد اور حسن اتفاق کام کر جاتا ہے، لوگوں کی مشکل کشائی ہو جاتی ہے، میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بندہ نوازی فرماتے ہیں، میرے بھتیجے جن کے انتقال پر دو سال ہونے والے ہیں تعویز نویس اور تعویز باز تھے ہزاروں لوگ ان سے تعویز لکھواتے تھے ان کی موجودگی میں بھی ایک فیصد آدمی آتے تھے اب بھی وہی حالت ہے، تعویز کا تعلق روحانیت سے ہے اور جب اس کا معاوضہ لیا جائے تو اس کے اثرات غائب ہو جاتے ہیں، میری آزاد منشی سے لوگ واقف ہیں، نہ روپیہ لوں، نہ تعویزات لکھتے وقت کتاب دیکھتا ہوں لوگ ان باتوں کا لازمہ تعویز جانتے ہیں، میں احتراز کرتا ہوں لوگ ایسے تعویز کو معمولی جانتے ہیں بے دل ہو کر چلے جاتے ہیں مجھے خوشی ہوتی ہے، بزرگوں اور اہل اللہ کے تعویز کا قائل ہوں"

مذہبی مسائل پر انتہائی آزادانہ گفتگو کرتے تھے اور بڑی بیباکی سے، یہاں تک کہ لوگ انہیں ملحد سمجھنے لگے، سخت متنفر تھے منافقانہ خضوع و خشوع سے' ایسے یاروں کا خوب مذاق اڑاتے تھے، داڑھی سے تو للّٰہی بغض تھا، پورے پچاس صفحے کا مضمون داڑھی کے رد میں موجود ہے، ایک دوست کے بیان میں لکھتے ہیں۔

جوانی میں داڑھی خشخشی رکھتے تھے آج کل اہل ریش ہیں علاقے

بھر کی داڑھیوں کے صدر رہیں، سب داڑھیوں کو جمع کرنے کے باوجود
ان کی ریش گز بھر لمبی من بھر وزنی نکلے گی بہت خوبصورت لگتی ہے
جچتی ہے، کیوں نہ ہو داڑھی کی خدمت میں بھی تو فرض وسنت کے
قیود تمام صرف کرتے رہتے ہیں پانی اور صابن سے شاکی ہیں کہ وہ کیوں
ختم ہو جاتے ہیں اور شوق شست وشو پورا نہیں کرنے دیتے حقیقت
یہ ہے کہ بڑی داڑھی قاضی الحاجات ہے مرجع خلائق ہے اس کو دیکھ
کر ناواقف متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا"

یہی نہیں وہ مرحوم اس سے دو قدم آگے چلے جاتے تھے، فرمایا "چہرہ ہی
تو ایسی چیز ہے جسے خوب صاف ستھرا رکھنا چاہیئے، یہ ہر ایک کی نظر میں رہتا ہے، یہ
کیا کہ غیر ضروری حصوں کی صفائی کا خیال رکھا جائے اور منہ پر جنگل اگا لیا جائے" کہتے
تھے پاکستان کو اسم بامسمیٰ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ

"اس کافرہ کو تہس نہس کیا جائے یہ وہ ساحرہ ہے جس نے
مسلمانوں کو ایمان فروش بنا رکھا ہے یقیناً ارباب بست وکشاد ملکی
نظم ونسق کو بہتر بنانے سے غافل نہ ہوں گے نئے نئے منصوبوں
میں چار سو بیس کی تعریف میں لمبی داڑھی خدع وفریب کی آلۂ کار ہے
کی تشریح ہوگی"

پردہ بھی ناپسند تھا، ایک بار جماعت اسلامی کے کچھ لوگ تشریف
لائے یہ غالباً اسلامک پبلیکیشنز کے کوئی بزرگ تھے نیا نیا کام تھا ان کا اور یہ پاکستان
گیر دورہ تھا، کچھ مقامی بزرگ بھی ان کے ہمسفر، باتوں باتوں میں پردے کا ذکر چل نکلا
مہمان یہ سمجھے میزبان پردے کا حامی کیوں نہ ہوگا، بڑھ چڑھ کر فرمایا "جی ہاں مولانا مودودی
پردے کے حامی ہیں اور پردہ نامی کتاب تک موجود ہے، لیجئے یہ رہی" مرحوم نے آہستہ
سے یہ کہہ کر کتاب ایک طرف رکھ دی، "لیکن میں پردے کا سخت مخالف ہوں لکھتے
نہیں"۔

"جس قوم میں تعلیم نسواں نہیں اور پردے کی مصیبت نازل ہے وہ ہمیشہ تنزل میں رہے گی، کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی ترقی یافتہ قوموں سے ہمسری نہیں کر سکتی مرد اور عورت مل کر اقتصادی ترقیات کی کشتی چلاتے ہیں اس گاڑی کے یہی دو پہیے ہیں، میں نے اس پر عمل نہیں کیا پھر بھی پرانے پردے کا تعفن نہیں رہا جب ماحول بے پردگی کا تیار ہو جائے گا تو میں پیش پیش ہوں گا، موجودہ رسمی اور غیر شرعی پردہ مضرت رساں ہے عورت کو اخلاقی طریق پر تربیت دینی چاہیئے شرم و حیا کا درس دے کر پردے کا فلسفہ سمجھنا چاہیئے"

مودودی لٹریچر وہ ضرور خرید لیتے تھے، ممکن ہو کچھ پڑھا بھی ہو، ایک بار ایسا ہوا پیر علی محمد راشدی کا طویل مضمون پڑھ کر سنایا جا رہا تھا، وہ تھا جماعت اسلامی کے حق میں، ایک ہی کالم سن کر فرمایا کچھ اور پڑھو، اصل یہ ہے کہ مذہب کی آڑ میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کی تاریخ بڑی گھناؤنی ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ راشدی آج کل پیپلز پارٹی میں سرگرم عمل اور کسی اونچے درجے پر فائز ہیں، پاکستانی دانشور کس درجے کا ابن الوقت ہے کوئی دوسری قوم ہماری ہم پلہ ہو بھی کیسے سکتی ہے، ایک اور اقتباس، نقل کرتا ہوں۔

"ایک زمانہ تھا کہ مجھ پر وہابیت یا دیوبندیت کا سحر کام کر رہا تھا مزاروں اور صوفیوں سے محبت نہ تھی، آج کل تو یہ حالت ہے، صوفی گروہ کا گرویدہ ہوں، مکار پیر ریاکار مرشد پیشہ ور مولوی کی کثرت ہے میں تو کہوں گا عنقا کا ملنا ممکن ہے ان کا ملنا ناممکن اس دور عیاری میں خدا کے بندے نہیں ملتے، اس جنس خدائی کا ملنا مشکل ایسے قحط الرجال میں سلف صالحین کے مزارات پر جانا ضروری ہے، جو زندہ اولیا کرام سے برکات اور امداد دین ملتی رہتی تھیں وہ اب کہاں اب مزارات ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہیں، میں اصلاح نفس یا تزکیہ قلب صوفیوں سے کرانے کا خواہش مند ہوں، مدعا تو علم کا حاصل کرنا

ہے خواہ دیوبندی سے حاصل کردیا صوفیا کرام سے"

مرحوم عقل کی سربلندی چاہتے تھے۔

"یہ کہنا کہ عقل اخلاق کے لئے زہر ہے، مجذوب کی بڑ ہے اگر یہ نہ ہوتی تو خدارسی رسول شناسی کا درس کون دیتا، اہل اللہ کی عقل رسولوں کی عقل اور ہے کم درجہ لوگوں ناقصوں کی عقل کا درجہ اور شکل اور قسم کا ہے ہر جگہ عقل ہی کی جلوہ افگنی ہے، مذہب کو عقل کے مطابق ہونا چاہیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں، یہ لوگ مذہب کی روح کو کچلنا چاہتے ہیں اور تبلیغ کی جڑ کاٹنا چاہتے ہیں اسلام فطری مذہب ہے فطرت کے آئین کے مطابق اسے چلاتے تو مقبول عام ہو جاتا، مولویوں نے جزئیات کا دفتر بے معنی اتنا اکٹھا کردیا ہے کہ اس کے اکٹھا کرنے سے ہمالیہ تیار ہوسکتا ہے، ہمالیہ پر کوئی چڑھے نہ چڑھے گناہ نہیں، مولویوں کے پہاڑ پر کوئی نہ چڑھے یا ان سیاہ چٹانوں کی سیر نہ کرے تو وہ عاصی ہے اس کا دوزخ ٹھکانہ ہے، اب تو مسلمان ایک قوم ہے جو کتاب اللہ کو مانتی بھی ہے اور نہیں بھی مانتی، میں اسلام کو آفاقی مذہب مانتا ہوں، میرے اسلام میں کفر اور تفریق کا نام نہیں"

آدمی اپنے حسب و نسب خاندانی وقار مال و دولت سے بھی پہچانا جاتا ہے، ان تراکیب کو فرسودہ اور متروک ضرور کہہ لیجئے مگر یہ ہیں تھیں اور رہیں گی اپنے کردار اور ذاتی عمل سے پہچانے جانا اصل چیز ہے، شجرہ ہائے نسبی اور کتب ہائے تاریخ و سوانح کو کھنگالنا کچھ ایسا برا کام تو نہیں، لیکن یہ ہے جگر کاوی اور جانفشانی کا معاملہ زیادہ نہ سہی اتنا کہتے چلیں کہ ہمارے ممدوح کے جد امجد عرب سے دلی اور ملتان ہوتے ہوئے عادلپور سندھ اور بعدہ گھوٹکی ضلع سکھر سندھ پہنچے اور یہیں پاؤں توڑ کر بیٹھ بھی گئے، مختصر کنبہ پھلنا پھولنا شروع ہوا اور دیکھتی آنکھوں بڑھتے بڑھتے پوری ایک برادری بن گیا، جدھر دیکھو سادات امروہہ کی طرح ایک نہ ایک نوجوان بوڑھا یا ادھیڑ موجود

سیادت ان کا گہنا تھا، علم وحلم سبھی کو ورثے میں ملا، شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد صاحب کردار کیوں نہ ہوتی، مگر اب وہ مولوی مدن کی سی بات نہیں رہی، مرحوم نے بھی لکھا ہے،

"اس خاندان میں فقر تھا کرامت تھی زہد واتقا تھا اخلاق تھا،
رشد وہدایت تھا کافی سرمایہ تھا زمینداری جاگیرداری تھی غرض اللہ تعالیٰ
کا دیا ہوا سب کچھ تھا اسلاف وہ تھے جن پر ملک بھی رشک کرتے
تھے ساٹھ برس سے اخلاف میں تنزل کے اسباب پیدا ہونا شروع ہوئے
اور سب خوبیوں میں گھن لگ گیا اس وقت یہ حالت ہے کہ جو خدام اور زر
خرید غلام تھے وہ تمام شعبہ حیات میں ہم سے ترقی کر گئے ہیں اور ہم عضو
معطل بن کر بار زمین بن گئے ہیں، پیری ومریدی ذریعہ معاش بن گیا ہے
ہم لوگ صبح کو گداگری کے لئے جاتے ہیں، مریدوں سے ایک پیاز تک
وصول کر کے شام کو گھر آ کر کشکول گدائی کو جھاڑتے ہیں، اہل بیت خوش
ہو جاتے ہیں کہ سید صاحب نے آج خوب کمایا اور دو وقت کے لئے
دال دلیا لے آئے، پھر وہی صبح اور دربدر سائل بننا، لوگ اس گری
ہوئی حالت میں ہماری قدر کرتے ہیں، جو کچھ ہوتا ہے پیش کر دیتے ہیں

ع تنزل نے بنائی ہے بری گت ہماری

گھوٹکی شہر کا بھرم سادات اور ان کی بنائی ہوئی عظیم الشان مسجد سے قائم تھا، جمعہ پڑھنے آج بھی دور دور سے پا پیادہ لوگ آہی جاتے ہیں، غنیمت اسے جانئے کہ سر پھٹول کے باوجود امامت تین سو برس گزرنے پر بھی سیدوں کے گھر میں ہے نکلی نہیں، زیادہ دور کیوں جائیے دس برس بیشتر یہ شہر عوامی زبان میں سیدوں کا شہر کہلاتا تھا بڑے بوڑھے اب بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں، صاحبن جو لوٹ

مبارک شاہ کے دادا عزیز داری کی باہمی چپقلش سے عاجز آ کر ہجرت فرماتے سرزمین بہاولپور ہوئے، یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سندھ کی سرحد صرف چھ میل سات میل ہی رہ

گئی ہے، یہاں رنگ مرحوم کے دادا نے کم والد نے خوب جمایا، پیر محمد شاہ نیک طینت نیک خو پر وقار سادہ لوح لوگ تھے، ارادت مندوں کا حلقہ بندھ گیا، چہار سو بزرگانہ عظمت کا ناقوس بجنے لگا، ہر وقت گھرے رہتے تھے، کسی کا بُرا ہو، اس نیت سے تعویز کبھی دیا ہی نہیں، ہمیشہ انسانی خیر و فلاح کے نقیب رہے، فضا کچھ اس قسم کی تھی کہ اچھا بھلا آدمی انا الحق انا الحق پکارنے لگے مگر ہم جانتے ہیں کہ خلائق کے بے پناہ ہجوم اور بے انتہا پرستارانہ یورش کے باوجود خدائے مجازی نہیں انسان کامل ہی نظر آتے صاحب ظرف و نظر، اپنے مقام سے ذرا نہیں کھسکے، عقیدت مندوں کو حشرات الارض نہیں انسان سمجھ کر مساویانہ سلوک کیا، جائیداد بھی بہت بڑی چھوڑ گئے۔

انسان دوستی غریب پروری نہیں غریب شناسی میں ہمارے ممدوح کا پلہ بھی بے حد بھاری تھا محمد شاہ سے بیٹا مبارک شاہ تمیز خیال میں سوا نکلا، مزاج بے حد ٹھنڈا، محبت ہی محبت، صابر و شاکر، محنتی جفاکش، کہتے تھے جی چاہتا ہے اپنے ہاتھ سے کما کر کھاؤں تو معلوم ہو حلال کی کمائی کیا چیز ہوتی ہے، بزرگوں کی میراث پر زندگی کرتے ہوئے شرماتے تھے، پیری مریدی کا سلسلہ ہی اٹھا دیا تھا، مریدوں کے دورے پر صرف دو بار گئے، کچھ تو نذر و نیاز کے خوف سے منہ چھپائے پھرتے تھے اور وہ جن کا سامنا ہوا ان میں چونی اٹھنی سے زیادہ کی سکت نہ تھی، کیئوں نے دھتّا بھی بتائی، یہ تجربہ کچھ تو غربت اور بہت کچھ بے مروتی دیکھ کر تلخ ہی ثابت ہوا، پھر بھولے سے بھی قدم نہ اٹھایا، لوگ آتے رہے، برسوں منت سماجت خوشامد درآمد دھتکارنے والے بھی کرتے رہے، مگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر اٹل ہی رہا، روکھی سوکھی گھر کی کھائی اور خوش اوقات رہے، یہ بھی مرحوم نے سچ لکھا ہے:

"میں اگر خوشامد کو کام میں لاتا، بہروپیا بنتا تو لاکھوں روپیے میرے خزانے میں جمع ہو جاتے اور بڑی جماعت میرے اردگرد ہر وقت جمع رہتی لیکن میں نے پیری مریدی کے جوئے کو پھینک دیا ہے، جلب منفعت کو خیرباد یا ترک کر دیا ہے۔"

طبیعت میں فطری آزادی کا جوہر بے پناہ تھا، پابندیوں اور تکلفات سے گھبراتے تھے اول تو وہ دور کا ہو خواہ قریب کا، سفر کرتے ہی نہیں تھے، گھر بلو ذمہ داریاں، مزاج کی نزاکت اور علالت، مخصوص دوستوں کے ہاں بن بلائے بھی گئے مگر اکثر وبیشتر بے حد اصرار اور تکرار کے بعد، یہ طے کر کے کہ آنے اور جانے میں وہ مختار کل ہوں گے ایک عقیدت کیش کو میزبانی کا شرف بخشا تو وہ اور پھیل گیا، حضرت آج کی رات بھی یہیں قیام فرمائیے سیر بھاگ جاگ جائیں گے انکار اور اصرار حد سے گذر گیا تو مان گئے، یہ رت جگے کے عادی تھے وہ لوگ کیا تاب لاتے نو دس بجے ہی جھک گئے، چھک گئے، مرحوم نے اپنے ساتھی کو عصائے موسوی کا ٹھوکا دیا، وہ چونک کر بیدار ہوا، دونوں دبے پاؤں رات کی تاریکی میں کچے پکے راستوں پگڈنڈیوں کو عبور کرتے کیچڑ میں لت پت بھاگم بھاگ رات گئے ایک اور دوست کے ہاں آکر دم لیا، ادھر مہمان کو غائب پایا تو ہوش اڑ گئے میزبان نے بیوی بچوں سمیت پیچھا کیا، اپنے کئے پر پچھتایا، ایک دوست سے خطاب کیا ہے۔

"میں چاہتا ہوں آپ کے پاس آؤں تو سب یہ جاننے لگیں کہ برادری کا فرد آگیا ہے، مساوات ہو، کوئی یہ فرمائش کرے کہ بھائی کوئلہ اٹھادو، کوئی کہے کہ وہ لوہے کا ٹکڑا لے آؤ، تھوڑا تلاش کردو، شیشیوں کو ذرا صاف کردو، لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ پیر ومرشد بنادیا جاتا ہے، مرتفع چٹان پر بٹھا کر سطحی زندگی سے دور کیا جاتا ہے اور وہ عزت وتکریم روا رکھی جاتی ہے کہ پینے پلانے کا حظ مکدر ہو جاتا ہے"

پینے پلانے کا قصہ تو اک سخن گسترانہ سی بات ہے شراب کو چھوا تک کیا معنی مجھے یقین ہے دیکھا بھی نہ تھا، اپنے والد کے مریدوں کا بے حد احترام کرتے تھے، کھانا خود حویلی میں جا کر لاتے اور سامنے بٹھا کر کھلاتے، ابوالفضل جیلانی ان کا پوتا آکر لیٹے ہوئے دادا سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، فرمایا بیٹے اس رخ سے نہیں اِدھر میرے پہلو میں آجاؤ اگر میں نے کروٹ بدل کر تمہارا جی بہلایا تو تمہارے پردادا کے مرید پس پشت چلے

جائیں گے اور یہ بے ادبی ہو گی، احترام آدمیت کی ایسی مثال مشکل سے ملے گی وہ کرسی میز نہیں چارپائی سے کام چلاتے رہے، درگزر کا مادہ بھی بے پناہ تھا غلط کار ملازمین کی سزا یہ تھی کہ اپنے پاس بٹھا لیتے، وقت بے وقت بلا لیتے، اب وہ بے بس بیٹھا ہوا ہے نہ اپنے کام کا نہ کسی اور کے کام کا، بھرپور کی سزا زبانی سرزنش کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی،

مرحوم ایک خود ساختہ انسان تھے، بارہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماں اور بہن نے سرپرستی کی، لیکن وہ پردہ دار خواتین دلجوئی کے سوا کیا کر سکی ہوں گی، پردے کی سختی کا یہ عالم کہ ایک آدھ برس کا بچہ بھی حویلی میں قدم نہ رکھ سکے، انتہا یہ ہے کہ مریدانِ باصفا اپنی حاملہ عورتوں کو بھی روک دیتے تھے مبادا تمہارے پیٹ میں لڑکا ہو اور یہ آداب عقیدت کے منافی ہو گا، یہ کرامت مرحوم کے والد پیر محمد شاہ جیلانی کی تھی جن کا حلقہ اثر بے حد وسیع تھا، باپ کے مرتے ہی ماں کی طرف سے سوتیلے بڑے بھائیوں کی زد میں آ گئے، نجیب الطرفین نہ تھے اس لئے کمتروں میں شمار ہونے شروع شروع میں بھائیوں نے ساتھ رکھا مگر کس طرح۔

"میرے والد علیہ الرحمتہ نے وفات پائی، مولویوں نے بڑے بھائی سے کہا مبارک شاہ خورد سال ہے اس لئے خیرات اور مصارف میں احتیاط لازمی ہے، عمل تو نہیں ہوا، ایک سال تک مجھے خورد و نوش کا سامان ملتا رہا، رات کو دودھ کا ایک کٹورہ دیا جاتا تھا لیکن بعد میں بڑے بھائی مرحوم نے بند کر دیا، مرحوم زود رنج تھے جو کچھ کسی نے کہا اس کو مان جاتے تھے، تحقیق کم کرتے شائد میرے خلاف کسی نے بکواس کر دی ہو اور وہ ناراض ہو گئے ہوں، غالباً ان کی چہاران بیوی لگائی بجھائی میں لگی رہتی تھی، ہمارے خلاف بھی اس نے کہا ہو گا، مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے معمولی بات لکھ دی۔ خدا ان کی روح کو نہ ترسائے، دودھ کے کٹورے پر ٹھہر لگنے پر احتجاج کی جرأت کون کرتا کہتے تھے

بھائی بہت غصیلے تھے، ان کے جوشِ غضب کے قصے آج بھی زبان زدِ عام ہیں، جب وہ اپنے گھر میں گرجتے تھے تو میں اپنی کٹیا میں دبک کر رہ جاتا کہیں عتاب کسی بہانے مجھی پر نازل نہ ہو، اچھی خاصی زمین جائیداد کا بہت بڑا حصہ بھائی کے اللے تللوں، مقدمے بازی اور تین چار شادیوں پر ضائع ہوا تب کہے سنے سے تقسیم پر آمادہ ہوئے، برادرانِ بزرگ، دونوں بڑے بھائیوں احمد شاہ امام شاہ کی ملی بھگت نے چوتھائی پر چھوٹے کو ٹرخایا، جب یہ حکم صادر ہوا چلو چل کے اپنے حصے کے کھیت دیکھ اور پسند کر لو تو یہ بیچارے سہمے سہمائے بھائیوں کے مصاحب خاص کے اشاروں کے منتظر ہمرکاب رہے، جو مرحوم کی کم عمری بے خبری اور مظلومیت کو دیکھ کر کسی قدر مہربان ہو گیا تھا، جہاں جہاں اس نے پاؤں پٹخے یہ بے تکان کہتے گئے یہ کھیت مجھے دے دو، کچھ تجاویز اس شخص نے لکھ کر بھی دے دی تھیں، نیفے میں اُڑسے ہوئے تھے کہیں سے نکل کر ایک آدھ پرزہ فرشِ زمیں پر آ رہا، سن سے ہو گئے جان پر بن گئی، پیروں ویروں میں وہ پرزے دبائے ورنہ بھائی جان زد و کوب سے بھی باز آنے والے کہاں تھے تاہم جو کچھ ان کے حصے میں آیا اس میں جنگل اور نشیب و فراز اتنے تھے کہ جب کام پر جاتے سر پکڑ کر بیٹھ جاتے اور روتے رہتے، پیٹ کا معاملہ تھا، جتے رہے اور اس قابل ہوئے کہ تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کا سامان کر لیا، زمینیں حالات نے ان سے بھی بکوائیں، کیا کرتے نہری پانی تھا ہی نہیں، رہٹ اور کنوئیں سے کیا کمایا جا سکتا ہے، عسرت اور تنگدستی نے خون کے آنسو رلائے، ہاں اس بندر بانٹ پر طوفان بعد میں اٹھا جب منجھلے بھائی امام شاہ نے حسب معاہدہ خفیہ اپنا حق طلب کیا مگر بڑے کی ذہانت اپنا کام کر چکی تھی وہ کیوں دبتا، اپنے سگے بھائی سے بھی مکر گیا، برملا کہہ دیا اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا جو کچھ ہے میرا ہے دربارِ سرکار تک بھی قصے ہوئے مگر منجھلے میاں اپنے ناوک سے آپ ہی زخمی ہو چکے تھے اس کا کیا اور کیسا علاج،

جارحیت مبارک شاہ کے مزاج کا حصہ کبھی نہیں رہی، مدافعت بھی وہ کہاں کرنے والے تھے، نہ کی، بھائیوں کے رحم و کرم پر ہی رہے، سر اٹھاتا کیسا آنکھ

ملاکر بات بھی کہاں کر سکتے تھے، مد مقابل کبھی نہیں بنے، وہ بھائی جس نے حق غصب کیا تھا جہاندیدہ اور مردم شناس نکلا، جان گیا تھا سوتیلا ہی سہی قابل اعتماد اگر کوئی ہے تو یہی، مرتے وقت یہ فیصلہ دانشمندانہ کر گیا، میری اولاد کا وارث مبارک شاہ ہے، بہتوں کا جھٹکا ہوا، منہ لٹک گئے، دم کوئی مار نہ سکتا تھا، مبارک شاہ نے بھی بھائی کی بیوائیں اور بچوں کی حفاظت کا حق ادا کر دیا، پالا پوسا پڑھایا لکھایا، اپنی بیٹیوں کو دونوں بھتیجوں سے بیاہ بھی دیا، مکان بنوائے، ایک ایک پائی کا حساب رکھا لکھا ہے،

"لنگر یا عزیز صالحین کی آمد و خرچ کا حساب میرے ذمہ ہے میں حتی الامکان دیانتداری سے کام انجام دے رہا ہوں البتہ لنگر کی آمد سے بعض وقت روپے عاریتاً لے لیتا ہوں، بھائی کی وفات کے بعد میرے اخراجات بڑھ گئے، سب ملنے والوں کا رجوع میری طرف ہے اوضعداری اور رکھ رکھاؤ قائم کرنے کے لئے لازمی ہے کہ میں اپنی پوزیشن خرچ کر کے قائم رکھوں اگر مدارات نہ کروں تو خاندانی وقار کس طرح قائم رہ سکتا ہے، عزت میں فرق اور کمی آجائے گی عزیزی اس وقت صغیر سن ہیں ان کو مریدوں کے یہاں اس لئے روانہ کرتا ہوں کہ ایک تو قرض ان کا جلد ادا ہو دوسرا سبب یا فائدہ یہ ہے کہ مریدوں میں ان کی واقفیت ابتدا ہی سے ہوتی جائے میں بھی جا سکتا ہوں اور یہ جانے کا ہنر ایسا نہیں کہ مجھے نہ آتا ہو، لیکن عزیز کے مستقبل کے لیے ان کا جانا مفید ہوگا"،

پوری جائیداد صحیح سلامت پورے گاؤں کو بلاکر بھتیجوں کے حوالے کی اور دامن جھاڑ کر مرنے والے کی روح سے سرخرو ہوئے،

بھائیوں کی بے اعتنائی خود غرضی تیزی اور طراری کے باوجود مبارک شاہ کے دل میں احترام بدستور رہا، ذکر خیر محبت اور ادب سے کرتے ہیں برادر بزرگ

کی وفات پر بہت علول نظر آتے ہیں،

"حضرت مرحوم کے چلے جانے سے یہاں کی فضا میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو مدت تک پر نہیں ہوسکے گا، وہ صفتوں کے مالک تھے اخلاق کے آقا تھے، رشد و ہدایت کے سردار تھے، غریب پرور تھے، غریب نواز تھے، آہ ایسے مجمع حسنات کا فرد وحید دنیا سے رخصت ہوگیا ہے اور اس حال میں کہ اپنے ریوڑ کو ایک سنسان اور ڈراؤنے دشت میں چھوڑ کر چل بسا"

فروتنی کا یہ عالم تھا، بھائی کے پیروں کو چھوئے بغیر مصافحہ معانقہ کرتے شاخ پُر میوہ کی طرح جُھک کر ملتے، مودب اور فرمانبردار، اور یہ سب کچھ اس کے لئے تھا جس نے قدم قدم پر کانٹے بچھائے اور تو اور شادی میں شریک ہونے سے بھی انکار کر دیا، اس پیکر مہر و وفا کو بیر کے بھائیوں نے ہر طرح کے لگائے، اس پر بھی منجھلے پیر امام شاہ کے باب میں کیا لکھا ہے، پڑھیئے

"صوم و صلوٰۃ کے نہایت پابند تھے، اذان اور ذکر ایسے سچے جذبہ ذوق الٰہی سے نکالتے تھے کہ ہر کس و ناکس اس لحن موسیقی نواز پہ والہ و شیدا تھا، اب بھی آواز بازگشت آ رہی ہے، شاعری سے زیادہ شغف تھا، کچھ کلام منظوم میرے پاس موجود ہے، آنکھیں خوبصورت اور غضبناک، جن امور کے انسداد کے لئے آپ کو تخلیق کیا گیا تھا اپنے کار منصبی پر مقرر ہوگئے، شہنشاہ فعل شنیعہ (زنا) سے برسرپیکار ہوئے ہماری بستی تو بستی کئی میلوں تک زنا بازی کا بازار ایسا سرد ہوا کہ لوگ عالم خواب میں بھی احتلام کے مرتکب نہ ہوتے تھے، اس مصلح اعظم نے امیر سے لے کر ایک پنچ قوم کے افراد کو قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا اور اسلامی مساوات کو پیش نظر رکھا، وفات سے تین برس پہلے پیر سر برادران میں ناگفتہ بہ مناقشات نے بے جا طول

کھینچا بین کے اعادہ سے حساس دلوں کو ٹھیس لگتی ہے“

مبارک شاہ نے زندگی کی راہیں خود تلاش کرلی تھیں، مقصد بھی متعین کیا اور وہ یہ تھا کہ اردو میں لکھنے کی استعداد پیدا کریں، کرلی، کتب خانہ قائم ہو جائے، وہ بھی ہوا، ایک سہ ماہی جریدہ بھی کتب خانے کا نقیب ہوا یہ تمنا بھی پوری ہوئی، اب آیئے دیکھا چاہیئے وہ کیا چاہتے تھے، چاہتے وہ یہ تھے کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر وہ تو کہتے تھے ادیب و شاعر بنے، یہ بھی نہ ہو تو سندات حاصل کریں ملازمت تو کریں، خود کمانے دھمانے کے قابل تو ہوں، یہ آرزو ان کی پوری نہ ہوسکی، بڑے بیٹے نے بی اے میں رکھا ہوا قدم اٹھالیا، چچا کی لڑکی سے شادی کردی گئی، تین بچے بھی ہوئے لیکن وہ ایک راجپوت تن پرمرمٹا اور ماں باپ بیوی بچوں سے کٹ کر رہ گیا، چھوٹے نے سرے سے نہ پڑھ کے دیا نہ کسی کام آیا، بیوی بچوں سمیت مفت کی روٹیاں توڑتا رہا اب مرحوم کی زندگی اپنی اولادوں کی اولاد کی خدمت کے لئے وقف ہوکر رہ گئی اور سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، اپنی زندگی کا ماتم کرتے ہیں۔

”عوام اور یہاں کے خاص اور میرے گھر والے مجھے دنیاوی آدمی جانتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میں درویش منش آدمی ہوں، بڑائی سے دور بھاگتا ہوں، خودداری کو قائم رکھنا فرض حیات جانتا ہوں اگر دولت گیری جاہ و حشم کا طالب ہوتا تو آپ کو علم ہے کہ بہت دروازے میرے لئے کھلے ہوتے ہیں، بہت ذرائع تحصیل زر جانتا ہوں، میں نے نفس کشی کرکے اپنے کو حقیر بنالیا ہے، لوگ یہ کہتے ہیں اس میں عقل کی کمی ہے، وہ کام ترقی پسند نہیں کیا، ایسا کرتے ایسا نہ کرتے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھے علم اور فہم کی دولت عطا کی ہے ہمارا ماحول فریب کاری ریاکاری تدلیس بہروپیاپن چاہتا ہے، میں نے اس کا ردعمل کیا ہے، ظاہر و باطن کو یکساں رکھا ہے، میں نے ماحول کی اطاعت نہیں کی، ماحول کے ساتھ آویزش ہے یعنی

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا شعار نہ تھا

"یہ بات آج آپ سے کہہ رہا ہوں کہ بڑے علما اور فلاسفروں کی صحبت میں بیٹھنے کا طریقہ رکھتا ہوں، ساری زندگی گوشہ نشینی میں صرف کردی گمنامی میں رہنا پسند کیا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اور یہاں کے خواص میری قابلیت کو ہرگز نہیں جانتے اور میرے طرز عمل پر غلط رائے قائم کر کے مجھے سادہ لوح جانتے ہیں ان لوگوں کی تعریف سے خوشی نہیں ہوتی ان کی تعریض وشکوہ سے نہیں گھبراتا، جس ماحول میں رہتا ہوں، میں اس کے لائق نہ تھا لیکن اولاد کی خاطر زندگی یہاں تباہ کردی، یہی سوچا کہ اس جنگل میں رہ کر اولاد کو تعلیم اور تربیت دلاؤں، میری زندگی بے کار جائے تو جائے اولاد تو بڑھ جائے میں نے یہ ایثار کیا کہ بچوں کو تعلیم دلائی، میری زندگی بنے نہ بنے اولاد کا مستقبل تو شاندار بن جائے افسوس کوئی امید پوری نہیں ہوئی، جس طرح ہزاروں لیے بدنصیب ہیں ان میں میں بھی شامل رہا، میرے لئے یہ بڑی ٹریجیڈی ہے، توقعات کا جہاز ساحل تک پہنچا ہی تھا کہ ایسا دھچکا لگا کہ اس کا ڈھانچہ اس کے جوڑ سب ڈھیلے ہوگئے، اپنی ٹریجیڈی کا آپ مطالعہ کر رہا ہوں"

بیٹوں ہی نہیں بھتیجوں پر بھی بہت سر کھپایا مگر کسی نے کچھ نہ کیا، مایوس ہو کر اپنی توجہ کا مرکز بڑے پوتے محمد شاہ غالب کو بنالیا تھا اور اپنی یادداشتوں میں پوتے کا ذکر اس انداز میں کیا ہے گویا اپنا وارث اسی کو سمجھتے تھے، بہو بیٹیوں کا یکساں خیال رکھا، گھر میں چھوٹا بڑا کوئی مسئلہ ہوتا تو مشورے کرتے، نظر انداز کرنا کسی کو جانتے ہی نہ تھے کھانے پینے کی چیز ہو، پیسہ ہو سب میں حسب مراتب تقسیم کرتے ایک تقریب میں چھوٹے پوتے کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، مرشد زادہ ہونے کی رعایت سے وہ پچاس روپے

نذرانہ وصول کرلایا، مرحوم بار بار کہتے میزبان نے بہت دیئے، بہت زیادہ، یہ بھی گھر میں بیٹے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رہتی تھی، کوئی پتھر کوئی لکڑی بیٹھک سے گھر کے راستے میں حائل پاتے تو وہیں کھڑے کھڑے خود یا کسی کو بلا کر ہٹوا دیتے، کہیں بچے کسی خاردار لکڑی سے الجھ نہ جائیں تیز بھاگتے ہوئے بچوں کو آہستہ چلنے کی تلقین کرتے بچے اگر بیمار پڑ جائیں تو گھر میں آتے ہوئے گھبراتے تھے، ان سے بچوں کی بیقراری دیکھی نہیں جاتی تھی، بار بار ملازمہ سے پوچھتے اب کیسی ہے طبیعت، وہ تو بڑے پوتے کی محبت تھی ورنہ گھر سے تیس میل دور رحیم یار خاں کے اسکول میں بھی نہ ڈالتے، گھر میں کوئی بیمار پڑے، علاج بہترین کراتے، چھوٹا بیٹا اپنی تمام تر بیکاری اور خود سری کے دق میں مبتلا ہوا تو اس مدقوق کے لئے خس کی ٹٹیوں کا جھونپڑا بنوا کر ایک طرح سے یخ بستہ کمرے کا اہتمام کر ڈالا، چار چھ ہی مہینوں میں چقندر بن کر نکل آیا اور وہ خود لو جھلستا کئے بجلی تو تھی نہیں، چھت کا ہاتھ سے کھینچنے والا پنکھا بھی کبھی نہیں لٹکوایا، کوئی ملازم بھی یہ فرض ادا نہیں کرتا، کمرے میں جھاڑ کاڑ وغیرہ بھی شاذ و نادر، بس ایک چارپائی اور چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، مریدین کے لئے چٹائی کا فرش، بیوی بیمار پڑی، ملتان بھجوایا اور جب خود پہنچے تو بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے، برسوں کا ساتھ اچھا گذرا ہو تو یہی ہوتا ہے۔

کسی قدر شکی مزاج بھی تھے، لیکن بد طینت ہرگز نہ تھے، بدگمان بھی ہو جاتے تھے مگر سمجھانے پر بڑے بھولپن سے مان بھی جاتے، اک ذرا سیدھے منہ کوئی بات کر لے پگھل جاتے تھے، دل چیر کر رکھ دیتے تھے وہ مصلحت اور اس کی باریکیوں سے تقریباً تقریباً نا آشنا ہی جیئے، ہاں اگر کوئی ازراہِ تکبر خاطر میں نہ لائے تو بھولتے بھی نہ تھے عمل کا ہو خواہ زبان کا چرکا وہ اس مرحوم کے دل پر نقش ہو جاتا تھا، ان کا دل سچ مچ کا آبگینہ تھا، ذرا سا غبار بھی گرد آلود کر دینے کے لئے کافی تھا، معمولی سا احسان سلوک کوئی اچھا کرے، حقارت سے پیش آئے، بھولتے نہ تھے، دل پر نقش ہو جاتا تھا، غریب کی عزت کبھی عزت سمجھی ہی نہیں گئی، غیرت و حمیت کسی کی میراث نہ سہی

مگر سمجھی تو مالداروں کی ہی جاتی ہے، غریب کی بیوی، غریب کی بہو، غریب کی بیٹی پر جسے دیکھو حق جتاتا ہے اور اچھوت تو ہندوستان میں بھی برہمن کا معتوب ہے آدمی تو ہوتا ہے اچھوت مگر ہوتا ہے مفلس اور قلاش، بیوی اغوا ہوئی تو آیا اور پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا کیا کرتے، پڑوسی زمیندار رئیس غلام محمد خاں انڈھڑ سے جا کر ملے، وہ کیا خاطر میں لاتے سرداری کی ہوا بھری ہوئی تھی، اور یہ درویش، بس فقیرانہ آئے صدا کر چلے، اس کے بعد جب بھی یہ رئیس ملے باتوں باتوں میں مرحوم عاجزانہ اُس کے حسن سلوک کی یاد تازہ کرتے اور وہ خجل ہوتا۔

صادق آباد کے "بیتھالوجسٹ" جناب آصف صاحب سے یونہی سی صاحب سلامت تھی، رحیم یار خاں کے سول ہسپتال کے احاطے میں مبارک شاہ کو ستم کش انتظار دیکھا تو جھپکے سے ایک کرسی لا کر پیش کر دی، یہ حیران کہ اس آدمیوں کے جنگل میں یہ انسان کہاں سے نکل آیا، زبان گنگ، مگر چہرہ بتا رہا تھا دل احساس ممنونیت سے لبریز ہو چلا ہے، اب آصف صاحب مہینے بھر میں اپنے سرکاری فرائض کی تکمیل میں گاؤں کا دورہ کریں یا سال چھ مہینے بعد سرِ راہ بھی شہر میں کبھی مل جاتے تو کرسی کا احسان یاد آجاتا اور اظہار شکر و سپاس ضرور کرتے،

چھوٹے بیٹے کے منہ سے بڑی بات یہ نکلی، یہ کیا آپ ہر وقت نصیحتیں کرتے رہتے ہیں، میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں، یہ بات مرحوم کے دل میں ترازو ہو گئی، مخصوص دوستوں اور عزیزوں سے جب اپنی خانہ بربادی کا دکھڑا روتے تو اس واقعے کا اعادہ ضرور کرتے، جن لوگوں نے سو پچاس روپے سے سلوک کیا سب کا تذکرہ یادداشتوں میں موجود ہے۔

وہ خاندان کی اجتماعی قوت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی کوشاں رہتے تھے وہ چاہتے تھے بھانجے بھتیجے بیٹے ہر روز نہ سہی ہر ہفتے مل بیٹھا کریں، وہ دور دور رہنے والوں سے شاکی ہی رہے، جب اپنا کوئی قریب پھٹکنے کا روادار نظر نہ آیا، تو انہوں نے اپنا غمخوار کارکنوں اور کاشتکاروں کو بنا لیا، گھنٹوں ان کی سنتے اپنی

وہ یوں بھی کم کم ہنستے تھے، جتنا سنایا اس سے کئی گنا زیادہ سنا، کوئی بے پر کی ہی کیوں نہ ہانکتا رہے وہ نہایت سکون سے سنتے رہتے، تبسم فرماتے لوگ یہ سمجھتے داد و تحسین کا حق ادا کر رہے ہیں اور کھل جاتے اور یہ سلسلہ دن بھر جاری رہتا، ایک آ رہا ہے دوسرا جا رہا ہے، وہ اپنے مستقر سے بہت کم غیر حاضر پائے گئے، ہفتوں گھر سے شہر تک نہ جاتے وہ ہی میل پر قصبہ اور بارہ میلوں پر تحصیل کا صدر مقام، ہر آنے والا اسی یقین سے آتا تھا کہ میں جا رہا ہوں تو پیر سائیں مبارک شاہ کو گھر ہی پہ پاؤں گا، اگلے وقتوں کے لوگوں میں یہ وصف بھی اپنی وضع کا ایک ہی تھا، ہر روز شہروں اور گلیوں کی خاک پھانکنا شریفوں کا کام بھی تو نہیں۔

کم گو تھے مگر مجلس آرائی کے دھنی تھے، صبح سے دوپہر تک اور سہ پہر سے رات گئے تک لوگوں سے متعلق رہتے، مسائل حل کرتے دکھ درد سنتے، فیصلے کرتے، آموں کی رت میں چند مخصوص دوستوں منشی احمد بخش رانا، شیخ محمد فاضل، استاد عبدالرزاق اعوان، حکیم محمد بخش کو بلاتے اور دو ایک دن ایک مہذب ہنگامے کی نذر کر دیتے زراعت میں شاعرانہ رنگ بھرنے کی کوشش کرتے، ابوالکلام، گاندھی نامی آم دیو ہیکل آموں کے پیڑ اب بھی باقی ہیں، ایک نہرو بھی ہیں لیکن جو مزہ ابوالکلام میں ہے وہ گاندھی اور نہرو میں نہیں، اور بھی بہت سے نام رکھے مگر زبان زد عام یہی دو ہوئے ابوالکلام اور گاندھی، بچوں کے نام رکھنے میں بھی بڑا انہماک تھا، ہفتے بھر کی تلاش، بسیار سوچ بچار کے باوجود مطمئن نہ ہو پاتے، مشاہیر سے نسبت کو ترجیح دیتے، مولویانہ آمیزش سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے مثلاً عبدالرحمٰن اللہ بخش اس قسم کے نام خارج از بحث تھے ایک نواسی کا نام "شکریہ" تجویز کرنا ان کی جدت و جودت طبع کا مظہر ہے، ایک اور نام تمکنت میں ابتداً تو کھردراہٹ محسوس تو کی گئی، ہے بھی تو کیا خیال ہے آپ کا ثقیل، لیکن جو تمکنت اور وقار اس میں ہے وہ ظاہر ہے، وہ مرحوم خاندان کے سب مردوں کا ایک موٹر ایک جہاز میں سفر کرنے کو بھی ناپسند کرتے تھے، کوئی حادثہ پیش آئے تو کہیں سبھی لقمہ اجل نہ بن جائیں یہ دلیل دیتے تھے،

ایک ہو تو لکھوں، بھائیوں کی ستم ظریفی، بیٹوں کی نامرادی، بھتیجوں کی احسان فراموشی اس پر مستزاد ایک بیٹی کا شوہر کے جیتے جی بیوگی کا عالم، اولاد نہ ہونے کی پخ میں میاں نے دوسری پھر تیسری شادی کرلی اور وہ غریب بھری پری حویلی میں تن تنہا رہ گئی، بیٹی کے مرثیے میں لکھتے ہیں

"بانجھ عورت سے مرد کو نفرت نہیں کرنی چاہیئے، اولاد
اس سے نہیں ہوتی کوئی مضائقہ نہیں، میاں بیوی زندگی پُر لطف
گذار دیں یہی حاصل زندگی ہے لیکن مشرق کا باوا آدم نرالا ہے جب
تک اولاد نہ ہو میاں نالاں رہتے ہیں، میری بیٹی بڑی صابروشاکر
ہے اپنی اذیت اپنے زخموں کی تراوش کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے
لیکن زخم دل اگر نہ بھی دکھائے بُو تو ہمیں آہی جاتی ہے"

سرائیکی گویانِ بہاولپور اگر کسی خاتون کو "مائی" کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا میل جول پاکبازانہ ہے، بدگمان بیوی کا تقاضا یہ کہ فلاں عورت سے تمہاری رسم وراہ مشکوک ہے، مائی کہو تو بخشے جاؤ گے ورنہ کھینچا تانی کا تماشا اولاد ان بڑھاپے میں دیکھتی رہے گی، وہ مرحوم اپنے جرم پر پردہ ڈالنے یا محض پڑھانے کے لیئے مئی بون جولائی مئی جون جولائی کی تکرار شروع کر دیتے اور بات ہنسی میں اڑ جاتی، لیکن بیوی ایک آفت کا پرکالا، زندگی بہشت کا نمونہ نہیں جہنم زار کردی، رائی کا پہاڑ بنا بات کشیدگی تک لے جائی گئی اور وہ تقریباً گھر سے بیزار ہو گئے، ایک ہی بیٹا، بڑا نہیں چھوٹا قریب تھا اسے بلا کر کہا اپنی ماں کو سمجھاؤ یہ دیکھو میرے بال نوچ لئے ہیں میں گھر چھوڑ دوں گا، غرض یہ جھگڑا دو چار برس تو یقیناً چلا ہو گا، جب کہ عمر شریف ساٹھ سے اوپر جا چکی تھی اور بیوی تھیں تیرے ستر کے پیٹے میں، اسے ارذل العمر ہی سے تعبیر کرنا ہو گا، مرد بھی سٹھیا جاتے ہوں گے مگر یہ بڑھیا جب تک بڈھے کی جان نہیں نکل گئی وبال ہی بنی رہی، اب ٹسوئے بہاتی ہیں، ہائے میرا سرتاج

وہ بھٹر بھس تھا یا اس ترافہ کی عشوہ طرازیوں کا کمال، ساٹھ برس کی عمر کے

آدمی کو شیشے میں اتار لیا بھی ہاں اتار تو لیا مگر شرط نکاح کی لگادی ، یہ سولی پر چڑھنے کے لئے ہمہ تن تیار ، طرفہ یہ کہ صاحبزادے بھی اسی کے فریب خوردہ ، وہ تو محض اتفاق تھا کہ اسے اس کے اقرباء اڑے ، ورنہ باپ بیٹے میں رقیبانہ آویزش نجانے کیا کیا گل کھلاتی ، اس لغزش سے بیوی کی ہوشمندی نے بھی بچایا ورنہ بزرگی کا بھرم جاتا رہتا اور نکو بن کر رہ جاتے تاہم وہ دست درازیوں سے چوکنے والے بھی نہیں تھے ، مزاج میں فاسقانہ نہیں نہایت لطیف عاشقانہ عنصر گندھا ہوا تھا ، فراوانیٔ شوق میں بے قابو ہوتے ہوئے نہیں دیکھے گئے ، ایک عفیفہ سے تعلق خاطر کو عمر بھر نباہا ، وفا شعار تھے ہرجائی نہیں ، جاڑے کی چاندنی اور غریب کی جوانی کون دیکھتا ہے مرحوم کی جوانی میں مردانگی کے تمام جوہر موجود تھے ، لیکن انہوں نے جوانی کو لٹایا بھی تو اس انداز سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ، بدنام نہیں ہوئے ، حسن ان کی کمزوری رہا ہوگا ، مرد کی کمزوری نسوانی حسن نہ ہو تو کیا ہو ، حسن پرست ضرور تھے ، بدنیت بدنظر اور ہوس پرست نہ تھے ، آنکھوں ہی نہیں دل میں بھی حیا تھی ، اپنی حیوانیت پر انسانیت کو غالب رکھا اور یہ بہر حال ایک کمال ہے ، کہتے کیا ہیں ؛

" مجھے حسن و عشق کی کیفیات سے وابستگی ہے ، اس لئے دوسرا کوئی موضوع میرے لئے دل خوش کن نہیں ہو سکتا ، عشق میں نشیب و فراز ہوتے ہیں ، روٹھنا اور منانا لازم و ملزوم ، اگر ایک طرف بے رخی ہو تو دوسری جانب جاں نثاری ہو "

یوں تو وہ موٹا جھوٹا پہنتے رہے زندگی بھر ، ایک زمانے میں تو کامل کھدر پوش ہو گئے تھے ، لیکن مزاج کی نفاست تو کھدر آمیز کیا ہوتی ، اس کا مشاہدہ ایک بار ہمیں بھی ہوا ، کراچی کے صدر بازار میں مرحوم ہیں ، میں ہوں ، رئیس احمد جعفری ہیں دو ایک ساتھی اور ، یہ قافلہ ایک ایک دکان میں جھانکتا ، مول تول کرتا ، تھانوں پر تھان گرم کپڑوں کے کھلواتا ، تلوے سہلاتا ، صبح سے سہ پہر تک جادہ پیما رہا ، بپاس خاطر رئیس احمد جعفری بادلِ نخواستہ کوٹ کے لئے کپڑا خرید لیا گیا بالآخرہ ستر سالوں میں دو

ایک کوٹ بنوائے ضرورت کی چیز سمجھ کر، کام کمبل، سوئیٹر سے چلتا رہا، کپڑا تو پسند کر لیتے تھے، رنگ، بس رنگ نظر میں کوئی سماتا نہ تھا، نیلگوں چیزیں انہیں اچھی لگتی تھیں نیلگوں سے مراد کیا ہے یہ آج تک نہ کھلا، جو حشر رئیس احمد جعفری کا ہوا تھا اس سے بدتر عارف نیازی کا ہوا، فریئر روڈ کے تمام کاغذ فروشوں کو چھان مارا بات کل پر ٹلی ممکن ہے کوئی اچھا کاغذ ہاتھ لگ جائے، ایک بیاض نہایت عمدہ کاغذ کارخانہ محبوبیہ سے جلد بندھوا کر پیش کی گئی، اتنی اچھی بیاض پر لکھا کیا جائے یہ اگر طے ہو جاتا تو وہ کوری بہر حال نہ رہتی، عزم واحتیاط کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔

دوست انہوں نے کم بنائے جو بن گئے ساری عمر ان سے نبھی، کہتے تھے نئے ملاقاتی پیدا کرنے سے بہتر ہے، پرانے دوستوں سے نبھائے جاؤ، دوستوں کی بے وفائی انسان کی زندگی تباہ کر دیتی ہے یہ اس وقت کہا جب بعض دوستوں سے جن کی دوستی کی عمر چالیس چالیس برس تھی ناچاقی ہو گئی تاہم بالکل ٹوٹے بھی نہیں،

مرحوم کی چند خصوصیات اور ملاحظہ کریں، بقلم خود کے ذیل میں ہیں یہ

"میری عمر اس وقت بیالیس سال ہے، میں نے آج تک شراب نہیں پی میں نے آج تک کسی سے فریب سے کوئی چیز نہیں لی، میں نے آج تک چوری نہیں کی، کسی چور سے کچھ لے کر اس کی مدد نہیں کی، میں نے کبھی خنزیر کو نہیں دیکھا اور نہ کبھی کتوں کے شکار کا تماشہ دیکھا ہے میں نے کسی دوسرے زمیندار کے کھیت سے بغیر اجازت کے گنا اور خوشہ تک نہیں توڑا، ہمیشہ یہ خیال رکھا ہے کہ دشمن کے متعلق دل میں یہ خیال نہ آنے پاتے کہ وہ آفات میں مبتلا ہو، میں چلتے وقت عمداً چیونٹیوں پر پاؤں نہیں رکھتا، جی چاہتا ہے نہ گوشت کھاؤں نہ کسی جانور یا جاندار کو بندوق سے یا دوسرے ذریعہ سے ماروں زبان سے کسی کی غیر معمولی تعریف کرنا شرم آتی ہیں اور اپنی تعریف سننا بھی ندامت محسوس ہوتی ہے۔"

تاش کھیلنا بھی جانتے تھے اور یاروں سے زور آزمائیاں کرتے ہوئے بھی
میں نے دیکھا ہے، گھوڑے سوار اچھے تھے اور بندوق کا نشانہ بھی برا نہ تھا، مگر وہ
عدم تشدد کے حامی تھے اور پرندوں کی رونق ختم نہ کرنے کے حق میں تھے، بے حد
ٹھنڈے مزاج محبت اور صبر والے، بلکہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں اپنے آپ کو چھپایا۔

دشمن مرحوم نے بنائے ہی نہیں، بجز ایک شخص محمود بخش کے، یہ خود
دشمنی پر اتر آیا تھا، یہ بیٹا تھا پیر احمد شاہ کی بیوی حیاتاں کا، یہ نائی بچہ اپنی ماں
کے نئے شوہر کی ناک کا بال بن گیا، رفتہ رفتہ سیاہ اور سفید کا مالک بن کر رہا، مرنے
والے احمد شاہ کے جانشین نے مار آستین سمجھ کر منہ نہ لگایا تو کوچہ و بازار میں دشنام
طرازی پر اتر آیا، سزا کا مستحق تو ہو کر رہا، مبارک شاہ کو کہنے کی ضرورت نہ پڑی وہ
آپ ہی گاؤں بدر ہوا اور وہ بارہ ایکڑ زرعی زمین جو اس کے تصرف میں تھی چھین لی گئی
کسی سے الجھتے نہ تھے، حوادث روزگار کی فتنہ سامانیاں ہوں یا دوستوں کے
غم، وہ سب کچھ دل پہ لیتے تھے چھوٹوں اور عام لوگوں سے بھی آپ جناب سے گفتگو
کرتے، چہرے سے رعب و داب ٹپکتا تھا مگر وہ کسی کو از خود مرعوب نہیں کرتے تھے
دل درد سے لبریز رہتا تھا، بڑے پوتے محمد شاہ پر جان چھڑکتے تھے، تمام امیدیں اسی
سے وابستہ تھیں، ایک رئیس آئے، گاؤں میں موٹر کا ورود بچوں کے لئے انبساط خاطر کا
باعث کل بھی تھا آج بھی ہے، عید ہو جاتی ہے موٹر کا گھیراؤ ہوا، ڈرائیور حاجی عارف
ایک جل ککڑا اور کم ظرف، بچوں کو سیر کیا دیکھنے دیتا، بھاگنا اور بھگانا شروع کیا، سید
زادہ کہاں بھاگنے والا تھا کھڑا رہا، آتے والے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑاق سے ایک
تھپڑ رسید کر دیا، اپنے چہیتے کی چیخیں سن کر بے اختیار ہو گئے اور جب حادثے کا علم
ہوا اپنے قابو میں نہ رہے، ہچکی بندھ گئی، سب کو پریشان کیا، گریہ طاری ہوا اور
حالت دگرگوں ہو کر رہ گئی،

غیرت شملوی ایک مظلوم، بیس سال بستر علالت پر گذار دیئے اور اسی عالم
اسی حالت میں مر گئے، رامپور سے سکھر آئے، میرے بہنوئی ولی محمد شاہ غیرت سے

ملے، دو غزلیں حیرت کی آواز میں سمیٹ لاتے، اپنے درد اور رنج والم کا سوز اپنی آواز میں پاکر حیرت دل گرفتہ ہوئے، آنسوؤں کا تار بندھ گیا، سنبھلے تو پیغام بھی یہی کہ اپنی آواز سن کر نجانے کیا ہوا کہ رو پڑا، مبارک شاہ نے سنا تو لاکھ روکا مگر چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، سکھر جاکر حیرت سے ملے بھی،

خوش آواز تھے اور اچھی آواز پر جان دیتے تھے، ریڈیو پر کہیں سحاب قزلباش نے اپنے مخصوص ترنم میں فارسی غزل گاکر سنائی، کچھ تو کلام کا اثر کچھ آواز کا جادو، لکھتے ہیں، دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا، یہی جانا کہ بس گئے۔ صوتی اثرات سے مغلوب ہو جاتے، ایک ہی خادمہ کو آواز دیتے تھے اور بھی تھیں مگر چونکہ اُس کے نام کا صوتی اثر اچھا تھا اس لئے کسی اور کو نہ بلاتے، لکھنؤ میں ہارمونیم تک خرید لیا تھا، سفر خرچ تمام ہوا تو بیچ کھایا، یا پھر کچھ ایسا ہی قصہ ہوا، گھر پہ لانا بھی دشوار نظر آیا ہوگا، یہاں کا ماحول اس کا متحمل کیونکر ہوتا، اُس کا یہ بھی ہوا تھا کہ وصل بلگرامی سے کہا گروی رکھ لو ہارمونیم وصل جہاندیدہ اور خرانٹ تھے مگر مسافر کو سمجھ نہ پاتے، منہ نہ لگایا، دوسرے ہی دن منی آرڈر پہنچا، مسافر کو وصول کرتا دیکھا تو خوشامد کر کے اپنے ماہنامے "مرقع" کا زر سالانہ بٹورنا چاہا، دل دکھا چکے تھے صلہ کیا پاتے،

بچھڑنے والے دوستوں کی یاد زندہ ہوں یا مردہ ان کو رُلانے کے لئے کافی تھی بیٹوں کا کھنچے کھنچے رہنا بھی ان کو کھلتا تھا، عید شب برات کے موقعوں پر احساس تنہائی بڑھ جاتا اور وہ افسردہ خاطر اور ملول ہو جاتے، آواز تو ان کے منہ سے کبھی نہ نکلی مگر آنکھیں دریا بہائے بغیر دم نہ لیتیں، عسرت کے زمانے میں ہندو مہاجن کے ہاں سے ہر چیز آتی تھی، مقروض رہتے تھے، مگر خوددار اس بلا کے تھے کہ تمام بنیئے اختراماً خائف رہتے تھے، ہاتھوں ہاتھ لیتے، ہندوؤں سے یارانے بھی تھے، قیام پاکستان کے بعد ایک ہی مقامی ہندو محمد آباد آیا گو وہ مرحوم کا دوست نہیں تھا لیکن خوب گلے مل کر روئے سکھ دوستوں کے جان و مال کی حفاظت یہاں تک کی کہ اپنی حویلی سے ملحق ایک حویلی خالی کر کے اپنے دل میں کہنا چاہیئے بٹھا لیا، جان چھڑکا گئے پہرہ دار بن گئے

بہت رد کا منع کیا، مگر وہ کچھ ایسے خوفزدہ تھے کہ مسلمان بن کر جینے ہی میں عافیت نظر آئی، ستر ستر سال کے بڈھوں کی "گل تراشیاں" ہوئیں، لیکن با اثر اقربا نے ہندوستان بلوا کر ہی دم لیا اور سکھ کے سکھ ہی جیئے، نیاز فتحپوری سے تو عشق تھا تعزیت کے لیئے گئے تو آنسوؤں سے خراج عقیدت پیش کیا قبر پر بھی گھر پہ بھی،

اپنی بے خیالی اور بے توفیقی پر اب دل کڑھتا ہے مواقع کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا، بتر کاً کچھ لکھوا لیا ہوتا، میرا بیٹا ابوالکلام جیلانی البتہ بازی لے گیا،

میرے اچھے پوتے میں نے آپ کا نام ابوالکلام رکھا ہے
دل میں یہ امید ہے کہ آپ ابوالکلام ثانی بنو، عربی، اردو، انگریزی
فارسی میں ایسی قابلیت پیدا کرو کہ پاکستانی قوم آپ پر آفرین
کرے

؎ تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری

سید مبارک شاہ

۲۸ فروری ۶۸ء

یہ غالباً پہلا اور آخری "آٹوگراف" ہے، لوگ نمود و نمائش پر ٹوٹتے ہیں نہ یہ فلم ایکٹر نہ وزیر نہ سفیر نہ شاعر نہ ادیب، غیر مطبوعہ مواد کچھ تو مرتب اور کچھ بے ترتیب موجود ہے، چند ایک کے نام یہاں گنوائے دیتا ہوں

۱۔ انتخاب سعدی حافظ
" غالب اقبال
۲۔ سوانح پیر محمد شاہ جیلانی علیہ الرحمۃ
۳۔ اردو سانچے اول، دوم، سوم
۴۔ سرگزشت مبارک
۵۔ جوئندہ یابندہ (ناولٹ)
۶۔ نگارشِ مبارک

۷۔ ضرب الامثال سرائیکی

اور بھی بہت سی چیزیں ہیں، وہ راتوں کو تنہائی اور سناٹے میں ٹمٹماتی ہوتی لالٹین کی روشنی میں خاصے جھکے ہوئے لے یوں بھی کہہ سکتے ہیں خوب جھک کر لکھا کرتے تھے، بینائی کمزور ہو چکی تھی لیکن عینک لگوانا پسند نہیں کیا کان اور معدہ البتہ مرتے دم تک تیز اور مضبوط رہے، یہاں ایک قصہ "لیٹر پیڈ کا اور لکھ دو دل" جس کے چھپوانے کے ارادے وہ بیس پچیس برس تک باندھتے رہے یہ منصوبہ تشنہ تکمیل ہی رہا، اس سلسلے میں رئیس احمد جعفری انہیں کا مرتبہ اور ہمدرد کے کارٹونسٹ اور مصور، سمیع کے ہاں بھی لے گئے"، انہوں نے ایک سرسری خاکہ بھی مرتب کر کے دیا مگر وہ جچا نہیں، وہ چاہتے تھے شاعرانہ فضا ہو بلکہ دلی کے آخری مشاعرے کا منظر جو مرزا فرحت اللہ بیگ نے کھینچا ہے تصویر بن کر سامنے آجائے، لال قلعہ شعرا اور بہادر شاہ ظفر سبھی پہچانے جا سکیں، پس منظر میں صبح صادق طلوع ہونے والی ہو اور مشاعرے کا اختتام ہو، سرنامہ یوسف دہلوی سے لکھوایا جائے، اس مجذوب کو کچھ پیسے ویسے بھی دیئے گئے مگر بات منصوبوں کی حد تک ہی رہی/ شغف مصوری سے بھی مبارک شاہ کو تھا، بچوں کو تصویریں اور کاغذی کشتیاں بنا بنا کر دیا کرتے تھے، یادداشت بہت تیز تھی، حکام رس نہیں تھے، تعصبات اور فضول کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے تھے اور رہتے تھے دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ

پچاس برس کے سن سے مرتے دم تک بیس بائیس سال جوڑوں کا درد چمٹا رہا، درد جینے چلنے پھرنے حتیٰ کہ کروٹ لینے سے بھی معذور ہو جاتے، جوڑ جوڑ دکھتا اور وہ بھی ایسا ویسا نہیں ذرا کپڑا چھو جائے تو گھُٹ کر رہ جاتے، اس پر بھی کراہتے اور اللہ اللہ کرتے رہتے کبھی آواز ان کے حلق سے بے قابو ہو کر نکلی نہیں بخار کی شدت اور نڈھال کر دیتی، ایک مرض اور تھا بلغم میں سال سال بھر کے ناغے سے خون آجاتا تھا، یہ پھیپھڑوں کی خرابی نہ تھی گلے کی کسی رگ وگ کے پھٹ جانے کا معاملہ تھا، دل کو بھی عادت بے قاعدگی کی پڑ گئی تھی، یہ تو خیر خاص مرض تھا،

وہ تو ذرا سا بخار چڑھ جاتا تو اتنا سا منہ نکل آتا، آنکھوں سے حسرت و یاس ٹپکنے لگتی، موت کا خدشہ پچاس سال گزرتے ہی دل میں سما گیا تھا دھڑکا لگا رہتا تھا، بچوں کے جلد از جلد بڑا ہو جانے کی دعا کرتے، کہتے تھے میں اپنی خاندانی عمر پوری کر چکا ہوں دیکھو کب آنکھیں بند ہو جائیں، دوا دارو سے بھی گھبراتے تھے، بالکل بادشاہوں کی سی احتیاط کہہ نہیں سکتے تھے ورنہ وہ ایک چمچہ دوا کا پہلے تو کسی مصاحب کو پلاتے پھر خود پیتے، بھانجے کا تجویز کردہ نسخہ اور مشورہ حرف آخر بن کر رہ جاتا بیٹے خاں دوائے کر آتے تو پیتے ورنہ ایک طرف ڈال دیتے، یوں بھی ذرا بخار اترا درد کم ہوا اور دوا القط، وہم یہ بھی تھا دوائیں بڑی تیز ہوتی ہیں، کہیں دل کو نہ دبوچ لیں، مرحوم کا کام تمام بھی بالآخر بیماری دل ہی نے کیا، جیپ سا منے پڑے تھے، کہا گیا آج نہ سہی کل کوئی دوا لے لی جائے گی، نہایت حسرت و یاس کی کیفیت میں منہ سے نکلا۔ کل! اس کل نے تیمار داروں کو چوکنا کر دیا کہیں کچھ ہونے والا تو نہیں، یہ محض اتفاق تھا پوتا محمد شاہ بھی سکھر کالج سے چھٹی لے کر فاضل صاحب کے ساتھ آگیا خوش ہو گئے جان میں جان آئی، ڈاکٹر سلیم باجوہ فون سنتے ہی آئے، دیکھا بھالا، دل اپنا کام کئے جاتا تھا، ایسی کوئی تشویش کی بات ہوتی تو بتاتے لیجئے وہ بھانجے سید نیاز محمد شاہ بھی آگئے، ان کا کہنا نوشتۂ تقدیر پہلے بھی تھا اب بھی ہوا، آتے ہی شور مچا دیا، چلو چلیں رحیم یار خاں وہاں ڈاکٹر عبدالرحمٰن ہمدانی ہیں ایف آر سی ایس، بڑے ماہر بڑے فاضل، یہ سنتے ہی مریض بھی گھر چھوڑنے کے لئے بیقرار ہو گیا، اٹھ کھڑے ہوئے، نکلتا ہوا قد تو تھا ہی، سبھی نے محسوس کیا سیدھے الف چلے آرہے ہیں، ناتوانی کا شائبہ تک نہ تھا، دل کا مریض اٹھیس میل کا سفر، مانگے تانگے کی رئیس غلام محمد انڈھڑ کی جیپ، بھتیجے بیٹے بھانجے شاعر دوست شیخ محمد فاضل کو بھی ساتھ بٹھایا، گفتگو جیپ کے سفر اور سواری پر چل نکلی، فاضل نے کہا کچے راستوں پر جیپوں میں جھٹکے اور دھکے اتنے لگتے ہیں کہ خواتین کے تو حمل گرنے کے امکان اور خدشات پیدا ہو جاتے ہیں، مریض کی رگ تفنن پھڑکی۔ فرمایا: حمل ٹھہر بھی تو سکتا ہے، اس جملے کی بلاغت

سب کو لطف دے گئی، بے غل وغش یہ سفر طے ہوا، ڈاکٹر ہمدانی نے بھی خوب دیکھا بھالا، ہمدانی نیر پور ٹامیوالی کے نکلے، مریض بچپن میں وہاں کی سیر دیکھے ہوتے گفتگو کا سلسلہ چل نکلا، نسخہ بھی تجویز ہوا، کچھ ہوتا تو ہم سے کہا جاتا، یہیں رہو، سفر نہ کرو، اپنی کیفیت مریض نے لکھ کر بھی دے دی تھی خطاب ڈاکٹر سلیم باجوہ سے تھا،

کل سے سینہ میں سوزش ہے، چند قدم چلنے سے دمہ کی سی حالت ہو جاتی ہے گلے کی رگوں میں تناؤ ہو جاتا ہے کچھ وقفہ کے بعد پھر یہ تکلیف ہو جاتی ہے، بلغم خارج نہیں ہوتا اور نزلہ رہا اب اس کا آرام ہے شائد یہ حالت دمہ کی ہو' [اللہ رے آدمی کی بے بسی، جو کچھ گزر رہی ہے اس کو بھی سمجھ نہیں پاتا، جو دل پر گزرتی ہے وہ بھی بیان نہیں کر سکتا]،

گھر سے دس بارہ میل دور جیپ میں کچھ خرابی واقع ہو گئی، مریض اور متعلقین یہ چاہیں کہ آن کی آن میں گھر پہنچیں، ناخدا ایک غیر، اُس کا اصرار یہ تھا کہ "ڈائی نامو، بنواؤں تو چلوں، کل کون آتا پھرے گا، اس دوران میں مریض اپنے حواس کھو بیٹھا، ہاتھوں ہاتھ چارپائی پر لٹایا گیا قریب ہی ہسپتال تھا، ہم لے کر چلے تو ہوش میں آ گئے، بیٹے کو پوچھا، کہاں ہے، ایک آدھ جملہ بے معنی بھی اس مرحوم کے منہ سے نکلا اور یہ کہ کتنی دور ہے ہسپتال، کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا، چارپائی سے اٹھ کر بغیر کسی سہارے کے بڑی پھرتی سے پلنگ پر منتقل ہوئے، بے پناہ اضطرار اور اضطراب، کبھی لیٹ جاتے بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے، ماہئ بے آب کی طرح تڑپنا چاہیں، بیٹے نے ڈپٹا، یہ کیا، آپ کے گرد تو حلقہ بندھ چکا ہے لوگ آپ کو دیکھ رہے ہیں، اپنی کیفیت پر قابو پالیا، کوشش بہرحال یہی کی، تہبند ذرا اِدھر اُدھر سرکا تو ٹھیک کر لیا، کہا تو صرف یہ کہا، کیا کروں سخت تکلیف ہے اوپر ریڑھ کی ہڈی میں درد، ڈاکٹر تھے سومرو صاحب موصوف نے اپنی والی کوشش کر ڈالی، وہ چاہتے تھے رگ میں دوا چلی جائے، یہ

تو نہ ہوا، عام ٹیکہ ہوا اور وہ جسے گھر میں اپنے بستر اور اعزہ کے جھرمٹ میں مرنا چاہیئے تھا ہزار حیف کہ سول ہسپتال صادق آباد کے جنرل وارڈ میں موت سے ہم آغوشی کے مراحل طے کر گیا، بڑی آسانی سے، زبان پر اللہ اللہ تھا، میت سے خوشبوئیں پھوٹنے کی گواہی بھی معطل نہیں بحال چلی آتی ہے، بزم لالۂ صحرا کا یہ سورج مکھی بظاہر اپنی جگمگاہٹ کھو چکا ہے مگر اس کا روحانی تصرف جاری و ساری ہے، اس کی ضوفشانی غنچہ و گل سے عیاں ہے، اب وہ اپنے گھر سے خاصے فاصلے پر دور اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں، فرمایا کرتے تھے

ع کسی جا ادڑھ کر سو جائیں گے دامن بیاباں کا

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء

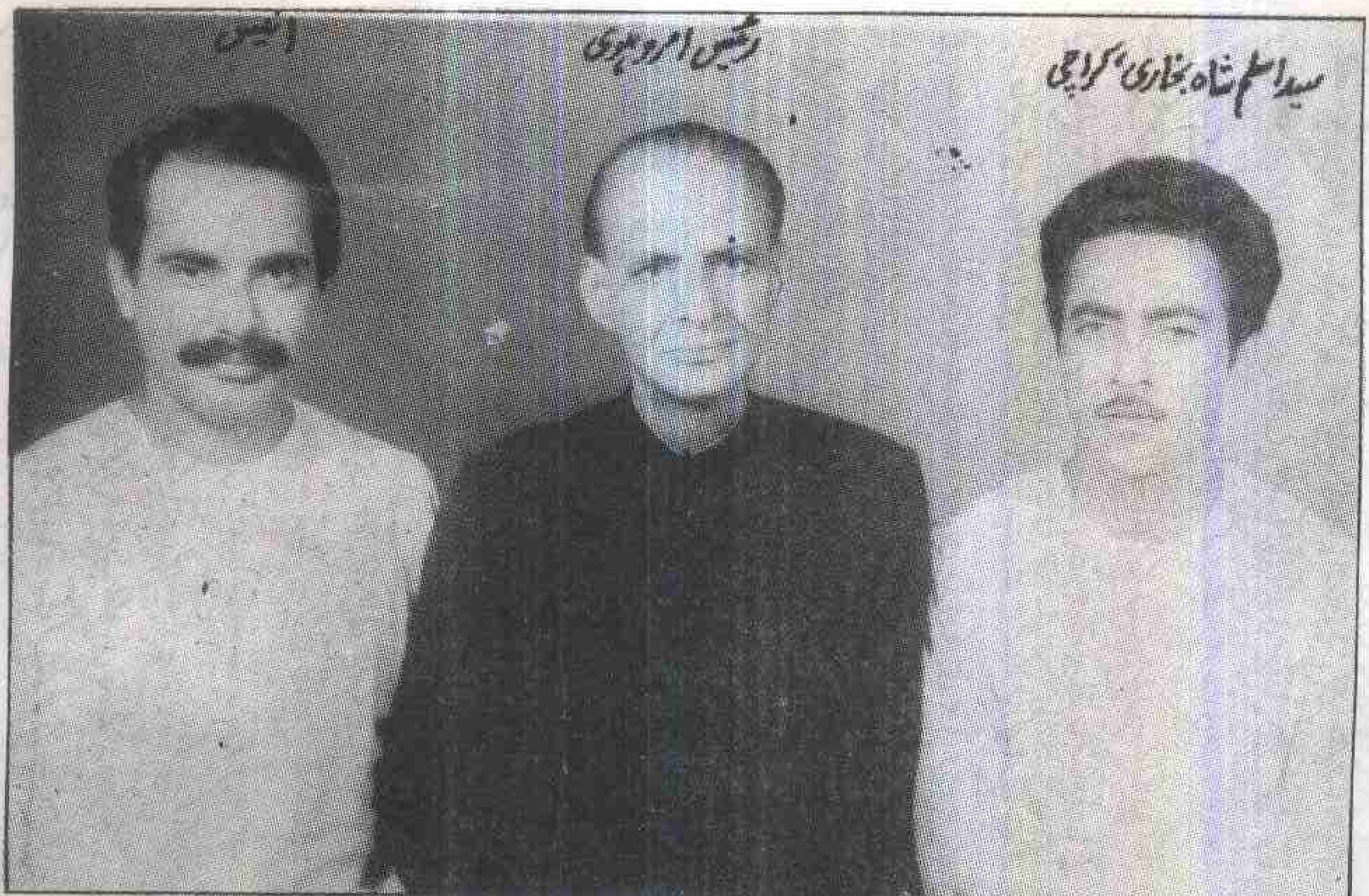
میں تیرا دشمن نظر آنے لگوں

کہیں ایسا نہ ہو

حضرت رئیس امروہوی ایک برگزیدہ خاندان کے نہایت معزز اور محترم فرد ہیں، دادا پردادا تو شیخ طریقت تھے ہی یہ بھی کسی طرح کسی سے کم نہیں ہیں، تصوف سے خاص مناسبت ہے اور اس موضوع پر وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں، مطالعہ بھی تصوف ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، میلانِ طبع شعر گوئی کی طرف زیادہ ہے، میرا خیال ہے اس میدان میں آباء واجداد ہی کیا دنیائے ادب میں کوئی ہمسر بھی مشکل سے ملے گا، الفاظ و معانی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، بادل سے چلے آتے ہیں اگر وہ کہیں مضمون مرے آگے تو اس پر تعلی کی تہمت لگانا یقیناً مشکل ہو جائے گا جسے، چاہا جسے چاہا جہاں چاہا بٹھا دیا سجا دیا لڑا دیا، ممولے کو شہباز سے لڑانے کا فن وہ خوب جانتے ہیں، شعر کہنا ان کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا سانس لینا کھانس لینا، فطرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے، کیسا ہی مشکل موضوع ہو کتنا ہی وسیع و عریض پس منظر ہو کھٹ سے دریا کو چار مصرعی کوزے میں بند کر دیں گے سیاسی ہی نہیں اخلاقی معاشرتی امور پر گرفت اتنی بھرپور کہ بے ساختہ زبان سے نکلے، واہ واہ سبحان اللہ

گذشتہ تیس برسوں سے روزنامہ جنگ میں قطعہ نگاری کا فرض ادا کر رہے ہیں اسے جوہر دکھانا بھی کہہ سکتے ہیں، یہ قریب قریب فی البدیہہ کہے جاتے ہیں، گنیئے تو بائیس اکیس ہزار سے زیادہ شعر تو یہی ہو جاتے ہیں اور وہ جو یاروں کو درجنوں کے حساب سے بلا معاوضہ اور قیمتاً غزلیں لکھ لکھ کر بانٹتے رہے وہ کس کھاتے میں جائیں گی، سچ پوچھ صاحب دیوان ہو گئے لوگ، شاگردوں کی صف میں ایسے بزرگ بھی دیکھے

جو بجا طور پر صورت گر رئیس کے استاد نظر آتے ہیں، ویسے وہ حضرات ہیں بھی تو استاد ہی، سر کھپائیں رئیس، ناموری ہو میری آپ کی، لیکن بقول خود "کمھن" تو وہ اپنے لئے سنبھال کر رکھتے ہیں، شاگردوں کی تعداد تین چار سو کے لگ بھگ ضرور ہوگی، زیادہ ہو تو تعجب نہ ہوگا، میں ایسے بزرگوں کو بھی جانتا تو ہوں، جنہوں نے غزل ہی کیا مرثیہ گوئی میں بھی مانگے کے اجالے کا نور بکھیر کر رکھ دیا ہے، قطعہ نگاری میں جو خصوصیت حضرت کو حاصل ہے وہ اردو میں کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، قوم کی نبض پر ہمیشہ ہاتھ رہا، لگی لپٹی رکھے بغیر لکھا بے خوف اور نڈر ہو کر، ارباب اقتدار پر ہمیشہ کڑی تنقید کی اور زد پر رکھا، مگر بات دل میں اتر جائے، کبیدگی نہیں انشراح صدر کا سامان کرے، یہ شیوہ خاص ہے، ان کی بات میں ایک شان ہے آن ہے دبدبہ ہے، مزاح ہے، پھکڑ نہیں طنز ہے ایسے حد لطیف، تضحیک کا گذر نہیں، حقہ پیتے بہتوں کو دیکھا مگر اتنے زوردار کش لگاتے ہوئے کسی کو نہ دیکھا چرس پینے والے اس انداز میں دم لگا سکتے ہیں، سگریٹ اور حقہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور قلم بھی، اکارکن چلم دن بھر میں کئی بار تازہ کرتے ہیں، پیتے تو وہ گذشتہ تیس برس سے شراب بھی ہیں، بڑی باقاعدگی سے سر شام، لیکن سجا بنا کر نہیں، الماری میں منہ ڈالا اور بڑا سا گھونٹ نگل لیا، گلاس تو الماری سے باہر بھی آجاتا ہے مگر بوتل کو ہوا نہیں لگنے دیتے، بہت سینت سینت کر رکھتے ہیں کتابوں کے انبار کے پیچھے چھپی رہتی ہے، دوستوں سے فرمائش بھی کرتے رہتے ہیں، بھری بُری بوتل تو رکھی جاتی ہے میں نے ایک ننھی سی بوتل سکاچ وسکی پیش کی، دو تین جام تو ضرور چھلک جاتے مگر اس کو کیا کیجئے کہ ہاتھ جھٹک کر منہ بنا کر وہ لوٹا دی گئی، سچ ہے اونٹ کی داڑھ میں زیرے کا کیا کام، چار پیالے تو انہیں بہکا نہیں سکتے ترنگ میں آکر آگے بڑھ جائیں تو اول فول بکنے لگتے ہیں زبان تھتھلانے لگتی ہے اور یہ ہوش نہیں رہتا کیا کہہ اور کیا کر رہے ہیں، بے خودی کا یہ عالم بارہا میں نے دیکھا ہے، ایسی ہی ایک کیفیت میں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اِدھر سے اُدھر کھسکانے کی جدوجہد ایک ڈیڑھ


رئیس امروہوی
سید اسلم شاہ بخاری، کراچی

گھنٹہ سے زیادہ رہی بڑی مشکل سے لحاف اوڑھایا اور سلایا، صبح اٹھے تو تازہ دم، وہی قلم وہی حاضر باش، مضمون نگاری مجلس آرائی، کوئی سرگرانی نہیں کسی قسم کا اضمحلال نہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں، جامۂ احرام کے دھبے دھونے کی ضرورت انہوں نے کبھی محسوس ہی نہیں کی، ایک زمانے میں خواب آور گولیوں پر یاروں نے لگا دیا تھا، ویلیوم یا کیا نام تھا ان کا، گھنٹوں بے سدھ پڑے رہتے بولتے بولتے غائب، دماغ البتہ حاضر، میرے گاؤں میں آئے تو آزمانا چاہتے تھے بھنگ کا خمار کیسا رہتا ہے مگر میں نے اس کم حوصلہ نشے بازی سے باز رکھا، مری اور پنڈی کی بنی ہوئی دیسی جن کا پوا دس روپے کا آتا تھا، برسوں وہی خریدتے اور پیتے رہے، حلقہ ارادات اور جیب میں جوں جوں وسعت آتی گئی معیار اونچا ہوتا گیا، اب انگریزی اور فرانسی وہسکی وغیرہ کا چٹخارہ پڑ چکا ہے،

جس کا کھائیں گے اسی کا گائیں گے، یہی جوش ملیح آبادی نے کیا، بھارت ماتا ترنگا اور نہرو، فکر و نظر کا مرکزی نقطہ رہے زندگی بھر، اے ٹی نقوی کے بھرّے میں آ کر پاکستان میں بس جانے کی سوجھی، یہاں نظریۂ پاکستان کے، مخالفوں کی آؤ بھگت بھلا کیا ہوتی، خوب لے دے ہوتی اخباروں میں، ایک شور ایک ہنگامہ ہمارے رئیس احمد جعفری مرحوم نے متعدد شذرے ظفر علی خاں کے زمیندار میں تابڑ توڑ لکھے، لیکن جوش ہندوستانی سے پاکستانی بن گئے، روحانی طور پر تو خیر نہیں جسمانی ہجرت کامیاب رہی، اردو برادری نے ڈرتے ڈرتے پذیرائی کی اور جب فضا ذرا صاف ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لیا، رئیس کے ہاں غروب آفتاب کے ساتھ جوش صاحب کا طلوع ہوا، اچھی خاصی گھٹنے لگی، جوش کے پاؤں جم گئے تو یہ آنا جانا کم سے کم تر ہوتا چلا گیا، رئیس کی معیت میں مجھے بھی جوش صاحب کے ہاں جانے اور مزے مزے کی باتیں سننے کا موقع ملتا رہا، حضرت اپنی بوتل ساتھ لے کر چلتے تو ہم نے پوچھا یہ کیوں، فرمایا جوش کے ہاں چلتے ہیں، وہ بہت کنجوس ہیں وہاں جاتے جاتے شام ہو جائے گی، وہیں بیٹھ کے پئیں گے، تو تعمیر بنگلے کی دوسری منزل کے پیچھے

پرچہ بچتے ہی بوتل اور گلاس چھین دیئے گئے، جوش صاحب نے جھوٹوں بھی اپنی بوتل کی طرف اشارہ نہ کیا، دونوں اپنی بوتل اپنے پیمانے تک ہی محدود رہے، ہیں یہ کمینگی اور ظرف کی کم مائگی دیکھ کر ملول کیا ہوتا شادمانی سی شادمانی بہ رہی کم از کم میں تو ایسا خبیس الفطرت نہیں ہو سکتا، یہ بھی کہہ سکتے ہیں پاسِ احتیاط کا ایک پہلو یہ بھی ہے، پھر بھی دم گھٹنا تو چاہیئے، ویسے رئیس کا یہ ہے کہ پیمانہ و صہباان کے آگے رکھ دیجئے تو گل افشانی گفتار دیکھنے کی چیز بھی ہو جاتی ہے، بشرطیکہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھنے پائیں،

پی کر قلم انہوں نے کبھی نہیں اٹھایا جو کچھ لکھا ہوش و حواس میں رہ کر خوب سوچ سمجھ کر اور ایک خاص منصوبے کے تحت لکھا، رئیس ایک عملی انسان ہیں نرے کھرے شاعر نہیں، جو چائے خانوں میں دن بھر گپ ہانکنے اور شام کو مانگے تانگے کا ٹھرا پی کر فکر سخن فرماتے ہیں، پہلا عملی قدم جو انہوں نے اٹھایا وہ پاکستانیوں کے ذہنی خلفشار اور جنسی کجروی کا مداوا ہے ان کا مشہور اور مقبول نفسیاتی کالم سترہ اٹھارہ برس سے روزنامہ جنگ کراچی میں خواص و عوام کے مطالعے کا محور رہے، ہم نے بھی ٹوکا حضرت یہ کیا آپ نے جناتی مضامین کا طومار باندھ دیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں لوگوں کو اوہام پرستی میں مبتلا کیا جا رہا ہو، اس پر وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے، یہ شروع شروع میں ہوا، انیس سو اکسٹھ میں، پھر تو یہ دیکھا کہ خطوں کا تانتا بندھ گیا، دس بیس پچیس پچاس سو سو خط روزانہ آنے لگے، ہر شخص آفت رسیدہ حوادث روزگار اور کرب ذات کا مارا ہوا، رئیس چند حرف تسلی کے لکھ بھیجتے دو چار خطوں کے تبادلے کے بعد گرہیں، کھلتے کھلتے بالآخر سلجھ جاتیں، اس دوران میں رئیس نے اپنا زیادہ وقت تسخیر ذات، عملِ توجہ اور تشخیص ہمزاد پر صرف کیا، بلور بینی اور سائنس کی مشقوں پر گھنٹوں بند کمروں میں داد تحقیق دی اور تاں ادارہ من عرفہ نفسہ پر لوٹی "مریضوں" میں اضافہ ہوا تو باضابطہ حق المحنت وصول کرنے لگے ایک کتابچہ سائنس اور دوسری بہت سی مشقوں وغیرہ پر مشتمل مرتب کر کے چھپوا

دیا، یہ افادہ عام کی چیز ہے مگر گرہ بنا اس پر عامل ہونا باعث قبض کا ہے انبساط کا نہیں، رئیس کی دس سالہ ریاضت آخر کار رنگ لا کر ہی رہی، ایک بڑی اکثریت ان کے حلقہ ارادت میں در آئی، خلائق کا ہجوم ان کے روحانی تصرفات پر ایمان رکھتا ہے، دل آزاری نہیں دلجوئی ان کا شیوہ عام ہے اس سے رئیس کا پیٹ پلتا اور بہتوں کے درست ہوتے ہیں دماغ، نفسیات پر کم و بیش بیس بائیس مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور چھ روپے سے کم کسی کی قیمت نہیں مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کوئی محققانہ مقالات نہیں ہیں، عوامی خطوط کا ذخیرہ ہیں، بے حد نمکیں، پڑھیے تو بھربھری سی آ جائے اور سرسراہٹ، رنج والم کیسا لذت ہی لذت، لطف ہی لطف، بازار میں مانگ اور چلن ایسی ہی چیزوں کا ہو تو ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں اس طرح زندگی کا یہ رخ بھی بڑا تابناک ہے کہ رئیس ایک تجربہ کار ناشر ہیں،

نشر و اشاعت کا تجربہ پہلے سے بھی تھوڑا بہت تھا ہی "سب رنگ" کے شکیل عادل زادہ کے باپ عادل ادیب کے ماہنامہ "مسافر" اور دوسرے کئی ماہناموں میں دادِ ادارت دے چکے تھے، پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد "شیراز" نکالا پھر یہ "انشا" بن گیا جو "عالمی ڈائجسٹ" بن کر جون ایلیا سے زیادہ زاہدہ حنا کی گود میں جا پڑا، روزنامہ جنگ سے منسلک تو وہ دلی سے ہو گئے تھے غالباً یہ رشتہ جڑا ہی تھا کہ پاکستان عالم وجود میں آگیا، یہ آپا دھاپی افراتفری اور نفسی نفسی کا زمانہ تھا، جس کے جدھر سینگ سمائے نکل کھڑا ہوا یہ چونکہ مسلم لیگی تھے کسی ترکیب سے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے کراچی اترے، یہاں سن سینتالیس کا زمانہ لیکن میر خلیل الرحمٰن اپنے روزنامے کا ڈول ڈال چکے تھے، اب تو خیر اخبار کا دفتر کیا ہے ایک نگار خانہ چین ہے، تب کی بات اور تھی ایک ڈیڑھ کمرہ، مالک و مدیر چپراسی بھی تھا اور ہرکارہ بھی، جنگ کے رئیس وغیرہ تو اکنی کے بند اور دو پیسے کی پھیری والوں سے چائے پی کر پرورش کی دن بھر کی اخبار نویسی کے بعد رات گئے دینی نام کے ایک بستر میں خواب استراحت اور کھٹملوں کے مزے لوٹتے، صبح

ہوتے ہی پھر جُت جاتے،

بے شمار علمی ادبی اداروں کے سرپرست، سیاسی تحریکوں میں پیش پیش یہاں تک کہ پاک عریبین بنک کے صدر، بنگلہ دیش وجود میں آیا تو وہاں سے نکالے جانے والے مہاجرین المعروف بہ بہاریوں کے لیے گھر کو مہاجر اور مسافر خانہ بنا لیا، کپڑوں کے انبار، برتنوں کے ڈھیر، سلائی کی مشینیں، قربانی کی کھالیں، سبھی کچھ جمع کیا اور بانٹا، ٹکٹ لگا کر قوالیاں بھی کروائیں، اس میں بدنام بھی ہوئے نیکی بھی کمائی، خیر کے پہلو بہ پہلو شر تو ہے ہی، حلفیہ کہتے ہیں خود نہیں کھایا مبرے نام پر یاروں کے وارے نیارے ہوتے ہوں تو دوسری بات ہے خود نہیں کھایا تو بھائی یہ پرانا مکان ادھڑ کر نیا کیونکر بن گیا، فرمایا، یہ سب قرض کی کرشمہ سازی ہے۔ تاہم جوں جوں میدان عمل میں بڑھتے گئے روپے پیسے کی ریل پیل سی ہوگئی، باقاعدہ ایک دفتر ہے، متعدد نصیبے، تنخواہ دار کارکن، ان میں بعضے جاں نثار بھی رئیس کی کوشش اور نام سے نئی بستیاں آباد ہوئیں، مہاجرین کی آر جار کا تار بندھا رہتا، جو بھی آتا کہا جاتا بس تم ڈٹے رہو، دریافت کرنے پر بتایا، اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ لوگ قابو میں نہیں آسکتے، لٹراد اور حکومت کرو یہ چال اب میری سمجھ میں آئی، بہاریوں نے رئیس امروہوی نگر میں کچھ ہلا گلا کیا، کچھ بتائے بغیر مجھے بھی ٹانک لیا، وہاں لوگوں کے تیور بدلے ہوئے، لیکن رئیس کے موالیوں نے آبادی کے مرکزی دفتر کا تالا توڑا اور قابض ہوگئے، میں سراسیمہ ہوا، آقائے یورش لاہوری کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، آقائے یورش نے بیچ بچاؤ بھی کرایا، رئیس کی اکڑفوں، طمانیت اور چہرے کی تمازت دیکھنے کی چیز تھی، کچھ گفتگو کچھ تقریریں ہوئیں تب یہ غبار صاف ہوا، آقائے یورش برملا کہتے رہے اگر ایک بھی ڈنڈا حضرت کے پڑ جاتا کل بابائے مہاجرین کی ٹھائی کی سرخی جم جاتی، خدا نے عزت رکھ لی، جشن ولادت ہو تو، موت واقع ہو تو، رئیس ضرور پہنچیں گے، جبھی تو میں نے کہا نا کہ وہ عملی آدمی ہیں،

پیپلز پارٹی کے دور اقتدار میں سندھی اردو آویزش نے عجیب رنگ اختیار

کر لیا، نفرتوں کا ایک سیلاب امڈ آیا، میں نے تو بہت کہا، زبان کسی کے بنائے سے بنتی اور بگاڑے سے بگڑتی نہیں، آپ کیوں جلسوں جلوسوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، سندھی اگر مجلس دستور ساز میں "لسانی بل" پیش کرنے کی حماقت کر رہے ہیں تو کیا ہوا، اردو تو قومی زبان ہے اور رابطے کی زبان، یہ بھی ہے جوابی کارروائی کا مطلب تو یہ ہوا آپ بھی ان سے پیچھے نہیں کہتے تھے یہ صرف زبان کی بات نہیں یہ ہم اردو بولنے والوں کے وجود اور پاکستان میں پانچویں قومیت کے تشخص کا معاملہ ہے۔ میں نے لقمہ دیا پانچویں نہیں چھٹی کہیئے، پانچواں سوار تو ہیں مظلوم بہاولپوری ہیں، فرمایا ہاں یہ تو ہے، تو جناب یہ ہے خالص اقتصادی اور معاشی مسئلہ، سندھی ہمارے رزق کے دروازے بند کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں، آئیے چلو اردو تحریک کے اجلاس میں، اب تک ہم نے تعمیر پاکستان کے لئے کام کیا تھا اب تخریب پاکستان دیکھو کس طرح ہوتی ہے، ایک اردو وفد صدر بھٹو کے حضور پیش ہوا، وہ کہانی غیر مطبوعہ پڑی ہوئی ہے یہاں مبارک اردو لائبریری میں، انداز بے حد جذباتی کہیں کہیں تصنع بھی ہے اور چند چیزیں زیب داستاں کا درجہ بھی رکھتی ہیں، اور ایک بات جو رہی جاتی ہے وہ یہ کہ ہمارا یہ رئیس الشعرا یہاں ایک عام قوم پرست نظر آتا ہے، اور عام گفتگو میں مسلح محاذ آرائی کی باتیں بھی کرنے لگا تھا، اسلحے کی پیشکش غالباً بلوچستان سے ہوئی تھی، وہ قوم پرست کیوں نہ ہوتا قومیت بھی آخر ایک چیز ہے، کسی کی غیرت یہ کیونکر گوارہ کر سکتی ہے کہ اسے قومیت کے فخر سے محروم کر دیا جائے، یہ روزنامچہ کتابت ہو چکا تھا، عالمی ڈائجسٹ پر حکومت کی قینچی لٹک رہی تھی، منصوبہ تو بن گیا تھا کچھ تو احمد ندیم قاسمی کے منع کرنے اور کچھ قید و بند کی صعوبتوں نے ڈرایا، کتاب چھپ نہ سکی، ایک رائے یہ بھی ہے تنہا سندھی بھی تعصب اور نفرت کا مبلغ نہیں، کوتاہیاں آپ سے بھی کم نہیں ہوئیں، تئیس برس سے زیادہ گذر گئے، مگر آپ ہیں کہ مقامی زبان کا ایک لفظ پڑھنا کیسا جانتے تک نہیں سندھیوں کو اردو سے پرخاش ہی کیا تھی، دکن دہلی لکھنؤ میں حبیب اردو کا طوطی

بول رہا تھا تب سرزمین سندھ میں بھی اردو میں فکرو سخن کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اتنی کہ ایک تذکرۃ الشعرا "سندھ میں اردو شاعری" کے نام سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے چھپوا کر عام کر دیا اردو سے سندھ کا ناتا تین سو سال کا احاطہ کرتا ہے،

زیادہ نہیں کم کھاتے ہیں، مگر ٹوٹتے ندیدوں کی طرح ہیں، چاروں پانچوں انگلیاں لتھڑی ہوئیں، بلکہ آستیں بھی شریک خوردو نوش شوربے میں لت پت، پیچھے دھرے رہ جاتے ہیں، ہر قاب میں ہاتھ ڈالیں گے، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، رکابیاں پکھ الٹیں گے، کچھ خراب کریں گے اور ہم ابھی دو چار نوالے ہی توڑنے پائیں گے کہ وہ حضرت یہ جاوہ جا، ان کے ساتھ بیٹھ کے کھانے میں اوّل تو کپڑے بچانا پڑتے ہیں، دوسرے ان کی طرف دیکھو تو گھن آتی ہے، پسینے پسینے وہ خود بھی ہو جاتے ہیں اور اس پر طرفہ یہ کہ برتن تمام گیلے میز گیلی۔ نان اور تنور کی روٹی نہیں بالکل گیلی آٹا چپاتیاں، میں نے اکثر دوا سمجھ کر وہاں کھانا کھایا لیکن یہ ہے کہ کھایا بہت، فاقہ مست کر بھی کیا سکتا ہے، جو کچھ خدا کھلائے جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا، غذا مرغن ہو، سادہ ہو، ایک خاص جذب و شوق سے تناول فرماتے ہیں، میٹھا نہ بھی ہو تو کتری ہوئی چھالیہ اور چنے ٹونگتے رہنے سے کام چل جاتا ہے، پان کھانے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں خوب جگالی کرتے ہیں، گھر میں پاندان ہے مگر پنواڑی سے پڑیا بندھوانے کا لطف کچھ اور ہے، تمباکو پھانکتے اور کھتے چونے کی کمی بیشی کو خاطر میں نہیں لاتے، کم ہے تو ٹھیک زیادہ ہو تب بھی درست، سگرٹ کیپٹن ہو گولڈ لیف ہو ڈن ہل ہو یکساں پیتے، نہیں کھاتے اور مزہ لیتے ہیں، احباب کی جیبوں کو بھی ٹٹولتے رہتے ہیں حقے کا تمباکو بھی عام ہی ہوتا ہے خاص نہیں،

کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر لکھنے کا انداز بھلا لگتا ہے، اس طرح کاغذ اور قلم دونوں پر گرفت مضبوط رہتی ہے، کاغذ اچھا استعمال کرتے ہیں حاشیہ جانے کیوں نہیں چھوڑتے اس میں قباحت یہ ہے کہ ان کے عطا کردہ مسودات جب میں کارخانہ محبوبیہ کے

جناب محبوب احمد قریشی کے حوالے کرتا ہوں تو جھنجھلاتے تو بہت ہیں مگر بپاس خاطر انہیں وہ بڑی خوبصورت جلدیں باندھ کر بھجواتے رہتے ہیں، یہ کام ادھار نقد ہر طرح چلے جاتا ہے، رئیس سے حسن ظن جلد ساز کو بھی تو ہے، مخطوطات کی تعداد پچاس سے آگے نکل چکی ہے ماشاء اللہ، اب وہ اکڑوں بیٹھنے کی ادا میز کرسی اور دفتری فضا کی کارفرمائی کی وجہ سے باقی نہیں رہی، میز پر خوب جھک کر بلکہ یہ کہیئے گر کر لکھتے ہیں، چشمہ تو ساٹھ برس کی عمر میں لگنا ہی تھا، ساٹھ کی رعایت سے ہونا تو کچھ اور چاہیئے لیکن یہ پاٹھے ہیں، رفتار و گفتار کا بانکپن جوں کا توں ہے آواز بلا کی کراری ہے اور جب وہ مشاعروں میں ایک وارفتگی اور اضطرار سے غزل خواں ہوتے ہیں تب تو اور نکھر جاتی ہے، یہ شرق ہے اور مشرق میں بھی پاکستان، یہاں رئیس جیسے شاعر کو بھی مقامی مشاعروں میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہیں تمسخر کا نشانہ نہ بن جائے، مصاحبین ہوں تو یہ معلوم ہو کوئی آیا، جونہی وہ پڑھنے کے لیے آئے شکیل عادل زادہ نے نعرہ مارا آہا رئیس امروہوی ماہر نفسیات، واہ واہ سبحان اللہ کا شور ہم نے بھی مچایا، مرض یہ بھی ہے منتخب نہیں جو چیز سامنے آگئی پڑھ دی سنا دی، سننے سنانے کی لپک بھی ان میں نہیں پائی جاتی،

فتوحات میں مرغ اور کبھی کبھار بٹیر آتے اور ہضم ہوتے رہتے ہیں، کبوتر بھی پال رکھے ہیں اور باجرے کی فرمائش چار چار سو میل دور بیٹھنے والوں سے بھی کی جاتی رہی ہیں، مرغ بازی کبوتر بازی بس کابکوں کی حد تک تو ہے ہاں ایک اور بازی کا بھی تھوڑا سا تجربہ ان کو ہے، جوش صاحب کا مقولہ ہے، فن کبوتر بازی فن دختر بازی سے افضل ہے، شکر ہے اس کی لت ہمارے شاعر کو نہ پڑی، گفتگوئیں تو تفاوت سن و سال کے باوجود اس موضوع پر بے تکان اب بھی ہوتی ہیں، بڑے بڑے محقق حضوری میں پائے جاتے ہیں، عبداللہ شمیم اور سویرا کے مدیر محمود بیش بیش، وقت گذاری اور گپ کے لیئے بہر حال کچھ ہونا تو چاہیئے، عنفوان شباب میں حجابی نامی ایک خاتون پر بہت فریفتہ ہوئے، مرزا داغ کی سنت میں یہ منی بائی

'INSHA'

MONTHLY

Tele : Office : 30897
Res : 37433

Editorial Board

1. Raees Amrohvi
2. Syed Mohd. Taqi
3. Joun Eliah
4. Shakeel Adilzada.

Karachi ۲۰ اکتوبر ۶۱ 1961

برادر عزیز من!

یہ تو نہیں کہ تم سے محبت نہیں مجھے
لیکن غم حیات سے فرصت نہیں ابھی

بھیا۔ نہ میں فراموش گزار ہوں نہ غیر مخلص — لیکن اس کا کیا علاج کہ آجکل تقریباً بارہ گھنٹے روزانہ میں بعض ایسی کتابوں کی تدوین و تالیف میں مصروف ہوں۔ جو ۱۵ نومبر کو [illegible] پیش کی جانی ہیں۔ صبح کے ناشتے کے بعد سے رات کے کھانے (افسوس کہ اور پینے کی توفیق نہیں — واہ جو چاہیں آدمی مال کمائیں؟) تک مسلسل قلم کا چکر — لیکن ابھی بعض کتابیں ہیں جنکی تکمیل درست [illegible] اندر ضروری ہے ناگزیر ہے — وادب — یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں اور تمام مشاغل اور دلچسپیاں تقریباً ختم کر دی گئی ہیں۔ ۲۷/۲۸ اکتوبر کو ملتان سے ادبی کانفرنس کی دعوت آئی تھی۔ بہت جی چاہتا تھا کہ تجارت کراچی سے کچھ دور اور ایسی جگہ جاؤں لیکن نہ ہوا۔ چنانچہ انکار کر دیا، [illegible] — اور بعض دوسری ادبیات تھے لیکن نہ جا سکا اور نہ جا سکوں گا۔ آج بہت عجلت میں [illegible]

98, New Cloth Market,
Bunder Road, Karachi-2

لکھے بارات ہے کیونکہ آپ کے دعوۂ سینے پر پہاڑ کی طرح دھرے ہوئے ہیں یہ تو پھر خیر آپ کی
پھر آپ کیا سوچتے رہیں گے؟ سب یار زندہ ہیں اور آپ کی خیریت پر اُم ... طالب
کا شکریہ کبھی آپ ادھر تشریف لا سکیں

سب باقی و ما بقی باقیست
اور ابنو محمد صاحب باقیست

مخلص

[illegible]

ابکر محمد جعفر ... ابن
... [illegible]

حجاب اب بھی پھیرے ڈالتی رہتی اور رئیس الملک سے وظیفہ پاتی ہیں، چند ایک اور پردہ نشینوں کے نام بھی ڈھونڈے سے نہیں آسانی سے نکل آئیں گے، پاکستان میں معروف معرکہ چند مقامی لوگوں سے رہا، ان کے لئے دربار سرکار میں بھی خلوص نیت سے جبہ سائی کی، پیمانِ وفا غالبًا یکطرفہ بندھے ورنہ یہ کیا بعید تھا کہ ایک نئی دنیا بسا لیتے، چلو اچھا ہوا بات ہاتھ پھیریوں پہ میگوئیوں اور چوما چاٹی سے آگے نہ بڑھی ورنہ یہ بڑھاپے کا عشق جان لیوا ہی ثابت ہوتا،

بیگم رئیس بڑے طنطنے کی بیگم ہیں، بیگمات کا تمام رکھ رکھاؤ اور سگھڑاپا ان میں موجود ہے، مزاج میں جلالی عنصر بھی کم نہیں، امروہہ کی لق و دق حویلیاں چھوڑ کر جیب کھارادر کے ڈربوں اور رمانک جی اسٹریٹ کے خاصے کشادہ مکان میں تینوں چاروں بھائی آ بسے تو یہاں عورتوں عورتوں میں بن کے ہی نہیں دی، بیگم رئیس کسی سے دب کے کیوں رہتیں، بچیوں کو لے کر پھر کھارادر میں ڈیرے ڈالے شکیل عادل زادہ ان کے ساتھ ساتھ، اولادِ نرینہ تو تھی نہیں، آخر مردوں میں سے کوئی تو ساتھ ہو، رئیس کے دوست کا بیٹا شکیل اپنا ہی بچہ تھا اسے ساتھ رکھا، یہ ہونہار اردو کالج بھی جاتا تھا، دس بیس روپوں پر مختلف گھروں میں جا کر بچوں کو پڑھاتا رہا، انشا اور اس کے بعد عالمی ڈائجسٹ کو بھی بڑی جانفشانی سے سینچا، پانچ بیٹیوں میں سے دو تو بیاہی جا چکی تھیں، تیسری سے شکیل منسوب ہونا چاہیئے رئیس بیوی کے ڈر سے گومگو میں پڑے ہوئے تھے، مجھ سے کہا تو میں نے کھانے کی میز پر ذکر چھیڑا، بیگم نے دو ٹوک جواب اپنے میاں کی طرف اشارہ کر کے یہ دیا کہ یہ دے دیں کسی "کسی چوڑے چمار" کو میں تو اپنی بیٹی نہیں دوں گی، رئیس دم دبائے اور دم سادھے بیٹھے رہے، بیگم نے اپنے ہی عزیزوں قریبوں میں سے ایک لائق نوجوان سے بیاہ دیا، برے تو شکیل بھی نہ تھے مگر یہ بہت اچھا ہوا، شکیل کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈانواں ڈول نہیں ہوتے، عالمی ڈائجسٹ چھوڑ سب رنگ نکالا آج یہ ماہنامہ پاکستان کا مقبول ترین ماہنامہ ہے، ایک ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں چھپتا،

پاکستان میں یہ اشاعت حیرت انگیز ہے، بیگم اور بچیوں کی کھارادر سے واپسی کا قصہ بھی اک طرفہ تماشے سے کم نہیں، مکان کو دو حصوں میں تقسیم کر بیچ میں دیوار کھنچوادی، یہ میری غیر حاضری غیر موجودگی میں ہوا، لیکن یہ حادثہ ابھی ہوا ہی تھا کہ میں بھی کراچی وارد ہوا، کشیدگی بے پناہ تھی، منہ پھولے ہوئے بول چال موقوف آنا جانا فقط اس تقسیم بلکہ بندر بانٹ پر تو تو میں میں بھی ہوئی، وہ تو ہونا تھی، ایک مدت پہلے تقی صاحب نے مجھ سے رئیس کی موجودگی میں بتایا، میرا بیٹا حیدر تو کہتا ہے اگر چچی نے میری امی کے بارے میں پھر کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں تو جوتیوں میں دال بٹنا کیسا جوتا چلاؤں گا اور ان کے سر پر، یہ تقی صاحب کو زیب تو نہ دیتا تھا بیٹے کا انداز فکر اپنے بزرگوں خصوصاً خواتین کے بارے میں یہ ہو اور تقی صاحب ٹھنڈے پیٹوں نہ صرف یہ کہ سن لیں، بلکہ دوسروں پر بھی رعب گانٹھیں، حیرت ہوئی تھی مجھے تو رئیس نے بھی سبھی کچھ بڑے تحمل سے سنا، رگِ حمیت نہ پھڑکی نہ وڑکی، چونکہ میری حیثیت گھر کے فرد کی ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں ہوں خواہ بڑے بڑے مسائل راز نہیں رکھے جاتے، دیوار چین دیکھ کر میں تو متوحش ہوا، ملاقاتی بٹے ہوئے کسی کی نظر میں بڑا اور کوئی چھوٹے بھائی کو مظلوم کہتا تھا، مفاہمت کے راستے مسدود کچھ تو بنائے جا چکے تھے اور کچھ دکھائی دیتے تھے، میں نے بیچ کا راستہ اختیار کیا کبھی ادھر جاؤں کبھی ادھر، کبھی اس کی سنوں تو کبھی اُس کی سنوں، میرے ممدوح رئیس تھے مگر تقی صاحب کا احترام بھی میرے دل میں کم نہیں ہے، تقی صاحب کی فلسفیانہ موشگافیاں اس سرد جنگ میں اور نکھر گئیں، ان کا موقف یہ تھا کہ ہم پڑھے لکھے لوگوں کا ایک مقصد حیات ہے، ہے نہیں تو ہونا چاہیئے، قرآن سے اپنے دلائل کو تقویت پہنچاتے اور کہتے میاں، ہمیں اتنی چھوٹی سی جائیداد اور اتنی چھوٹی باتوں پر تو نہیں لڑنا چاہیئے، یہ باتیں یہ حرکتیں ہمارے بس کا روگ کہاں ہیں یہ جاہلوں پر سجتی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے ہمیں لڑنا آتا ہی نہیں، رئیس شاکی تھے کہ گھر کا وہ حصہ جو تقی صاحب کے قبضے میں آیا، چونکہ پہلے میرے تصرف میں تھا وہاں میری

بہت سی چیزیں دبوچ اور دبالی گئیں، مثلاً تکیوں کے استنے غلاف اور جانے کیا کیا از قسم اگالدان پاندان وغیرہ، دل میں ان کے یہ بھی تھا بلکہ کہا بھی تم ادھر نہ جایا کرو، جب آؤ کچھ نہ کچھ پھل خشک میوہ لے کر آیا کرو تاکہ گھر میں یہ احساس ہو مجھ سے کوئی ملنے آیا، خالی ہاتھ تو میں بھی نہ گیا لیکن دوسری باتیں ان سنی کرتا رہا بے حد محتاط اور عقیدت آمیز لہجے میں لگائی بجھائی نہیں طرفین کو "لعن طعن" کرتا رہا کچھ اندر ہی اندر پشیمان بھی ہوئے وہ جو ایک بھرم کہتے ہیں وہ جاتا رہا، پردہ اٹھ گیا آنے جانے والوں نے جان لیا یہ دیو قامت تو بونے نکلے، ناچار دروازے کے نام سے ایک دراڑ نو تعمیر دیوار میں بالآخر ڈال ہی دی گئی، مردوں مردوں میں تو میل جول بحال ہو گیا، عورتوں سے خدا بچائے، کالی ہو گوری ہو، جاہل ہو افلاطون ہو، رہتی بہر حال عورت ہی ہے، یہاں بھی یہی ہوا، چھ سات برس تو ہو گئے، شادی بیاہ میں بھی ایک دوسرے کا منہ نہیں دیکھا گیا، تقی صاحب کی ارسطوئیت اور رئیس کی نفسیاتی مہارت دھری کی دھری رہ گئی، میں نے مکان کی تقسیم کو بندر بانٹ اس لئے کہا کہ یہ دو بڑوں میں بٹ گیا، چھوٹے سید محمد عباس اور جون ایلیا کے حصے میں کچھ نہ آیا، گمان یہ ہے کہ کھادار در پاکستان چوک کے چوبارے دے کر رام کر لیا،

رئیس نے اپنے حصے کا مکان سجا بنا لیا تو ان کی دیکھا دیکھی تقی صاحب کے ہاں بھی توڑ پھوڑ شروع ہوئی، مکان کے پچھواڑے چند سندھی چھپر ڈالے برسوں سے پڑے تھے نیا ناک نقشہ ظاہر ہے توسیع طلب اور وسیع القلب نکلا، سندھی دھوبیوں کی اب وہ پہلی سی حالت بھی نہیں رہی تھی، خاصے متمول تو نہیں پھر بھی کمی کسی چیز کی نہیں دیکھی گئی، ظاہر وہ جھونپڑی نشین ہی تھے، اخلاقاً معاوضہ دے کر وہ قطعہ زمین تقی صاحب نے خالی کرانا چاہا، مہینوں کی دوستانہ گزارش بے کار گئی اب مصلحت زور زبردستی میں نظر آئی، کاریگروں نے پرانی دیواریں ڈھانا اور پتھر لڑھکانا شروع کئے، واویلا مچ گیا، ہائے مر گئے ہائے لٹ گئے، بھائی نے بھائی کو چار تنومند مصاحبوں کی کمک نہ بھیجی، اکثریت کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اقلیت

کو بھاگتے ہی بنی، خاموش تماشائی میں بھی تھا، پیپلز پارٹی کے حامیوں اور سوشلزم کے پرچارکوں کے قول وفعل کا تضاد دیکھ بھی لیا،

امروہوی صاحب خوب دیکھ بھال کر پاؤں پھیلاتے ہیں، آگا پیچھا دیکھ کر چلنے والوں میں سے ایک ہیں، اپنے قابو میں رہتے ہیں، روپے پیسے کی بڑی قدر ہے حساب کتاب لکھنے کی عادت نئی نہیں پرانی ہے، سال بھر کی آمد ورفعت کا تجزیہ وقت نظر سے کرتے ہیں، آمدنی کے ذرائع میں اضافے کے منصوبے بناتے اور متعین کردہ راستے سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے، پس انداز کرنے کے فن میں کورے نہیں مشاق ہیں پانچ بیٹیوں کو بڑی شان اور پورے لوازمات کے ساتھ رخصت کیا، جہیز میں کوئی کمی نہ چھوڑی، باراتیوں کے استقبال اور کھانے ٹھاٹ کے ہوئے، چیدہ اور معزز شہریوں کو بلایا، اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو فرض جان کر نباہتے ہیں، یہ چھوٹی نہیں بڑی بات ہے، دامادوں کی دامے درمے سخنے ہر طرح مدد کی، آڑے وقت میں ارباب اقتدار و اختیار پر اثرانداز ہونے کی تگ ودو کرتے ہیں حکومت وقت کی نظر میں ناپسندیدہ حرکتوں کی پاداش میں جب بھی سبط اختر جیل گئے، نوکری سے نکالے گئے، ہر مرحلے پر رئیس ہمدم ودمساز رہے، بیٹی نواسے نواسیوں، نواسوں کے دادا دادی سبھی کو اپنے گھر میں پناہ بھی دی پرورش بھی کی، بلاوے پر میں بھی ایک ایسی ہی تقریب سعید میں شریک ہوا، بیٹی سسرال سدھاری حالانکہ رات کے بارہ بج چکے تھے، غم غلط کرنے کے لئے بوتل اور گلاس زیادہ دور نہ تھے، روتے جاتے تھے اور کہتے تھے آخر ہم کب تک دیئے جائیں گے، ہمارے گھر میں بھی کسی کو آنا ہوگا۔ جون کی شادی کرنا پڑے گی جون نے شادی اپنی پسند زاہدہ حنا سے کی اور رئیس نے مجھے چبھتے ہوئے لفظوں میں لکھا لڑکی جہیز میں اور تو کچھ نہیں لائی کتابیں ہی کتابیں ہیں اس پر ہماری کئی غلطوں میں نوک جھونک رہی دولہا دلہن دس مربع فٹ کی کوٹھڑی میں کب تک رہتے، جون سسرال منتقل ہو گئے یہ بھی خوب ہوا کمرہ نہ سہی وہ کوٹھڑی خالی تو ہوئی،

کتابیں جمع کرنے کا شوق بالکل نہیں ہے، پڑھنے کی دھت پرانی ہے،

اتنا بڑا نیم کا پیڑ گھر میں ہے تو جھولا بھی چھوٹا کیوں ہو، کھری چارپائی ایک زمانے میں لٹکی رہتی تھی، جھولتے اونگھتے اور پڑھتے رہتے، اپنے موضوع اپنی پسند کی کتابیں تاے میں رکھتے اور استفادے کے بعد اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہیں، بڑا حصہ میرے کتب خانے "مبارک اردو لائبریری" کے لیے بھجوایا جاتا ہے، ہر کتاب رسالے پر ضرور دستخط کرتے ہیں، کراچی کے کتب خانوں کے رکن اور خود جاکر کتابیں لاتے ہیں کتب خانے کی امانت میں کوشش یہ کرتے ہیں خیانت نہ ہو، کوئی لے نہ اڑے انگریزی اردو فارسی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں، انگریزی بولی نہیں جاتی، پڑھتے اور سمجھتے خوب ہیں، ایک انگریزی فلم "لارنس آف عربیا" میں لے جا کر دکھائی، اس میں عورت نام کی کوئی چیز نہ تھی، وقفہ ہوتے ہی گردن گھما گھما کر حسین چہرے تلاش کرنے میں انہیں ناکامی نہیں ہوئی، لوگ کتابیں تبصرے کے لئے بھیجتے ہیں یہ تعارف کافی سمجھتے ہیں، تنقید وہ نہ لکھ سکتے ہیں نہ کر سکتے ہیں، وہ تو بس ہر ایک کا دل رکھنے والی بات کرتے ہیں، کیسی ہی بے جان غزل ہو مہمل مضمون ہو یہی کہیں گے بہت اچھی غزل ہے بہت اچھا مضمون ہے، حوصلہ افزائی ان کے خمیر میں ہے، اس سے رہنمائی کا حق ادا نہیں ہوتا نہ ہو، رئیس کو غرض نہ واسطہ، نقصان یہ ہوتا ہے ہم بانس پر چڑھ جاتے ہیں خواہ مخواہ، میں نے مشاہیر کے چند خطوط اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ "نوازش نامے" کے عنوان سے انور عارف نے ساتھ دیا تو چھپوا لیے تھے، نسخہ اوّل پیش ہوتے ہی فرمایا، اب یہ حق ہے کہ آپ کی پیشانی چوم لی جائے اور سچ مچ چوم بھی لی، یہ ان کی بزرگانہ شفقت اور دوستانہ مروت ہی تو تھی، بابائے اردو مشہور مقدمہ باز تھے، رئیس نے مقدمہ نگاری سے بھی ہاتھ کو نہیں روکا، رسمی سرسری اور تعریفی مقدمے بالکل ٹھس کتابوں پر کثرت سے لکھے، مداحانہ شان تو پائی جاتی ہے محققانہ آن بان نہیں،

شاعروں ادیبوں سیاست کاروں سے ملنے ملانے اور کھل کھیلنے میں میں خاصا جھینپو تھا بھی اور شائد یہ کمزوری ہنوز باقی ہے، میرے اس احساس کمتری کو

رئیس نے پہلی ہی ملاقات میں ختم کر دیا، حضرت کی سرکردگی میں تینوں بھائیوں نے اس طرح ہاتھوں ہاتھ بڑی عزت اور احترام اور اپنائیت سے لیا جیسے میں کوئی اہم شخصیت ہوں، اس میں تصنع بالکل نہ تھا، چار سو میل سے آنے والے خوشہ چیں کے خلوص اور وفا پیشگی کا بھرم رکھنا کوئی ان سے سیکھے، میرا گنوار پن اور جہالت قطعاً آڑے نہیں آئے، بے تکلف دنیا بھر کی باتیں سنتے سناتے رہے، ہمارے "اعزاز" میں شاندار دعوت کا اہتمام بھی کیا گیا، ملاقاتیں بڑھیں اعتماد بڑھا تو لے جا کر بیوی بچوں میں بٹھایا اور گھر کا ایک فرد بنالیا، مجھے آگے بڑھانے میں خاص دلچسپی بھی لی، نشر واشاعت کے منصوبے میں مجھے رفیق کار اور برابر کا حصہ دار بنایا، پیر حسام الدین راشدی سے کہہ سن کر دو قلمی نسخے اچھے داموں پر دار الآثار کے لئے خرید وائے چوک ان سے یہ ہوئی کہ روپیہ میرے کھاتے میں جمع کرایا اور وہ میں نے چرا چرا کر ضائع کر دیا، کام میں خلل پڑ گیا، ملول تو وہ بہت ہوئے، مگر یہ ان کا حوصلہ تھا میری بے اعتدالیوں اور عاشقانہ وارفتگی کو میری معصومیت اور ناداتی جان کر درگذر سے کام لیا، تھوڑے سے وقفے سے ہاتھ پاؤں مار کر وہ بلا شرکت غیرے کامیاب تاجر کتب بن گئے اور ہم وہیں کے وہیں رہے، مجھ سے تعلق خاطر بلا مبالغہ بے پناہ ہے وہ دوستی کے رشتے کو خون کے رشتے میں بدل دینے اور میرے بیٹے کو اپنی بزرگی میں لینے کے لئے ہمہ تن تیار تھے، مگر یہاں مشکل یہ آپڑی کہ گھر کے رشتے پہلے سے طے ہو چکے تھے، رئیس میری باتوں کو تو ٹال جاتے ہیں مگر سنتے پوری توجہ سے ہیں، میں بھی جلی کٹی سب سنا دیتا ہوں، اٹھارہ برس ہو گئے بقول غالبؒ اس عمر کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، نئے دوست نہ وہ پیدا کر سکتے ہیں نہ میں، یوں ملنے ملانے والوں کی کمی کیا ہے لیکن دل کی باتیں ہر ایک سے نہ کہی جاتی ہیں نہ کوئی سمجھ پائے گا، بقول حیرت شملوی

ہر کسی کی سمجھ میں آ جائیں
دل کے ایسے معاملات نہیں

یاد آیا حیرت شملوی خاصے معروف شاعر، چھوٹی بحر میں غزل کا رنگ استادانہ، زبان کی سادگی اور بندش کی چستی وصف خاص تھا، جلیل قدوائی تو کہتے ہیں غزل حیرت کہتے ہیں ہم تو جھک مارتے ہیں، امتیاز علی عرشی نے پوری بیاض پڑھ کر لکھا آپ موجودہ دور کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں، حیرت پر دہلی میں فالج کا حملہ ہوا، چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، ان کے دفتری دوست اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے، سرکاری خدمات سے قبل از وقت علیحدگی کا صلہ سوا سو روپلی، شاعرانہ بزم آرائیوں اور عام مجلسی زندگی سے کٹ کر مرنے کے لئے ایک دو نہیں پانچ دس کہاں پورے بیس برس جینا پڑا ساٹھ برس سے زیادہ عمر پائی، پاکستان منتقل ہوئے تھے وہ باسٹھ عیسوی میں پرانے دوستوں نے درگاہ عبداللہ شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک کرادیا تھا لنگر سے کھانا اور یونہی سا وظیفہ بھی پانے لگے، بارہا میں نے کوشش رئیس کو کو حجرۂ حیرت میں لے جانے کی کرڈالی تاکہ دیکھ بھی لیں سن بھی لیں، مقصود اصلی ایک فریش اور صاحب فکرونظر شخص اور شاعر کی دلداری بھی تھا، ہاں ہوں کر کے کل پرسوں کل پرسوں کرتے رہے، وہ جو بات بات پر کیا، ادھر کسی کی ہوا کھسکی اور یہاں شعر ہو گیا، حیرت شملوی مرے تو میرے تیہرتے ہم لاکھ سر پھوڑا کئے قطعہ لکھ کے نہ دینا تھا نہ دیا اور مجھے انسانیت کی ناقدر شناسی پر نہیں صاحب سلامت کی ناقدری پر بھی ماتم کرنا پڑا، ایک خو حضرت کی یہ بھی ہے، ملا واحدی سے بھی یک گونہ اجتناب ہی رہا، گھسیٹ لے جانے کی جدوجہد بھی بار آور نہ ہوئی، ہاں کوثر دہلوی کے ہاں زبردستی حلیم کھانے پہنچ گئے، ستم ظریفی یہ ہوئی وہ اپنی مجذوبیت اور ماتمی جھمیلوں میں ٹیلیفونی وعدہ بھول بھال گئے اور ہمیں ان کی بیوی کا قطعہ تاریخ وفات لکھنے کا صلہ پاؤ بھر حلیم بھی نہ ملا۔

عام طور پر رئیس کا اپنے ہمعصروں سے معاملہ چشمک کا نہیں الفت و مروت کا ہے، مولانا ماہر القادری مر گئے، اللہ جنت نصیب کرے جماعت اسلامی

اور مولانا مودودی کے والا و شیدا تو تھے ہی، ایک صاحبِ طرز ادیب شاعر اور نقاد بھی تھے، زبان اور اس کی نزاکتوں کا بڑا خیال اور بے حد پاس لحاظ تھا، ان کا وجدان ایک آبگینہ بن کر رہ گیا تھا، خفیف سی کھٹک پر تلملا اٹھتے، تحقیق اور تفتیش کا حق کیا ادا کرتے بالکل وہ جو کہتے ہیں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے، یہ روش اب عام نہیں متروک ہو چلی ہے، اس لگن اور مزاج کے آدمی سرمایہ ہوتے ہیں ملک و قوم کا، ہاں تو مولانا کو بیٹھے بٹھائے مجدد بننے کی سوجھی، لفظ "مواد" سے کیڑے نکلتے پیپ ابلتی اور بدبو پھیلتی ہوئی پا گئے، مواد جیسے وسیع الظرف لفظ کو ہٹا ہٹو "لوازمہ" رکھ مشتہر کر دیا، رئیس نے اپنے ہفتہ واری کالموں میں اس کی بھرپور حمایت کی، میں نے لکھا یہ کیا کر رہے ہیں آپ، جواب آیا، بھئی مولانا ہمارے یار ہیں ہم تو ان کی تائید ہی کریں گے، ماہر صاحب اس ایجاد بندہ پر بہت خوش نظر آتے تھے، اتفاقاً مجھے یہ ترکیب مولوی عبدالحق کے ہاں مل گئی، اس توارد کی اطلاع میں نے دی تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اور اسے دبا بھی لیا، "فاران" وغیرہ میں ذکر تک نہ کیا، جہاں مولوی صاحب نے مات کھائی وہاں مولانا کیا تیر مارتے،

قد کاٹھ کے لحاظ سے رئیس کا شمار لکھنؤ کے بانکوں میں ہونا چاہیئے، کچھ تو عمر کا تقاضا بھی ہے، اب تو وہ سوکھے سڑوں میں گنے جا سکتے ہیں، تاہم جسم خاصا چھریرا ہے کھڑی ستواں ناک، جسے خطرناک نہیں کہا جائے گا، بھورے بال بھوری روشن آنکھیں، نگاہوں کے تیور تند اور تیز، دہانہ نہ تنگ نہ کھلا ہوا مناسب اور معقول، باچھیں کھلی ہوئی نہیں بلکہ تیر اور کمان کا سنگم ہے، بیک مصنوعی دانت اترے ہوئے ہوں تب تو بہ بھی نکلے دیتے نہیں، پتلے پتلے ہونٹ، عورت ہوتے تو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہہ میر دے ہی چکے ہیں، سامنے کے اوپر کے دانت تو سلامت ہیں نیچے کے کچھ نکلوا دیئے کچھ بنوا لیئے، کسی نیم حکیم کا مشورہ تھا ورنہ بچنے کو بچ بھی سکتے تھے، بحیثیت مجموعی چہرے کی لمبان چوڑان ایسی

بڑی نہیں، گردن خاصی لمبی ہے، نقوش میں عمر کے ساتھ ساتھ وہ تیکھا پن اب نہیں رہا دھیما پڑ چکا ہے، ایک تصویر میں نے محفوظ کر رکھی ہے برطانوی فلم ایکٹر ڈکٹر میچور کی چھب کیسی یوں لگتا ہے نقل مطابق اصل ہے، رنگت سرخی مائل ہے، بیگم صاحبہ کا کہنا یہ ہے جب پہلی بار میں نے دیکھا تو یوں جانا جیسے چاند نکل آیا ہو، ہزار حیف اب یہ چاند گہنا سا گیا ہے، کچھ داغ دھبے بھی نمایاں ہو چلے ہیں، گرمی ہو سردی ہو اچکن ضرور پہنیں گے، میرے سامنے تو کراچی کے سب سے اچھے درزی نذیر مرحوم سے تین تین سو روپے سلائی دے کر سلواتے رہے کالے رنگ کو ترجیح دی جاتی ہے، کرتے میں نے بھی کڑھوا کر بھیجے، خود بھی کڑھے ہوئے کرتے کبھی کبھی خرید بھی لیتے ہیں، جوتے ہلکے پھلکے پسند کئے جاتے ہیں، بہاولپوری کھسے زری اور چاندی کے کام کئے ہوئے متعدد میں نے پیش کئے، خوب شوق سے جھمکاتے ہوئے جوتے چلے، ایک بار خوش ہو کر لکھا، کیسا خوبصورت جوتا رسید کیا ہے، گھر میں عام طور پر لیریاں ہی گھسیٹتے پھرتے ہیں، بالکل لاابالی، ناخن ہاتھوں کے پاؤں کے بڑھے ہوئے، میل بھرا ہوا، راہ چلتے حجاموں سے کٹوا لئے، کبھی خلیفہ گھر پہ بھی بلا لئے گئے، اب تو چندیا صاف ہو چلی ہے، پہلے تو خوب بالوں سے بھرا ہوا سر تھا اور وہ بالکل سیدھا سپاٹ الٹے لیا کرتے ہیں، پتلون کوٹ ٹائی سے بھی شوق فرمایا گیا، مگر زیادہ چل نہ سکے، مزاج ناساز ہو تو اترے ہوئے چہرے کی جھریاں خوب نمایاں ہو کر ابھر بھی آتی ہیں، اس حالت میں تصویر اتری تو خاصی ہیبت ناک ہی نکلی، داڑھی مونچھوں کے جھنجھٹ میں کبھی نہیں پڑے، ٹوٹا پھوٹا برش، گھٹیا ڈنڈا مارکہ صابن، شکستہ آئینہ، غلیظ ربڑ کی پیالی میں پانی ڈال لئے سیدھے ہاتھ مار روزانہ تو نہیں ایک دن چھوڑ کر ضرور یہ مونڈن ہوتا ہے، طرح طرح کے منجن اور کوئلہ وغیرہ دانتوں پر گھسا جاتا ہے، بیت الخلا میں پانچ سیر کا لوٹا لے کر نہ جائیں تو حق طہارت ادا نہیں ہوتا، بواسیر کے مریض بھی تو ہیں، ویسے وہ بیمار بہت کم پڑا کرتے ہیں، جنسی وظیفہ وہ

اس بڑھاپے میں بھی ادا کرتے ہیں، صاحب وہ بوڑھے لگتے تھوڑے بہت ضرور ہیں مگر اس کاٹھی کے لوگ ساٹھ برس کی عمر میں بوڑھے ہوتے نہیں، وہ جوانوں میں نہایت لذت انگیز گفتگو کرتے اور رفیع احمد خاں کے رنگ میں فحش اور عریاں اشعار فی البدیہہ کہا کرتے ہیں، افسوس یہ ذخیرہ بیاض سے یہاں نقل نہیں ہو سکتا، مجھ میں تو ہمت ہے ایسا کر گزروں آپ کے ظرف و نظر کے آبگینے کو ٹھیس نہ لگ جائے کہیں، بوڑھوں میں خوب مہذب بن جاتے ہیں، بچوں سے پیار تو کرتے ہیں مگر جسے ٹوٹ کر کہنا چاہیئے وہ نہیں، اولاد نرینہ کی کمی کو جان کا عذاب کبھی نہیں جانا نہ بنایا، چلتے بہت تیز ہیں، مجھے تو اپنی عام رفتار کو بھاگنے کے قریب تک بڑھانا پڑتا تھا، لمبے لمبے ڈگ بھرنا ان کا معمول ہے،

طاہر صلاح الدین کی عمر ہی کیا تھی ابھی کوئی بائیس پچیس برس، اس چھوٹی سی زندگی میں نشیب زیادہ فراز کم اس کا مقدر رہے، وہ تھا بھی تو مست الست لاابالی، اس پر عاشقانہ دیوانگی اور جنون، وہ اپنے آپ میں بھی بہت زیادہ نہیں رہتا تھا، اس کے باوجود نہایت خلیق اور نستعلیق کھویا کھویا، بجھا بجھا سا ایک البیلا نوجوان شاعر ڈیرہ اسماعیل خاں میں پیدا ہوا، لاہور کہ گہوارۂ بزرگانِ عشق مجازی و حقیقی ہے، یہاں دل پر پہلی اور آخری چوٹ پڑی، شہر سے نکل راہ جنگل کی لی، احساسات واردات قلبی مادری زبان سرائیکی نہیں اردو کے سانچے میں از خود ڈھلنا شروع ہوئے، شورش باطنی پر قابو پانا ایسا آسان تو نہیں تاہم اک ذرا سانس میں سانس سمائی تو کسی کامل کا دامن تھامنے کا خیال کیسے نہ آتا، نظر انتخاب رئیس صاحب پر پڑی مشورۂ سخن و شعر کے علاوہ اصلاح نفس و حال پر بھی راز دارانہ مراسلت رہی، اصلاح کلام کر تو وہ خاطر میں نہ لایا قیس نوازی کو دیکھ کر مرید ہو گیا، وطن کو خیر باد کہہ رئیس کے گھر کو اپنا گھر بنا لیا، مزاج شناس ہو کر دخیل بھی ہوا، طاہر صلاح الدین کی سعادت مندی اور خدمت گذاری کو دیکھ کر اگلے وقتوں کے استاد شاگردوں کے رشتے ناطے یاد آنے لگے، دن

بھر جلیبیں بھرنا، چائے اور دیگر فواکہات پلیٹ کرنا، کاغذات سنبھالنا، بازار سے سودا سلف لانا، باورچی خانے سے لے کر دفتری کاروبار میں ہمہ تن منہمک رہتا رئیس بھی غضب کے جری ہیں، جان چلے تھے کہ یہ چوٹ کھایا ہوا انسان پھیپھڑے دونوں کے دونوں مجروح لئے پھرتا ہے، خون جگر کھاتا اور تھوکتا ہے کیا مجال حضرت کی جبیں شکن آلود ہوئی ہو، ہر وقت کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا کوئی کراہت نہیں کوئی گھن کسی طرح کا پرہیز نہیں، بڑے بڑے ڈاکٹروں سے نسخے تجویز کرائے ایک سے ایک بڑھیا دوا اپنی گرہ سے خرید کر دی، مرض اور بد پرہیزیاں ضرورت سے زیادہ بڑھیں تو کہہ سن کر اوجھا سینی ٹوریم میں داخل کرادیا، وہاں کے لوگوں کو خط لکھے فون کئے خود گئے بھی، طاہر بار بار ہسپتال چھوڑ دیتے، یہ بہلا پھسلا کر پھر وہاں بھجواتے، یہ آکر چار ڈیڑھ برس چلی، لیکن مرض بڑھتا گیا اور جان لے کر ٹلا، طاہر صلاح الدین کے مرنے کی خبر رئیس کو غمزدہ اور آبدیدہ کر گئی، رئیس اپنے متعلقین کے علاوہ پرانے کارکنوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، دکھی لوگوں کے لئے جیب ہلکی کرنے سے زیادہ نہیں کتراتے، کماتے بھی تو بس یہی پانچ ہزار روپے ماہانہ ہیں، کیا نہائیں اور کیا نچوڑیں،

مانا کہ تندروبرق نہیں، شعلہ وسیماب نہیں، سیماب وش ضرور ہیں، ایک اضطراری کیفیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب گھر میں ملنے جلنے والوں کا تھوڑا سا بھی اضافہ ہوجائے عوامی ہو گئے ہیں اس لئے نئے اور "اوچھے" درجے کے ملاقاتیوں سے اور گھبراتے ہیں، کیاریوں میں پانی اور کبوتروں کو دانہ ڈالیں گے، کبھی میز پر جاکر چند سطریں لکھیں گے، حقے کے کش بے تحاشا، بلا وجہ ٹہلنا بیقراری سی دوڑ جاتی ہے، ہاں نقی صاحب کے ہاں شام کی نشست میں بیٹھ بھی جاتے ہیں، ملکی عالمی معاملات سیاسیات پر بے تحاشا گفتگو کے قائل نہیں ہاں ایک رائے ضرور ہے، اپنی رائے رکھتے ہیں، بولتے کم سنتے زیادہ ہیں، گپ ہانکنا ہو تو خوب چہکیں گے، بے ضرر جھوٹ ہزاروں بولے ہوں گے، سفارش مطلوب تھی

آج نہیں کل چلیں گے یار، وعدہ رہا، دوسری صبح جونہی میں نے صحن میں قدم رکھا جلدی جلدی کمبل اوڑھ بجڑا بجانے لگے، گویا سردی کا بخار چڑھ رہا ہے، بھانپ بھی چکا تھا دیکھ بھی لیا تھا، یہی کہا کوئی ہرج نہیں پھر کبھی دیکھا جائے گا، فوراً کھل اٹھے اور اپنے مطلب کی باتیں کرنے بیٹھ گئے، یہ تک بھول گئے ایک حیلہ ابھی تراشا تھا، اُس کا بھرم بھی رکھنا چاہیئے، نہیں نہیں وہ بڑے دلیر ہیں، ایسی باتوں کو نہیں پوچھتے، سفارش سرسری کرنے میں حاتم ہیں، جتنے چاہے خط لکھوا لیجئے، سوچے سمجھے پوچھے بغیر گھسیٹ ڈالیں گے، معاملہ اگر واقعی سنجیدہ اور سخت ہے تو یہاں ہمیں رئیس کے وجود کی نفی کرنا پڑے گی، بارہا جھگڑ چکا ہوں، ہم یہ کہتے ہیں اکثر و بیشتر ایسے کاموں ہی کے لئے کوئی سفارش طلب ہوتا ہے، سیدھا سا کام ہو تو وہ دیر سویر از خود بھی ہو جایا کرتا ہے، اور جہاں یاری دوستی کا پیچ ہو وہاں تو یہ دیکھنا بھی نہیں چاہیئے یار ہمارا اچھا ہے بُرا ہے کیا ہے، ہمیں تو بھرپور تعاون اور سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے ہمارا زورِ تقریر، چٹکیوں میں اڑانا وہ خوب جانتے ہیں، خطوں میں لمبی چوڑی دلیلیں دیں گے، یہ ثابت کر کے رہیں گے، ان کی تو کوئی سنتا ہی نہیں، میاں میں کیا ہوں، کچھ بھی تو نہیں، مزے کی بات یہ ہے کہ چند مخصوص لوگوں کے لئے میرے سامنے چل کر گئے اور حکومتِ وقت سے روپے پیسے قطعاتِ اراضی وغیرہ سے مالا مال کر آئے، میں احسان فراموش کیوں بنوں، زرعی ترقیاتی بنک کے صدر کے ایس اسلام سے مجھے ساتھ لے جا کر ملے اور یکمشت وصول کئے جانے والے قرض کو اقساط میں بدلوا دیا، اور میں رسوائی سے بچ گیا، اس لطفِ خاص کا شکر کس منہ سے ادا کیجئے،

مصطفٰے جتوئی وزیر اعلیٰ سندھ نے انجمن ساداتِ امروہہ کی عمارت وغیرہ کی تعمیر اور توسیع کے لئے کچھ سلوک کر دیا تھا تاہم پیش پیش تو یہی لوگ تھے، جتوئی سنگِ بنیاد رکھنے آئے یا ایسی ہی افتتاحی کوئی تقریب تھی، فرمایا! یہ آپ حضرات نے امروہہ امروہہ کا ڈھول کیوں لٹکا رکھا ہے، سب بھول جائیے، اب آپ محض سندھی ہیں، خاصا رگید رگاد کر جب وہ رخصت ہونے لگے تو رئیس نتھی کہ

ملاقات کا وقت دیا جائے، سننے والوں نے سن لیا، برا بھی مانا اور سمجھا گیا، لیکن قبلہ گاہی نے وہیں کے وہیں یہ کہہ کر اپنی ہوا باندھ بھی لی، یار دیکھو جتوئی صاحب فرماتے ہیں مجھ سے ملو، وقت دو، چند ضروری امور پر گفتگو کریں گے آپ سے، جتوئی کی لتاڑ پھٹکار پر سادات امروہہ خاصے برہم تھے، سید محمد تقی نے تو جہاں جتوئی بولے تھے وہاں کھڑے ہو کر قرض چکایا، رئیس کا موقف یہ تھا کہ کام لو گے تو گالیاں تو بہر حال کھانا پڑیں گی،

تمام عمر مخالف بنچوں پر بیٹھے گذر گئی، ایوب خانی فوجی حکومت پر خوب کس کر تنقیدیں کرتے رہے، عنانِ اقتدار سنبھالے ہوئے دو ہی مہینے گزرنے پائے تھے، جرأت رندانہ دیکھیے،

بڑی مشکل سے روحِ حریت کی پرورش کی ہے
دعا یہ کر کہ روحِ حریت غارت نہ ہو جائے

ہمیں پابندیاں منظور ہیں لیکن یہ خطرہ ہے
غلامی کی کہیں اس قوم کو عادت نہ پڑ جائے

اس حق گوئی اور بیباکی کا صلہ کیا ملتا، الٹا یہ ہوا کہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں سب سے اچھے اور مقبول جنگی نغمے لکھنے والے رئیس امروہوی کی پذیرائی تو نہ ہوئی، ان کے یہ ترانے گانے والے مہدی حسن اعزاز واکرام کے سزاوار بھی ٹھہرے اور تمغہ حسن کارکردگی بھی پایا، شورش کاشمیری نے خوب لکھا ہے، رئیس جو کچھ بزبانِ شعر کہتے ہیں ارباب اقتدار کی رسائی اگر بات کی روح تک ممکن ہو جائے تو منہ موتیوں سے بھرا جائے یا دار پر کھینچ دیئے جائیں، رئیس کا سابقہ ظاہر ہے دوسری صورت سے پڑا،

مسلم لیگ کو لیگیوں نے دفن کر دیا، اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے پاکستان میں قرآنی ضابطہ حیات کیوں جاری وساری نہ ہو سکا، اس میں ہمارا آپ کا حصہ کم، کیا دھرا سبھی کچھ علماء کرام کا ہے، مدرسوں خانقاہوں مسجدوں اور حجروں

کی جان یہی لوگ رہے، میدان عمل میں جادہ پیمائی غیر کا حصہ بن گئی، یہ طبقہ تھا انگریز کا پروردہ اور سدھایا ہوا انگریز کی نقالی ورثہ تھا ان کا اور ہے بھی، حالات اور خصوصاً زاویہ فکر و نظر کچھ سے کچھ ہو کر بات بڑھتے بڑھتے انتخابات اور لامذہبیت تک پہنچی، لوگ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے لگاتے ہوئے "سوشلزم" کی آغوش میں جا پڑے، پیپلز پارٹی اس کی نقیب، رئیس بھی اس کے حامی کھل کر ڈٹ کر بھٹو صاحب کی حمایت کی، پارٹی ٹکٹ کو جنت کا ٹکٹ کہتے تھے، آنے جانے والوں سے اس کی تائید کا تقاضا اور فتح و نصرت کی دعا کرتے، بھٹو صاحب کے جیتنے کا سان گمان بھی کسے تھا، بھلا ہو مُلاؤں کا آپس میں خوب لڑے اور جمہوریت کی مرغی حرام ہو کر رہی شاعر کا جوش و خروش تو دیکھئے،

نجانے حشر کیا ہو سکہ زر کے پجاری کا
تماشا ختم ہونے کو ہے دولت کے مداری کا
بنا تا ہے قرینہ فاقہ کش مزدور ہاری کا
یہ سالِ آخری ہے ملک میں سرمایہ داری کا

تاریخ چاہتی ہے یہی مان لیجئے ۔۔۔ تا خیر ہے فضول ابھی مان لیجئے
فاتح ہے ذوالفقار علی مان لیجئے ۔۔۔ پیپلز پارٹی ہے قوی مان لیجئے

انتخابات بھی اپنی وضع کے ایک ہی ہوئے تھے، سبھی خوش ہوئے، بے ساختہ لکھتے ہیں

حوادث کے رُخ کو پلٹ کر ہوئے ۔۔۔ پرانے طریقوں سے ہٹ کر ہوئے
نہ گھُٹ کر ہوئے نہ گھٹ کر ہوئے ۔۔۔ الیکشن ہوئے اور ڈٹ کر ہوئے

مغرب میں تینتیس (۳۳) فیصد حمایت حاصل کر کے پیپلز پارٹی اکثریت بن کر سامنے آئی، مشرق سے شیخ مجیب الرحمٰن پورے جاہ و جلال کے ساتھ طلوع ہوئے، یہاں دل میں چور پہلے سے تھا، انتقال اقتدار میں روڑے اٹکائے گئے کھلم کھلا اُدھر تم اِدھر ہم کے نعرے بلند ہوئے، ہاں میں ہاں یہاں سے بھی ملائی گئی،

اسیٹ پاکستانیوں کو انتقال اقتدار　　ولیٹ پاکستان والے ہیں سراپا انتظار
چیختے ہیں بعض ارباب قیادت بار بار　　لافتیٰ اِلا "علی" لاسیف اِلا "ذوالفقار"

بالآخر ملک کے حصے بخرے کر کے اقلیت یہاں غیر قانونی طور پر حکمران بن بیٹھی، کام کے کام ان سے کیا ہوتے، جاگیردار آگے آگئے تھے، تمام عقیدت اور محبت کے باوجود رئیس نے جہاں جہاں کوتاہیاں ہوئیں آڑے ہاتھوں یوں اس طرح لیا،

پیپلپز پارٹی نے کیے تھے جو قوم سے　　وہ عہد کچھ دفانہ کیے کچھ دفا کیے
دو گز زمین قبر تھی جس کے نصیب میں　　اس نیم جاں کو ڈیڑھ سو ایکڑ عطا کیے

جمہور کو حضور یہ پیغام دیجیے
دو چار جام بادہ غفلت کے پیجیے
یہ کون کہہ رہا ہے "اثراس کا لیجئے"
کیا کہہ رہا ہے "اس پر توجہ نہ دیجئے"

پیپلپز پارٹی سے بدظن ہو کر ہوائی مارشل اصغر خاں کی تحریک استقلال میں محمود الحق عثمانی کے کہے سنے سے شرکت کا غیر رسمی اعلان چھپوایا گیا، اردو قومیت کی فلاح و بہبود اور بقا کا ایک حربہ میں سمجھتا ہوں یہ بھی تھا، کچھ ایسا ہی تھا، یہ قصہ، اصغر خاں سے باضابطہ ملاقاتیں بھی رہیں۔ دوبارہ انتخابات کا موسم آیا تو حضرت کہتے تو یہ ہیں کہ عالم سہو در تھا، پھر پیپلپز پارٹی میں وارد ہوتے باقاعدہ وفاداری کا اعلان چھپوایا، ادیبوں شاعروں کا چالیس رکنی وفد لے کر وزیر اعلیٰ سندھ مسٹر جتوئی کے دروازے تک پہنچے، میں نے علی بابا چالیس چور کی پھبتی کسی جسے وہ پی گئے، ویسے ماشاء اللہ ان کا سیاسی بھی بہت اچھا ہے، اردو قومیت کو ہاتھ میں لینے کے لیے خرانٹوں کو پانسا پھینکا تھا، رئیس نے بھی صوبائی مجلس دستور ساز کا رکن بننے کی درخواست داغی، یہ ٹاپتے ہی رہے، ٹکٹ ملا جمیل الدین عالی اور حکیم محمد سعید کو، بیچارے دونوں کے دونوں بری طرح ہارے، ہارنا چاہیئے بھی تھا، ایک معجون ساز دوسرا حسابی کتابی، رئیس کی کسی نے سنی ہی نہیں، میرا خیال

ہے اردو قومیت سے جو سلوک بھٹو نے کیا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے کان ہو جاتے، مگر آدمی حریص ہوتا ہے، پیٹ طرح طرح کے ہوتے ہیں اور شہرت کا پلہ سب پر بھاری ہے، رئیس تو ویسے بھی بہت مشہور ہیں، مجلس دستور ساز میں ہی نے لکھا بھی تھا آپ کیا پشم اکھاڑ لیں گے، آپ کا میدان آپ ہی سے مخصوص ہے قطعات کی راہ سے آپ حق رہنمائی ادا کر تو رہے ہیں یہی کافی ہے، وزارت سفارت سے آپ کو پر نہیں لگنے کا، یہ ساکھ بھی جاتی رہے گی، وہاں محض تائید اور تصدیق کا کام لیا جاتا ہے،

عالی وغیرہ نے کسی طرح آمادہ کر لیا تھا، ایوب خاں سے مل لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے، امیرالمومنین ہیں، آنا جانا کراچی میں بھی رہتا ہے، جہاں کے دانشور بھی ملنے ملانے نکل جاتے ہیں، ایوان صدر کوئی تھانہ تو نہیں، آپ بھی چلئے، مان گئے، مگر دوسری صبح جنگ میں چھپا کیا، ذرا دیکھئے،

کسی مردود کے دولت کدے پر عقیدت پیش کرنے جا رہا ہوں
مجھے ٹوکیں نہ ارباب ملامت گدھا ہوں گھاس چرنے جا رہا ہوں

ایوب خاں کراچی آتے آتے اور رئیس گدھے بنتے بنتے رہ گئے، ہیں تو یہی کہوں گا ایوبی دور میں رئیس کی انا زیادہ جاندار تھی، رفتہ رفتہ دم توڑا بھی تو کہاں، جتوئی کی چوکھٹ پر،

جھگڑے بھی تو حضور نے طرح طرح کے پال رکھے ہیں، جس نے چاہا کاغذوں کا ایک پلندہ اٹھایا، قواعد وضوابط مرتب کئے، الٹا سیدھا نام رکھا اور پہنچ گیا رئیس اکیڈمی میں، ہمارے ادارے کے صدر آپ ہوں گے، جی اور کیا ماشاءاللہ خوب ہے، سیکرٹری آپ ہوں گے، ہاں بھئی کہہ تو دیا، لاؤ ادھر دستخط کر دوں ہر مہینے اسی طرح سولی پر چڑھتے رہتے ہیں، رام بھلی کرتے ہی ہوں گے ورنہ اس کھیل کو معمول بنا لینا میرے آپ کے بس کی بات کہاں، اب وہ ہیں کہ اپنے صدر صاحب اپنے سیکرٹری صاحب سے خط پہ خط حکومت کے کل پرزوں کے نام

دن رات لکھوائے جاتے ہیں، کہیں پکڑ پکڑ کر کسی کے حضور پیش کر رہے ہیں، اس دریوزہ گری سے ساکھ دربار سرکار میں اکھڑی ہی ہوگی۔ بنی کیا خاک ہوگی، رفاہی کاموں کا ہو کا ہو مگر ایسا بھی کیا، جہاں دیکھو ٹانگ اڑی ہوئی ہے، آدمی کا بھاؤ زیادہ کرنا تو نہیں چاہیے، بھول نہ جاؤں، ایک اور بات یاد آئی - تاریخ گوئی سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں، مگر حالت یہ ہے کہ ادھر کوئی مرا کوئی جیا کوئی واقعہ کوئی حادثہ یہ تاریخ ضرور نکالیں گے، چاہے وہ مادۂ تاریخ پھسپھسا ہی کیوں نہ ہو، ایک قلمی نسخے سے بھی مدد لیتے ہیں، کھال اس کی ادھڑ چکی ہے، ورق ورق ہو چکا ہے، کام لئے جاتے ہیں، تاریخ گو ملتا نہیں، ویسے بھی لوگ آتے اور اپنے مرنے والوں کے لوحِ مزار کے لئے قطعۂ تاریخ لکھواتے ہیں، رنگیں بڑے کائیاں ہیں، کرتے یہ ہیں کہ ادھر نئے سال کا آغاز ہوا اور انہوں نے غلین آمیز کوئی لفظ کہ اس غلین کے عدد ایک ہزار ہوتے ہیں منتخب کرلیا، مثلاً "غفرلہٗ" آپ کراچی کے قبرستانوں میں یہ تماشا دیکھ سکتے ہیں، قطعہ نگاری کے علاوہ وہ بند تو کسی صنف ادب میں نہیں ہیں، نظم ہو، نثر ہو، مرثیے خوب لکھتے ہیں، معاوضہ بھی پاتے ہیں، سہرے بے شمار لکھے، میری کوشش یہ رہتی ہے کہ لفظ سہرا سہرے میں نہ آنے پائے، یہی ہوتا بھی ہے، ٹالتے کبھی نہیں، اپنوں سے تو نہیں عام سہرے وہ قیمتاً لکھتے ہیں، پندرہ سال پہلے کے نرخ بیس روپے فی سہرا تھا، اب تو بازار خاصا گرم ہوگا،

متحدہ ہندوستان مختلف قومیتوں کا ایک حسین اور وسیع مرقع تھا، پاکستان میں بھی یہ خصوصیت باقی رہی، سندھی اپنی مردانہ وجاہت بڑھی ہوئی مونچھوں، گھنی ہوئی داڑھیوں، عقابی نگاہوں، لباس چال ڈھال زبان رنگ و روپ سے الگ پہچانے جاتے ہیں، بلوچیوں کے مزاج ہی نہیں وضع قطع سے بھی سپاہیانہ جوہر صاف پرکھے بغیر نظر آنے والی چیز ہیں، زبان ان کی بھی اپنی، یہی حال پختونوں کی قبائلیت اور حریت فکر و نظر اور دینی حمیت کا ہے، اپنا حال اپنی ہی زبان میں کہنے کی دولت انہیں بھی میسر ہے، پنجاب اپنی قوت کارکردگی اور افرادی کثرت

سے پہچانا جاتا ہے، نہ بیچوں بیچ ایک اور قوم بستی ہے اور کبھی بہاولپوری بھی شاد و آباد رہا اور جیا کرتے تھے، نہایت بے ضرر سادہ صبیح و ملیح بے ریا مخلص، دیہی مزاج، لباس اپنا، چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا کھیل کود شادی بیاہ کی رسمیں ناچ گانے حتیٰ کہ ہنسنے اور رونے کا انداز بھی سب سے جدا سب سے الگ، زبان اپنی اور ایسی جو دیگر چاروں صوبوں میں سمجھی بھی جائے بولی بھی جائے، چالیس فیصدی سندھی سرائیکی بولتے اور سمجھتے ہیں، ایک بلوچ مجھے ایسا نہیں ملا جو سرائیکی سمجھتا بولتا نہ ہو، پختونوں کے ہاں ڈیرہ اسماعیل خاں پورے کا پورا سرائیکی گو، پنجاب اگر نہ مانے تو اور بات ہے ورنہ ڈیرہ غازی خاں کی زبان پنجابی ہرگز نہیں، میانوالی سرگودھا ملتان اور کسی حد تک جھنگ ہم سے منسلک ہے، لیکن یہاں تو ہٹ دھرمی یہ ہے کہ خواجہ فرید علیہ الرحمۃ کو پنجابی شاعر لکھا جاتا ہے، ایکا ایکی مروڑ پنجاب کے پیٹ میں یہ بھی اٹھا، تمام صوبوں کے وجود کو مٹانے اور ایک ہی وفاق کا اعلان کرا دیا، مجلس دستور ساز میں اکثریت پنجاب ہی کی تھی، کچھ دوسرے صوبوں کے ملت فروشوں نے بھی ہاتھ بٹایا، ادھر پاکستان بھی سب کے پیش نظر تھا، چلو یونہی سہی، لیکن دیکھ تو سبھی یہ رہے تھے دنیا بھر کی بڑی بڑی قومیں روس امریکہ چین متعدد صوبوں کے اجتماع کا نتیجہ ہیں، مختلف قومیتوں کے مجموعے کا نام روس ہے چین ہے اور تو اور ہندوستان نے بھی اپنی کارکردگی کو اور معتبر اور منفرد کر دینے کے لئے دس گیارہ نئے صوبے تخلیق کر ڈالے، سب کا وجود تسلیم کیا گیا، کسی کی نفی نہیں کی گئی صوبوں کی بحالی کی تجویز تھی کس کی یہ تو معلوم نہیں عمل درآمد فوجی حکومت کے صدر یحییٰ کے حکم پر ہوا، لیکن یہ کیا، یہ قیامت کیوں ٹوٹی کس نے توڑی، بہاولپور وفاق میں شامل ہونے سے پہلے اپنا مکمل وجود رکھتا تھا، اپنی مجلس دستور ساز تھی، منتخب نمائندے منتخب وزیر، بہاولپور کیا ہوا کہاں گیا، معلوم ہوا آدھا پنجاب سکھوں نے بانٹ لیا تھا، اب وہ کمی بہاولپور کو پنجاب میں ضم کر کے پوری کر دی گئی سبحان اللہ چشم بددور مرد ہوں تو ایسے فرد ہوں تو ایسے، دوسروں پر بس نہ چل سکا تو اپنوں

ہی کی گردن اڑا دی، قانون دان اور قانون ساز محمود علی قصوری نے عظیم پنجاب (GREATER PUNJAB) کا نعرہ مارا اور سید حسن محمود جیسے ریاکاروں نے تائید اور حمایت کا حق ادا کیا، واویلا بہاولپوریوں نے کیا تو مگر اکثریت نے مظلوم اقلیت کو گولی کے زور سے دبا لیا یہ اکثریت بنگلہ دیش میں اپنی معروف چالبازیوں کو کیوں بروئے کار نہ لا سکی اس کا بے حد قلق ہمیں بھی ہوا، ہم نے اپنے حق کا رونا کہاں کہاں نہیں رویا، یہاں تک بھی گئے اگر ہمیں زندہ درگور کرنا ہی ہے تو سندھ کیا برا ہے، ہم سندھیوں سے مانوس بھی زیادہ ہیں، سندھ کی تاریخ بتاتی ہے ملتان تک حکمرانی کا شاندار ماضی بھی تو رکھتا ہے، ہمیں اس کھونٹے سے باندھنے میں آخر حرج ہی کیا ہے، اعتراض کیوں ہو کیوں ہے، رئیس سے بھی کہا گیا، حضرت کی سمجھ میں میرے کہے سنے سے کچھ نہ آیا، ہاں جب بھٹّو نے لسانی تحریک کی آڑ میں غیر سندھی بتا کر تضحیک تذلیل نفرت حقارت اور ہتک کا نشانہ بنایا تب خدا اور اس زود پشیماں کو بہاولپور بھی یاد آیا،

میرے رئیس میرے شاعر کی زبان سے اور قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ہر جملہ ایک نقطہ ایک شوشہ محفوظ ہو جائے، لمحہ لمحہ قید کر لوں، ضروری ہے کہ ہر دقت کا ساتھ ہو، بالکل پنچ بن کر چپک کر رہ جائے آدمی، یہ خیال دل میں بیٹھا تو اپنا مقدور اتنا ہی تو تھا ردی کی ٹوکری ٹٹولنا شروع کر دی، یہ حرکت ناگوار خاطر ہوئی، یہ کیا کرتے رہتے ہو، یہ کہا اور ردی تقریباً چھین کر ٹوکری میں پھینک دی، لیکن میں نے نظر بچا کر دوبارہ جیب و داماں کو گراں بار کر ہی لیا، اور ایک دن چھوڑ کر میں بمشکل تمام انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہوا کہ یہ جو آپ کوہکنی کرتے کرتے تراشیدہ جواہر چھانٹ لینے کے بعد کنکر پتھر پھینک دیتے ہیں، کعبے سے ان بتوں کو نسبت دور کی نہیں بے حد قریب کی ہے، کاوش فکر کی صحیح قدر قیمت کے تعین کا بنیادی پتھر یہی تو ہیں، وہ نرم کیا پڑے میں نے گھر کا کوئی کونہ کوئی کھدرا نہیں چھوڑا، سب کھنگال ڈالا، سب کچھ سمیٹ لایا اور حضرت

کے گھر میں ایک آہنی صندوق رکھوا دیا، ہر طرح کا کاغذی کباڑ اس میں ڈالتے رہتے ہیں، دوسرے تیسرے مہینے کوئی جاتا ہے اور گٹھڑ لاد کے لے آتا ہے۔ یہ طرح طرح کے نوادر کا مرقع ہوتا ہے، زیادہ تعداد عوامی خطوط کی، اس کے بعد مشاہیر عصر کے مکتوبات اور سب سے بڑھ کر ادھورے پورے پونے قطعات اور کبھی کبھی غزلیات، ردی لانے والوں میں کون کون پیش پیش رہا، محمد افضل کوری قطب الدین کوری، ہری چند، اور امین دا جی وغیرہ، یہ لوگ رئیس سے خاصے بے تکلف بھی ہیں،

گھر کی ہر چیز پر نظر رہتی ہے، گملے قرینے سے رکھیں گے، کیاریوں میں پانی روزانہ باقاعدگی سے ربڑ کی نالیاں بچھا بچھا کر ڈالنا، پانی کے ذخیرے میں کمی آجائے تو بیتاب ہو کر یولائے یولائے پھرنا، داماد کی اشتراک سے خریدی گئی ایک پرانی موٹر میں دور دور سے پانی کے کنستر ڈھوئے جانے کے انتظامات کی نگرانی اور شور مچانا، موٹر رکشا والوں سے چونّی دونّی پر بحث و تکرار بھی کرنا جانتے ہیں، اور اگر وہ اپنی معروف بے احتیاطی سے سڑکوں کا گزینے کی کوشش کرے تو اور تیز اور تیز چلانے کی تاکید کر کے بدحواسی کے مزے لیتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کون گھر میں آرہا ہے کون جا رہا ہے، اس پر تو نظر رکھتے ہی ہیں، یہ بھی دیکھتے ہیں لے کر تو کوئی کیا جائے گا، لا کیا رہا ہے اس سے بھی بڑی دلچسپی ہے، میں نے بارہا اپنی بساط بھر کبھی زرکار جوتے وغیرہ نذر گزرانے مگر جب وہ خود پہلی بار محمد آباد آئے تو میری پانچ سالہ بیٹی تمکنت جیلانی کے لئے نائلون کا ایک کرتہ لائے جس کی قیمت کھینچ تان کر بھی دو روپے سے کم ہی رہی ہو گی زیادہ نہیں، گھر بھر میں ہنسی اڑ گئی، اس سے تو اچھا تھا "ٹریفک" یکطرفہ رہتا، پہ چل ہی رہا تھا، میں نے بیوی سے کہا بے وقوف یہ ایک عظیم شاعر کا تحفہ ہے، تبرک جان کر بیٹی کو پہنا دو بلکہ محفوظ کر دو تاکہ ہماری آئندہ نسلیں رئیس الشعراسے ہمارے تعلقات پر گواہ بن جائیں۔

پشتو ہماری علاقائی زبان ہے، مگر اس کا دائرہ اثر دور دور تک پھیلا ہوا ہے، پورا بلوچستان افغانستان ایرانی بلوچستان اور افغانستان سے ملحق روس کا سرحدی حصہ اس زبان کی حلاوتوں کے مزے لوٹتا ہے، خوشحال خاں اگلے وقتوں کے لوگ تھے، ہمارے معاصر ہیں حضرت امیر حمزہ شنواری پشتو غزل کی آبرو' ان کی شاعرانہ حیثیت پر گفتگو میرا منصب نہیں ہے، بس یہ کہہ سکتا ہوں ان کا ظاہر باطن ایک سا ہے، صوفی باصفا، اسلامی تعلیمات سے وہ تمام وکمال بہرہ ور ہیں، خوب سمجھتے اور بڑی بات یہ کہ سمجھا سکتے ہیں، وہ سادہ لوح صاف سیدھے صاحبِ طریقت و شریعت بزرگ ہیں، رئیس کی وادیٔ تصوف میں گلگشت پس پردہ شنواری صاحب کے تصرفات قلمی و روحانی کی مرہونِ منت بھی کسی حد تک تو ہے، اس کا علم رئیس شنواری کی مکاتبت اور روحانیات پر طویل گفتگوؤں سے ہوا،

رئیس کا گھر زیارت گاہ خاص و عام ہے، جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے، بالکل اجنبیوں کے لئے یونہی سا چوکی پہرہ بھی رعب وداب کے لئے ہے تو، ویسے کوئی روک ٹوک نہیں، رنگ برنگے جناور بھانت بھانت کی بولیاں بول کر کہیں دونوں وقت ملا کر اڑتے ہیں، وہ تو کہئے شب بیداری کے رسیا نہیں ورنہ راتوں پر بھی دن کا گماں ہو، کچھ بن کے جاتے ہیں ایک آدھ بنا کے نکل جانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے، بیسیوں غرض کے بندے، ہر ایک زیادہ سے زیادہ قریب آنے کی تگ و دو میں مصروف، ہم بھی کب پیچھے رہے ہیں، بابائے مہاجرین تو وہ اب بنے ہیں، یاروں نے بابا، بابا کی جے جے کار برسوں سے مچا رکھی ہے ایک دوسرے کو گرانے بڑھانے کی کوششوں پر مسکرائے بغیر نہیں رہا جاتا، سازشیں بھی ہوتی ہیں الزام تراشیاں بھی، وہ پلید جو گھر میں تاک جھانک کے مرتکب ہوئے تاڑ لئے گئے، میں نے خبردار کیا تو فرمایا، تم کیا سمجھتے ہو میں کچھ نہیں جانتا، تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہوں، واقعی حضرت نے دونوں کو کیفر کردار تک پہنچایا

قمر اور زلفی جانے تھے کون، عجیب اٹ پٹانگ آدمی، ٹانگیں دبا رہے ہیں، پاؤں دبا رہے ہیں، نیم وا آنکھوں سے یہ اداکاری صاحب خانہ بھی دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے، رقابتیں چلیں، چاقو بھی چلے، تھانے پہنچائے گئے، تب کہیں دفع ہوئے ہمیشہ کے لئے، ایک صاحب نے ایران دو بئی وغیرہ سے آ کر دور کا رشتہ جوڑا، اپنی دو جوان بیٹیوں اور بیٹے کو رئیس کے ہاں چھوڑ گئے، سرگرمیاں کسی نہ کسی حد تک پراسرار سی نظر آنے لگیں، سرشار دیکھ کر تقی صاحب وغیرہ نے تفریح لینے کے لئے یہ کہہ کر حواس باختہ کر دیا، پولیس آپ کے مہمانانِ عزیز اور آپ کی تاک میں ہے نشہ ہرن تو نہیں ہوا بوکھلائے بہت، یہ کاروباری لوگ بہت سیانے ہوتے ہیں ہوٹل کے کرائے سے بھی بچ گئے اور کھانا پینا تو مفت کا تھا ہی، ایک بیٹی اپنے ادارے کے لئے کراچی سے بظاہر مزدور بھرتی کر کے لے جانے کی ذمہ دار تھی بے حد حسین و جمیل، رئیس، ہماری بھانجی ہیں ہماری بھانجی ہیں کہہ کہہ کر کچھ اس طرح اس طرحدار آہو چشم حسینہ پر مسلط رہے کہ ہمیں جی بھر کے دیکھ لینے کی بھی حسرت ہی رہی، آگے چل کر اپنے روزنامچے میں اقرار کیا یہ لوگ بہت دکھ دے گئے، کیوں نہ دیتے وہ تو تھے ہی فریبی، رئیس ڈھیل اور طرح دینا بھی خوب جانتے ہیں انور شعور معروف شاعر، تھے تو جون ایلیا کے یاروں میں سے ایک، روز کا آنا جانا، رئیس سے بھی نیاز مندانہ اور حجاب آمیز بے تکلف صاحب سلامت۔ بیکار اسلئے تھے کہ کہیں ٹک کر کوئی کام نہ کیا، شام کی چائے پر ایک دن جو آڑے ہاتھوں لئے گئے تو بیچارے کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا، پھر وہ ذرا فاصلے سے رہنے لگے، اور اب تو ماشاءاللہ اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں، سحر انصاری محمد علی صدیقی ایک اور پروفیسر کہ سب جون کے یار اور رئیس کے حاضر باش بھی تھے، عملی علمی ہر طرح کی دنیا میں رئیس کا سایہ ان پر بھی پڑا ہمتیں بڑھائیں حوصلے دیئے مشورے دیئے، افکار و آرا کو سراہا، بحثیں اور مذاکرات سبھی کچھ ہوا، محمد علی صدیقی کی انگریزی زبان پر قدرت کی تعریفیں کرتے تھے

وہ ہیں بھی قابل تعریف، سحر انصاری کی غزل گوئی اور معاشقے دونوں کے مداح، لیئے دیئے رہنے کا ایک نخرہ میں نے یہ بھی دیکھا، ایک مشترک دوست کے ہاں اچانک مشہور گائیک مہدی حسن بھی آدھمکے، ستمبر کی جنگ پاک و ہند میں رئیس کے لکھے ہوئے جنگی ترانے شاعر کی موجودگی میں مہدی نے گائے اور محفوظ بھی ہوئے، لیکن یہاں بالکل انجان بن گئے، باقاعدہ تعارف کرایا تب پہچانے اور اٹھ بھی کھڑے ہوئے، سیڑھیاں طے کر کے ہم صحن میں اتر چکے تھے، اوپر سے گنگناتی ہوئی سی آواز پڑی، کیا کرتے دوبارہ جانِ محفل بننا پڑا، مہدی حسن بحیثیت ایک نوگو اور عقیدت کیش کے بچھے جاتے اور کہتے جاتے تھے، حضور اپنا مجموعہ کلام عطا فرمائیں تو میں آپ کی غزلیں گایا کروں گا، رئیس کے پہلو بہ پہلو مہدی حسن نے مجھے بھی سگریٹ پیش کیا تو میں نے اپنی توبہ توڑ دینے کو عیب نہیں ہنر جانا، کیا میں اتنا بھی نہ کرتا، یہ گویا مہدی حسن کے لحنِ داودی کے لئے ہدیۂ تحسین تھا،

زبان و بیان کی غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں کس سے نہیں ہوتیں پکڑنے والوں نے غالب تک کے کان اینٹھ لئے، رئیس کچھ زیادہ عروضی بھی نہیں ہیں، ایک خط اسی سلسلے کا اے ڈی اظہر کا آیا جس میں بعض فنی خامیوں پر متنبہ کیا گیا تھا، وہ خط میں نے رکھ لیا تھا لیکن کسی طرح حضرت نے کھسکا کر ضائع کر دیا، ایک فیلتہ جس میں موجودہ دور کے شعرا خصوصاً جوش وغیرہ پر تنقید اور اپنے عملی آدمی ہونے کی باتیں محفوظ کی گئی تھیں دبا لیا، وہ ایسے تھڑدلے اور ڈرپوک ہیں تو نہیں، بہرحال یہ تو ہر شخص چاہتا ہی ہے خوبیاں زیادہ اور غلطیاں کم عام ہونی چاہئیں، رئیس قدامت پسند اور روایت آشنا ضرور ہیں، مزاج میں فارسیت بھی ہے مگر غزل میں ان کا انداز منفرد ہے، تدبر تفکر اور تعقل کی کارفرمائی زیادہ ہے، انہیں غالب اور اقبال کے پہلو بہ پہلو بٹھایا جا سکتا ہے ہٹیئے میں سمجھتا ہوں نہیں رہیں گے کہیں کہیں تو ان کا انداز بالکل جداگانہ ہے، مثلاً

جان لیوا سہی جراحتِ عشق
عقل کا زخم ہے بہت کاری

اور

شائد اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

الف، پس غبار، حکایت نے، انا من الحسین، یہ چار مجموعے غزل نظم مرثیہ پر مشتمل چھپ چکے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے، اپنی گرہ سے چھپوا چکے ہیں، یہ سودا بھی رئیس کے لئے گھاٹے کا نہیں سود مند ہی رہا، تام سبھی چھوٹے میاں حضرت جون ایلیا نے چن چن کے رکھے "الف" پر خاصی لے دے بھی ہوئی ہمارے مولانا ماہر القادری تک یوں کہئے الف ہو گئے" یہ بھی کوئی نام ہے اسے بدل دینا چاہیئے، غلام ربانی عزیز، غلام جیلانی برق کے بھائی نے مجھے ایک خط میں لکھا "پڑھنا اور تنقید کرنا کیسا میں تو کتاب کے نام سے بدک گیا تھا" غلام ربانی عزیز نے سچی بات اور کھری کھری لکھ دی، یہ بھی بڑی بات ہے، داد طلب ہے، خود بدولت کیا فرماتے ہیں، اِسے بھی پڑھ لیا جائے، والد مرحوم بانی "مبارک اردو لائبریری" سید مبارک شاہ جیلانی کے استفسار پر فرمایا بھی اور لکھا بھی،

جز الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز،
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

چاک گریباں کا الف اور صیقل آئینہ کا الف، شعر کے مشہور کنایات ہیں، اس کے علاوہ الف اللہ کا ابجد کا، حروف مقطعات کا، ابد کا ازل کا غرض الف ہی الف ہے، تصوف اور روحانیت میں الف گہرے اسرار و رموز کا حامل ہے،

سلسلہ تصوف اور روحانیت میں رئیس کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں قطعہ ملاحظہ فرمایئے، غور طلب ضرور ہے،

بے فیصلہ فکر و تامل

اللہ رے وہ حقیقتِ کل

توحید کے مرتبے میں جس کا

"اللہ" ہے درجہ تنزل

کراچی میں آئے دن ادبی اجتماعات کتابوں کی افتتاحی اور تعارفی تقریبات مشاعرے مذاکرے کسی کے ساتھ شام کسی کے لئے نشست کا اہتمام ہوتا رہتا ہے، ایک ہنگامہ رئیس کے لئے بھی کھڑا کیا گیا، عروس البلاد کے کم و بیش سبھی ادیب و شاعر جمع بھی ہوئے، اور شخصیت اور فن پر مقالے بھی پڑھے گئے، یہ تقریب "جشن رئیس امروہوی" کے عنوان سے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں برپا کی گئی، رئیس کو خراجِ تحسین پیش کر کے شہریوں نے اپنی ہی توقیر بڑھائی، رئیس تو اس سے بھی زیادہ کے مستحق اور حق دار ہیں، میں کراچی جاتے جاتے رہ گیا، اپنی محرومی کی تلافی میں نے اس موقعے پر پہنائی جانے والی دستارِ دانش پر قبضہ کر کے کر لی تھی، دستارِ دانش کی حفاظت مجھ پر اور میری اولاد پر فرض ہے، بتقاضائے محبت و عقیدت۔

رئیس شیعہ ہیں رئیس سُنی ہیں سادات امروہہ دیلسے ہیں تو سبھی حسینی اختمی فیصلہ وہ خود کریں گے، ہم نے تو کالوں گوروں پر یکساں برتتے ہوئے دیکھا ہے، محرم کی تقریبات مجالس و ماتم کے آداب خضوع اور خشوع سے بجا لاتے ہیں، مرثیہ پڑھتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا، شائد بر سر مجلس پڑھتے ہی نہیں، دلسوزی سے سنتے ضرور ہیں، اور لکھ لکھ کر چھپواتے بھی ہیں، حاضری کا بلاوا ہو تو ٹالتے نہیں، پٹیل پارک میں امروہہ کے سیدوں کی مجلس ضرور برپا ہوتی ہے، یہ سوز خوان اچھا ہے وہ بُرا تھا اسے کیوں موقع دیا گیا، اس قسم کی بحثوں میں بھی پڑا کرتے ہیں، عید میلاد النبی کے جلسوں میں تو شریک بھی ہو جاتے ہیں لیکن جلوس صرف محرم کا اُن کو گھر سے نکل پڑنے آتا ہے، نماز کے پابند پہلے کبھی ممکن ہے رہے ہوں، میں نے تو عید کی نماز پڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، روزے وہ غالباً بحالی صحت کے لئے بطور فاقہ

کے دو چار کبھی رکھ لیا کرتے تھے اب وہ بھی نہیں،

امروہہ کا ذکر مسلسل تاریخوں میں چلا آتا ہے، سید محمد تقی معتبر راوی ہیں اپنے تازہ سفرنامۂ بھارت میں لکھتے ہیں، امروہہ ڈھائی ہزار سال سے زیادہ پرانی بستی ہے اور کوئی آٹھ سو سال سے مسلمان اس شہر میں آباد ہونا شروع ہوئے، اب سے پچاس سال پہلے اس کی آبادی چالیس ہزار کے قریب تھی، یہ شہر ہندو اور مسلمان زمینداروں پیشہ وروں چھوٹے تاجروں اور ناہنر مند مزدوروں پر مشتمل تھا جو زمیندار خاندانوں سے معاشی وابستگی رکھتے تھے، دولت کے ساتھ تہذیب و شرافت اور علم و دانش بھی بڑی حد تک زمیندار خاندانوں میں محدود تھی، مکانات چھوٹی اینٹ یا چونے کے ہوتے تھے جن پر پلاسٹر شاذونادر ہی ہوتا تھا، غربا، اور پسماندہ طبقے جھونپڑیوں میں رہتے تھے ان پسماندگان میں بھنگی اور چمار سماجی درجے میں سب سے نیچے آتے تھے، ان کی معاشی حالت بھی سب ہی سے خراب تھی، ذی مقدرت لوگوں کے زنانہ اور مردانہ مکان الگ الگ تھے، مردانہ مکانوں کو دیوان خانے کہا جاتا اور زنانہ حصے کا نام حویلی تھا، شہر محلوں میں منقسم تھا، بہت سے محلوں میں امام باڑے اور مندر بنے ہوئے تھے، سڑکیں زیادہ تر آٹھ فٹ چوڑی اور کم چودہ یا سولہ فٹ کی تھیں، مکان عام طور پر ایک منزلہ اور کم دو منزلہ تھے، دکانیں چھوٹی اور تعداد میں بہت کم تھیں، سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ بھی بہت کم تھا، پتھر کوٹ کر سڑکیں بنائی جاتی تھیں، یا بعض چونے کی بنی ہوتیں، ٹم ٹم تانگے اور بیل گاڑیاں سواری کے لئے استعمال ہوتیں، زمیندار خاندانوں کی خواتین ڈولیوں یا تانگوں میں جن کی نشستیں چادروں سے ڈھانک دی جاتیں، ایک محلے بلکہ بعض حالات میں ایک گھر سے دوسرے گھر تک پردے کا پورا اہتمام کر کے جاتیں، مغلانیاں زمیندار لڑکیوں کو اور مولوی صاحب یا پنڈت جی لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے، بہت سے ٹیوٹر زمینداروں کے دیوان خانوں میں قیام کرتے، انگریزی تعلیم کم پھیلی تھی، زمیندار طبقے نے سب سے پہلے انگریزی پر توجہ کی، امروہے میں ایک گورنمنٹ ہائی اسکول اور دوسرا

سادات کا ہائی اسکول امام المدارس تھا، عربی کے چار مدرسے تھے، رئیس امروہوی فرماتے ہیں، امروہہ مراد آباد کے ضلع میں اک قصبہ ہے، دلی سے جانب مشرق ۸۰ میل اور لکھنو سے جانب مغرب دو سو میل، اس کے شمال میں سلسلہ کوہستان ہمالیہ ہے' مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ نے اس طرح ذکر کیا ہے، ھیَ بلدۃٌ حسنۃٌ صغیرۃ، یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے، تو جناب امروہہ بڑا مردم خیز خطہ ہے، رئیس یہیں پیدا ہوئے پلے بڑھے، سید المدارس میں تعلیم حاصل کی، منشی فاضل وغیرہ کا امتحان لاہور جا کر دیا وہاں اقبال سے بھی ملے، گفتگو بھول بھال گئے کیا ہوئی تھی، سید محمد تقی، سید محمد عباس، جون ایلیا، رئیس امروہوی چاروں بھائی عنفوان شباب ہی میں اپنے قصبے کی جان تھے، محلے کے بچوں کی سنیئے، کہتے ہیں

اچھن بچھن چھبن جون

ان چاروں میں اچھا کون

جون جون جون

جون سب سے چھوٹے لہذا بچوں کے محبوب نظر بھی وہی نکلے، رئیس سادات کی نقوی شاخ اور سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، جد امجد سید حسین شاہ شرف الدین شاہ ولایت کے والد سید میر علی غیاث الدین تغلق کے عہد میں عراق سے ہجرت کر کے ملتان آئے اور وہیں وفات پائی، میر علی کا نسب کئی واسطوں سے امام علی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا مدفون بہ ارض طوس تک پہنچتا ہے، امام علی الرضا صرف چار واسطوں سے امام حسین ابن علی ابن ابی طالب کے پوتے تھے، میر علی کے صاحبزادے حسین شرف الدین بقول رئیس بہ اشارۂ غیبی یا بہ ضرورت ظاہر ملتان سے ترک سکونت کر کے شمالی ہند کی طرف آئے، اور دوآبہ گنگ و جمن میں بمقام امروہہ مسکن بنایا، ابن بطوطہ نے رئیس کے دادا قاضی سید میر علی ولد سید شاہ حسین شرف الدین سے بھی ملاقات کی اور یہ تو پڑھنے والوں نے پڑھا ہوگا، ابن بطوطہ نے "شیخ زادیہ" کہہ کر ذکر کیا ہے، امروہہ میں بزرگان دین اور اولیائے کرام کے مزاریوں تو بہت ہیں

لیکن شاہ شرف الدین شاہ ولایت کے مزار کی اہمیت یہ ہے کہ اس مزار پر بچھو نہیں کاٹتے، انگریز ایک ہٹری وہ کیوں ایسی خبروں پر ایمان لاتا، ایک زہریلا بچھو وہ حکمران لے کر پہنچا، مجاوروں نے طاہی بہادر کو نظر انداز کیا، بچھو کو ہاتھوں ہاتھ لیا جس نے کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچایا، انگریز کی صاحبیت دھری رہ گئی، اپنا سا منہ لے کر چلا آیا، سید محمد میر عدل اکبری حکومت میں قاضی القضاۃ تھے، آخر عمر میں سکھر سندھ کے گورنر بنائے گئے، یہیں وفات پائی، بکھر میں مدفون ہیں، رئیس کے والد علامہ سید شفیق حسن بھی شاعر اور مصنف تھے، ایک قلمی اور ایک مطبوعہ نسخہ میرے کتب خانے میں محفوظ ہے،

سید محمد مہدی نام، رئیس تخلص، عرف اچھن، شعر کہنے کی مشین ہیں، جوں جوں یہ مشین پرانی ہوتی جاتی ہے، رواں ہوتی جاتی ہے، خاندانی عمر اوسطاً بھی ستر اسی سے کیا کم پڑے گی، عملی زندگی پر شباب آچلا ہے، اور شباب ظاہر ہے جس چیز پر بھی آئے پسندیدہ معلوم ہوتی ہے، ساٹھ باسٹھ سال کے تو وہ ہو چکے، پندرہ بیس برس تو انشاء اللہ باتوں باتوں میں نکل ہی جائیں گے۔

بڑھتی ہے مری عمر تو ہوتا ہوں جواں اور

۲۶/ مئی ۱۹۷۹ء

بر مکان مُصوّر صاحب، صادق آباد

اتنے ہوئے قریب کہ وہ دور ہو گئے

مجھے نہیں معلوم تھا، شعر وادب میں ان کا مرتبہ اور دنیائے روح و مادہ میں ان کا مقام کیا ہے، دل میں یہ کہ بیاض کا پہلا صفحہ کسی بھلے آدمی کے قلم کی زد میں آئے اور ماہر القادری میں نے یہ جانا کہ ویسے ہی ہیں جس کی مجھے جستجو ہے' دکن کے شہزادوں کی رنگین راتوں کا حاضر باش اور بمبئی کے فلمی شبستانوں میں زندگی کرنے والے کی شہرت یہ ہو تو آپ جانیئے اس مرحوم نے تعمیر ذات اور رفعتِ کردار کے لئے کیا کیا کچھ پتہ نہ مارا ہوگا، وہ ہنس مکھ ہی نہیں بے حد ہنسوڑ تھے، چہرے مہرے سے وہ بہت بزرگ لگتے تھے، لیکن ذرا سا جھانک کر دیکھئے تو آنکھوں میں شوخی اور شرارت چھپائے نہیں چھپتی تھی، فقرے بازی سے وہ کہیں نہ چوکے، محفل یاراں ہو کہ مجمع رنداں، رنگ اڑاتے نہیں جما دیتے تھے، لطائف کا ایک طومار ان کے نہاں خانہ دماغ میں محفوظ اور موجزن رہتا تھا، گفتگو کا نشانہ کسی کی ذات نہیں بننے پاتی تھی، وہ انفرادی نہیں اجتماعی تفریح کی لوٹ میں رہتے تھے، دل آزاری نہ ان کا مذہب تھا نہ مسلک، نہ کبھی اس کا ارتکاب کیا، ان کا شیوہ خلوص اور محبت تھا اس طرح گھل مل جاتے گویا برسوں کا یارانہ ہو، وہ بے انتہا لطیف لذیذ اور نفیس آدمی تھے،

ماہر صاحب شریف آدمی تھے، شریف آدمی ہی پڑھا لکھا بھی ہوتا ہے، پڑھے لکھے سے مراد سندات کا گٹھڑ لادنا نہیں اپنی کوشش اور کاوش سے وہ متعدد زبانوں پر قادرانہ دسترس رکھتے تھے اور زبان اور اس کے لوازمات کی چھینک کسی اور کے ہاں ایسی کم ہی دیکھی گئی ہو گی، لسانیات محبوب اور مرغوب موضوع تھا، اپنے ماہنامہ "فاران" میں ہر مہینے زبان و بیان پر ان کی خامہ فرسائیاں بے حد جاندار

اور یادگار ہوتی تھیں، یونہی سادہ ہم ہو جائے تو حلقۂ مشاہیر میں خطوں کا تار باندھ دیتے، ٹیلیفون کھڑکھڑاتے یہاں تک کہ نکل کھڑے ہوتے، حوالے کی کتابوں کا ورق ورق دیکھ ڈالتے لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنے اور تلخ گفتگوؤں سے بھی گریز نہ کرتے طالب علمانہ تحقیق اور ردوکد ان کی گھٹی اور خمیر میں پڑے ہوئے، نئے نئے الفاظ گھڑنے کا شوق بھی اچھا خاصا تھا، مواد کا نعم البدل لوازمہ تجویز کیا اور فاران کے علاوہ روزنامہ جنگ کراچی میں بھی رئیس امروہوی کے تعاون سے لوازمے کو خوب اچھالا، اس ایجاد کا سہرا اپنے سر پر باندھ لیا، اول تو مواد جیسے دبیع القلب لفظ کو متروک کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، لطف یہ کہ لوازمہ مولوی عبدالحق کے ہاں استعمال ہو چکا تھا، یہ اطلاع جب میں نے دی تو پی گئے، سارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا، فاران میں ذکر کیا نہ جنگ میں کوئی مراسلہ چھپا،

ایک بار مولانا کا ہمارے یرٹس ڈہر کی سندھ کھاد کے کارخانے میں آنا ہوا لکھ چکے تھے، میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچا اور محمد آباد لوالایا، میں تھادہ تھے اچھو میاں (سنجر پور ضلع رحیم یار خاں) تھے، میری گرہ میں اتنا مال نہیں تھا کہ میں ان کے ہمسفروں کو بھی مدعو کرتا اور شایانِ شان خیر مقدمی تقریب فراہم کرتا میزبانی کا اعزاز میرے لئے چھوٹا نہیں بڑی بات ہے اس لئے اور کہ فاران میں یہ ذکر بھی لے بیٹھے تھے، خورد نواز تھے وہ، جاڑوں کے دن تھے، ناشتے میں انڈے مکھن پراٹھے اور پھل تو تھے اور وہ خوب پیٹ بھر کر بلکہ ڈٹ کے کھاتے بھی گئے کھاتے جاتے تھے اور کہے یہ جا رہے تھے، میں تو چھاچھ پیوں گا، پورے تین جگ موصوف خدا جھوٹ نہ بلوائے قریب قریب ایک ہی سانس میں پی گئے اور ڈکار تک نہ لی، یہ ضرور ہوا کہ جب میں انہیں ان کے مستقر تک پہنچانے لے چلا تو وہ رلستے بھر اونگھتے نہیں باقاعدہ سوتے رہے، اتنا کھانے پینے والا سوئے گا اور کیا کرے گا، بیچارے میرے بھتیجے محمد شاہ بڑے مایوس ہوئے وہ مولانا کی بے تکان اور بے لگام گپ شپ سے محظوظ ہونے کے لئے موٹر میں

مولانا ماہر القادری



اموک خالد جالندھری، ماہر القادری ستمبر ۱۹۶۷ء لندن

۱۳۲۴ھ —— ۱۳۹۸ھ

بیٹھ کر پچھتائے، واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت خوش خوراک تھے، خوب مزے لے لے کر کھانے والے، سالن کھچڑی اور بریانی پکانے کی ترکیبیں بتانے والے، خود بدولت اچھے خاصے باورچی بھی تو تھے، مفتی محمد شفیع مرحوم تو کہتے تھے، ماہر صاحب کی تعریف اچھے کھانے کی سند ہے، اس اعتبار سے ہم "سند یافتہ" ہیں، مرحوم نے مختلف انواع واقسام کے اتنے کھانے کھائے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ دکن کے شاہزادوں کی ان بھینسوں کا دودھ بھی پی چکے تھے، جنہیں صرف بادام اور پستے کھلائے جاتے تھے، چائے کے شوقین تھے، ناشتے میں کھچڑی بہت پسند تھی، بشرطیکہ گھی بھی خالص ہو، قیمہ انڈا دہی اور اچار بھی ہو، طبی اصول تو یہ ہے کہ کھاتے وقت بیچ بیچ میں پانی ہرگز نہ پیا جائے، ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پیٹ بھر کے پیا جائے، لیکن ماہر صاحب پہلے نوالے پر ہی پانی پانی پکارا ٹھتے، انگریزی طرز پر کھانا کھانے کی مشق بھی اچھی خاصی تھی، دیکھ دیکھ کر سیکھ لیا تھا،

خاصا نکلتا ہوا لانبا قد، بھرا بھرا جسم، بھاری بھر کم ہونے کے باوجود چست اور رواں دواں، چال ڈھال میں وقار بھی تھا تمکنت بھی، انداز ان کے تھوڑے سارے معصومانہ اور زیادہ مخلصانہ تھے، اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا، بڑے قرینے سے لباس تبدیل کرتے مگر دو چار گھنٹوں میں لباس ملگجا سا ہو جاتا، یہ مرحوم نے تو دکہیں لکھا ہے، داڑھی بالکل ہلکی سی ایک پٹی تھی، عربوں کی سی وضع کی، جاؤ تو وہ رخصت کرنے موٹر کے دروازے تک آتے، روکے نہ رکتے اور اسے وہ بزرگانہ آداب اور اخلاق میں شمار کرتے، ورنہ میری ان کی عمر کا فرق تیس برس کا تو تھا ہی، ہاں ایک یہ بھی تھا، ننگِ سادات ہونے کی رعایت سے بھی برابر کا جان کر معزز فرماتے مجھے یہ بھی کسی پس وپیش کے بغیر کہنا چاہیئے، وہ میری خردانہ سعادت کو بھی بھانپ بلکہ یوں کیوں نہ کہوں آنک چکے تھے،

وہ شبلی اسکول کے طالب علم تھے، شبلی کے سامنے وہ کسی کا جھاڑ فانوس

تو کیا چراغ تک تر جلنے دیتے تھے، اردو کا بادا آدم اگر کوئی تھا تو وہی شبلی، علامہ شبلی بے مثال مورخ لاجواب ناقد اور بلند پایہ شاعر تھے، یہ ماہر صاحب کی رائے ہے اور اس سے میں بھی متفق ہوں، مگر یہ کیا، شبلی کے عطیہ فیضی سے والہانہ تعلق خاطر کو مرحوم نے المیہ قرار دیا ہے، شبلی کے ساتھ عطیہ کا ذکر تک المیہ، آخر ایسا کیوں ہے، جبکہ وہ خود یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں سفیان ثوریؒ کوئی نہیں سمجھتا نہ ان کو خود زہد و اتقا کا دعویٰ تھا، وہ معصوم نہیں تھے، شاعر تھوڑا بہت رنگین مزاج بھی ہوتا ہے، عطیہ سے شبلی کا بہت سے بہت معاملہ شاعرانہ رنگین مزاجی کی حد تک تھا اس سے زیادہ نہیں، شبلی نے عوام کو دھوکا نہیں دیا، رنگین مزاجی اور فسق و فجور ایک نہیں، شبلی رنگین مزاج تھے فاسق و فاجر نہ تھے، عطیہ کے نام ان کے خطوط اسی شاعرانہ رنگین مزاجی کا مظہر ہیں، عطیہ کے انتقال پر ماہر مرحوم نے ماتمی شذرہ لکھا، بسم اللہ شبلی ہی کے نام سے ہوئی، صاحب فاران عطیہ کے صحبت یافتہ اور مہمان رہ چکے ہیں، عطیہ کے معتقدین میں دو نام اور بھی آتے ہیں، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال، اقبال کے باب میں ہمارے مولانا کو یہاں تک غلو تھا، کہنے لگے، علامہ اقبال کی پرائیویٹ زندگی کو وہی شخص منظر عام پر لائے گا جسے اسلام سے کد ہو گی، ایک خط کے جواب میں لکھا ہے، اقبال کے بارے میں جن باتوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، ان سے بہت زیادہ باتیں مجھے معلوم ہیں، مگر ہم ان کے ذاتی کردار کے نہیں، ان کے دینی افکار کے مدح خواں ہیں، کوئی شک نہیں اقبال کی شاعری نے اس مادی دور میں اخلاق اور اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی، مولانا ماہر کی تمنا یہ بھی تھی اقبال کا ترانہ ہمارا قومی ترانہ ہو اور دُھن اس کی مغربی نہ رہے، معاصرین سے ان کی لاگ ڈانٹ زندگی بھر رہی، نیاز فتحپوری کو جگر مرادآبادی سے پرخاش ہی کیا تھی مگر نگار کی پوری ایک اشاعت جگر کے شاعرانہ معائب کی کرید میں ضائع کی گئی، ماہر نے بھی ابوالکلام کو فاران میں مہینوں رگیدا اور عالمانہ عظمت کے نیم دلانہ اعتراف کے ساتھ ساتھ غیر خاندانی اور نامعتبر

ثابت کرکے ہی دم لیا، نیاز چونکہ مولانا مودودی کی بارگاہ میں بہت گستاخ تھے اس لئے نیاز سے باقاعدہ بغض تھا، تقریباً غیر مسلم سمجھتے تھے، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے نیاز صاحب کی مذہبی بصیرت کی تعریفیں لکھیں تو ماہر صاحب نے مجھے توبہ کرنے کا مشورہ دیا۔

وہ شاگرد کسی کے نہیں تھے، البتہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے مرید تھے، بچپن میں میلاد شریف پڑھے، سوز خوانیاں کیں، لیکن جب مطالعہ میں وسعت پیدا ہوئی تو رجبی کے کونڈوں مزارات پر چادر پڑھانا، چراغ جلانا، قبروں کو غسل دینا، چومنا، سب بدعت کے ذیل میں آگئے، تصوف کے بھی قائل نہیں تھے، ان کا خیال تھا تصوف کے سبب توحید بے غبار نہیں رہی توحید کے معاملے میں بڑے حساس اور غیور تھے، دیوبندی سلسلۂ فکر سے زیادہ قریب تھے لیکن عملاً جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، جماعت کے رکن یا رفیق کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود ہر مہینے جماعت اور سربراہِ جماعت کے دفاع میں پابندی سے لکھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مرحوم ماہر اپنے مسلک پر سختی سے کاربند نظر آتے تھے، تعویز گنڈے محافلِ سماع عید میلاد، ماتم تعزیہ معجزات کشف و کرامت پیر فقیر کا نام سن کر بدک جاتے تھے اور پھر پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے، لیکن برا ہو مولانا مودودی سے عشق کا رد بدعت میں لکھتے لکھتے جلوس غلاف کعبہ کی حمایت میں لکھنا پڑا۔

شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا، غزل کے علاوہ نعت گوئی میں بھی کسی سے کم نہ تھے، وہ شعر کی فرمائش کا برا نہیں مانتے تھے، شعر سنانے کا ہوکا ممکن ہے نہ ہو مگر وہ ایک دو گھنٹے چھوڑ چار چار گھنٹے مخصوص محفلوں میں غزل خواں رہتے، مشاعروں کے دھنی تھے، دور دراز کا کیسا ہی دشوار گزار سفر ہو چھوڑتے نہ تھے، کس سے پہلے اور کس کے بعد پڑھوایا گیا، اس کی انہیں فکر نہ تھی، نہ کبھی حاضرین کے مذاق اڑانے کا خطرہ محسوس کیا نہ اس کا نشانہ بنے۔ میں نے انہیں مشاعروں میں سنا ہے، میں چونکہ تحت اللفظ کا رسیا ہوں، وہی پسند بھی آیا، ترنم میں وہ جان کہاں، گلے بازی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ماہنامہ
فاران
مدیر:- ماہر القادری
ای ۳/۲۴ ناظم آباد ۳ کراچی (پاکستان)
فون:- ۶۱۳۳۰۳

محبِ مکرم

السلام علیکم

تمنا ہے کہ چند اردو غزلیں
بھیج دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ
رسالے کی زینت بن سکیں

والسلام

مخلص ماہر القادری

۱۸ / ۷ / ۷۱

انداز تحریر

از
ماجد الکادری



بخدمت جناب سید انیس شاہ صاحب جیلانی

محمد آباد

تحصیل صادق آباد

کا شوق کسی کو ہو، وہ دوسری بات ہے، فضل احمد کریم فضلی جیسے دوستوں کو اپنی غزلیں سناتے اور ان کی اصلاح پر تیز بز تو بہت ہوتے مگر قبول بھی کر لیتے، ناپسندیدہ اشعار نکال دیتے، قلم زد کر دیتے، آزاد شاعری کے خلاف تھے، کہتے تھے، یہ بے سروپا شاعری ہے، یہی نہیں یہ شاعری کے ساتھ دردناک مذاق ہے، بمبئی میں کمیونسٹ شاعروں اور ادیبوں کے مقابلے میں حلقہ فکر و نظر قائم کیا اور خوب خوب خطابت کے جوہر دکھائے، وہ کہتے تھے، اشتراکیوں کا مقصد مزدوروں کی ہمدردی کے پردے میں کمیونزم اور لادینیت کی تبلیغ اور اشتراکی انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، ماہر صاحب نے ہر جگہ کھل کر لادینی رجحانات کی مخالفت کی،

پاکستان منتقل ہونے کے بعد ایک ماہنامہ نکالا، فاران نام رکھا جو پورے اٹھائیس انتیس سال ہر مہینے باقاعدگی سے بازار ادب کی رونق بڑھاتا رہا، اس کی کامیابی میں بڑا ہاتھ ان کے بھائی مسرور حسین کی محنت اور تعاون کا تھا فاران کسی کا نقیب نہیں تھا، لیکن جماعت اسلامی کا ثنا خواں، ادبی حلقوں میں فاران اپنے تبصروں اور یاد رفتگاں کی وجہ سے مقبول ہی کہوں کہ تھا، میں سمجھتا ہوں ماہر خاکہ نگاری کی فنی باریکیوں سے بھی بے خبر نہ تھے، خوبیوں اور خامیوں کا پلڑا برابر سرابر کار کھتے، موضوع سے متعلق برا بھلا جو کچھ جانتے بے جھجک سپرد قلم کر دیتے کسی کی خوشی ناخوشی خفگی وغیرہ کا قطعاً خیال نہیں کرتے تھے، بے خوف اور نڈر تھا ان کا قلم، وہی مولوی یوسف بنوری کا ستر سال کی عمر میں شادی کرنے، کشتہ سازی اور صاحب اولاد ہونے کا ذکر کر گئے، ہماری آپ کی ہمت ایسی کہاں، تبصرہ اور تنقید لکھتے وقت بھی وہ کسی رو رعایت کے روادار نہ تھے، عبدالعزیز خالد کے کیا کیا جھنڈے نہیں گاڑے جا رہے، لیکن ماہر صاحب نے دو ٹوک اور کھری کھری لکھ ہی ڈالی، یہی کہ مختلف کتابوں سے ثقیل الفاظ چنے اور شعر میں باندھ دیئے دوسرا رخ کے عنوان سے ہمیشہ تمام لفظی اور معنی کمزوریوں کی نشاندہی کر دیتے

تھے، بہتوں سے کھٹ پٹ رہتی تھی، فاران میں غزل چھپنے کے لئے جائے اور پوری کی پوری چھپ جائے ناممکن، ایسا کثرا انتخاب کرتے کہ غزل اور صاحب غزل دونوں چیں بول جاتے، بہت سوں کا محض ایک ایک شعر ہی انتخاب میں آیا اور چھپا،

خط ان کا اگلے وقتوں کے لوگوں کی طرح جیساکہ معمول ہے منشیانہ تھا زود نویسی میں قلم بہت کم کسی کے قابو میں رہتا ہے، یہی حال ماہر صاحب کا تھا، خطوں کے جواب دیتے تھے اور مختصر، فاران حوالہ ڈاک ہوتا تو خریداروں کے نام دپتے جناب مدیر دستِ خاص سے لکھتے، آنے والی ڈاک سنبھال کر کبھی رکھی ہی نہیں، میں نے جال پھینکا تو تھا، دو ایک پلندے اپنے نام آنے والے خطوں کے مجھے بھجوائے، مگر یہ سلسلہ چل نہ سکا، وہ لاابالی بھی تو بہت تھے، یہی حال تصویروں کا تھا، مرحوم کا رہن سہن بہت اچھا اور رئیسانہ تھا، ناظم آباد میں دو منزلہ مکان خرید لیا تھا، اولاد تو تھی نہیں، ایک کمرہ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ ان کے لئے مخصوص تھا، میں نے یہی دیکھا آراستہ پیراستہ، میز کرسی صوفے الماریاں ریفریجریٹر ملحق غسل خانہ برآمدے میں بھی بیٹھک رہتی تھی، یہاں بھی میز کرسی سجی ہوئی، کمرۂ استقبالیہ ان کے ہاتھ اور دل کی طرح کھلا ہوا اور ہوادار اور یہیں بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئیں، صحن میں آموں کے پیڑ لگے ہوئے، کیا عجب جن آموں سے میری تواضع کی گئی گھر ہی کے ہوں، ایسا ہی کچھ کہا تو تھا مرحوم نے، میں نے رات کا کھانا چھوڑ رکھا تھا، لالوکھیت کے ایک ہوٹل میں اصرار کرکے لے گئے جہاں میں نے اور تو کچھ نہ کھایا پیا، دو پیالے پڑنگ حلق سے اتارے، کھانا کھا چکے تو بولے، تم نے دو پیالے کھائے میں بھی دو کھاؤں گا، اور وہ کھائے گئے، شادی ایک ہی کی، بیمار بیوی کی برسوں تیمارداری کرتے رہے، کراچی میں تو کشادگی اور فراوانیٔ رزق کا دور تھا، لیکن اپنے آبائی گاؤں کسیر کلاں، جہاں ۱۹۱۸ء تک کوئی اخبار تو کیا اشتہار تک نہیں پہنچا تھا، مٹی کے چراغ میں رہ ئی کی پتلی سی بتی سے کام چلایا، گڑ کھایا اور کھدر کا موٹا جھوٹا لباس پہنا، کسیر مڈل اسکول ڈبائی سے انگریزی

کی فورتھ کلاس پاس کی، ہندوؤں کے تہوار دیکھے اور اشنان، اتحاد المسلمین سے لے کر مسلم کانفرنس، کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوئے، حال و قال کی محفلیں دیکھیں، خلافت کمیٹی کے لئے چندے جمع کئے، پولنگ اسٹیشنوں کے والنٹیئر بنے، انجمن اصلاح الخیال کے کارکن کی حیثیت سے مسافروں کو پانی پلایا، میٹرک کے زمانے میں ہاکی فرسٹ الیون میں کھیلے اور رفتہ رفتہ عالموں اور واعظوں شاعروں سے نکل کر بادشاہوں تک بھی پہنچے، حضور نظام کی پیشیاں جو بھگت چکا ہو وہ آداب شہنشاہی سے مالا مال کیوں نہ ہوگا، البتہ وہ بادشاہوں کے مزاج شناس نہیں تھے، ایک ہائی اسکول میں ملازمت کی اور ماسٹر صاحب کہلائے، رمی اور برج کھیلنا جانتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سیرت کے جلسوں میں تقریریں بھی خوب کرتے تھے، کوئی مقرر ان کے عقائد کی روشنی میں پٹڑی سے اترنے کی کوشش کرتا تو ٹوک دینے میں بیباک تھے، مولانا مودودی کو بھی مشورے دیئے، بہادر یار جنگ نے قائد اعظم کو بلایا تو وہاں ماہر صاحب کی نظم خوب چمکی، اخباری زندگی روزنامہ الجمعیت سے شروع کی، علوم شرقیہ کے ایک مدرسے میں دیوان درد پڑھایا، غرض ہر طرح کے پاپڑ بیلے، اور بالآخر اپنی تمام تر ادیبانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں کو کم و بیش دین اسلام کے لئے یہی کہنا چاہیئے وقف کر دیا، بسا بسایا گھر چھوڑنا بڑی آزمائش ہے انسان کے لئے، پاکستان کے لئے لاکھوں مسلمانوں کو آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑا، ماہر صاحب نے اپنے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر ہندوؤں کا مقابلہ کیا اور لڑتے جھگڑتے مرتے کراچی تک آئے، بھائی کو بھی یہیں بلایا، دونوں نے جم کر کام کیا نام بھی پایا انعام اور مقام بھی، اپنے رکھ رکھاؤ کے باعث ادبی علمی مذہبی سیاسی ہر حلقے میں عزت و احترام سے لئے گئے۔

ماہر صاحب کا رنگِ سخن ان سے مخصوص اور من موہن تھا، ان کی شاعری پر تبصرہ اور تجزیہ مجھ سے کیا ہوگا زیادہ نہیں دو چار ایک شعر یہاں نقل کرتا ہوں۔

لطف تو جب ہے کہ دونوں کو سزا دی جائے
میرے حصے کی بھی واعظ کو پلا دی جائے

اتنے ہوئے قریب کہ وہ دور ہو گئے
ہم دور دور تھے تو کوئی فاصلہ نہ تھا

وہ قول وہ قرار وہ قسمیں کہاں گئیں   تم مجھ کو بھول جاؤ گے میں نے کہا نہ تھا

ذکرِ وفا پہ اتنے برہم
میں نے تو اک بات کہی تھی

زندگی کا میری سرمایہ تھا اک نقش وفا   لیکن اب یہ نقش بھی مبہم نظر آنے لگا

یہ سعیٔ احتیاط و ضبط کب تک
محبت ہے تو رسوائی تو ہوگی

ساقی ہے دورِ جام ہے بادل گھرے ہوئے   اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کئے ہوئے

فارسی میں بھی سخن گوئی کا ملکہ تھا، ایرانی سفارت خانے میں غزل خواں دیکھ چکا ہوں افغانستان کے سرور خاں گویا کو بھی وہاں جانا ہوا تو اپنے کلام سے محظوظ کیا، گلستان بوستاں دس برس کی عمر میں والد نے پڑھا دی تھی اہل علم کی صحبتوں سے جی بھر کے بڑا فائدہ اٹھایا،

سفر کے بے حد رسیا تھے، ایک زمانہ وہ تھا جب جگہ جگہ ذرا سی بات پر مشاعرے برپا ہوتے اور غزل نوانیاں ہوتیں، ماہر صاحب ہر جگہ پہنچتے، جس کا جی چاہے بلا لے، بسوں میں ریلوں میں ہوائی جہاز پر تانگے رکشا حتی کہ بیل گاڑیوں پر سوار ہوئے قدر دانوں نے جنوبی افریقہ اور لندن بھی بلایا اور خوب خاطریں کیں، برٹش میوزیم کی سیر کرتے ہوئے کسی دوست نے تصویریں اتاریں تو ازراہِ محبت دو تصویریں میرے حصے میں بھی آئیں، سفر میں لطیفے تو سرزد ہوتے ہی ہیں، پیرس کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے کھاتے زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ہاتھ کے انگوٹھے کا اشارہ کر کے وہاں کام کرنے والی نوعمر دوشیزہ سے پانی مانگا تو وہ دلربا مسکرا کر رہ گئی، دوبارہ آنکھیں

چار ہوتیں، تب بھی اس کا وہی عالم، اس کی [illegible] ہے یہ پہلے تو وہ البیلی نار قریب آئی اور اٹھلا کر بولی حضور ہمارے یہاں تو یہ انداز التجا کے بوس و کنار کے لئے تجویز کیا گیا ہے، پانی اوک سے پیا آپ کے ہاں جاتا ہے مانگا ہمارے ہاں جاتا ہے، گمراں گوش بھی ہو گئے تھے اور ہوائی اڈوں پر جہازوں کی روانگی وغیرہ کے جو اعلان نشر ہوتے رہتے ہیں، وہ یوں بھی ہوا ایک کے پلے کم ہی پڑتے ہیں، ماہر صاحب نے ترکیب یہ نکال رکھی تھی کہ کسی مسافر سے پوچھ لیتے، کہاں جاتے ہو، اگر منزل ایک ہی نکلی تو یہ اس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے، غسل خانہ کیا بیت الخلا تک پیچھا نہ چھوڑتے،

بیسیوں لطیفے ادھورے پونے اور چند ایک پورے کے پورے ذہن میں کلبلا رہے ہیں، مشاعرے پڑھنا اور اس کے آداب یوں تو بہت کچھ ہیں، لیکن ایک موقع ایسا بھی آگیا، جہاں ماہر مرحوم بھی دم بخود رہ گئے جب یہ اعلان کیا گیا کہ حضرات مشاعرے کی کارروائی تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کی جاتی ہے کیونکہ صدر صاحب استنجا فرمانے جا رہے ہیں

مولانا مدنی کے دستخطوں کا ایک حصہ ننگ اسلاف بھی رہا ہے، اعلان چی تے کہیں ان کے خطوط وغیرہ پڑھ رکھے تھے، مولانا کی باری آئی تو فرمایا

حاضرین اب ننگِ اسلاف مولانا حسین احمد مدنی خطاب فرمائیں گے

کاتبوں کے لطیفوں کا تو کہنا ہی کیا، ریڈیو کو رنڈیوں لکھ دیا، سر فضل حسین نے لیڈی قبول کر لی، لیڈری کا ریگانا کسے یاد رہتا ہے یہ تو عام لطیفے ہیں، ماہر صاحب کے لطیفے خاص الخاص تھے، ایک ضرورت مند دوست ماہر صاحب کی خدمت میں پریشاں حال آئے اور پانچ ہزار روپے طلب کئے، پلٹ کر کہا تو کیا کہا، پانچ ہزار آپ کو دینے کے بعد میرا بھی وہی حال ہوگا جو آپ کا ہے، کپڑے اتارنے پر پابندی ہے نہانے پر نہیں، نالہ بہ معنی کمر بند، نازنین کا قصور نہ تھا، یہ وہ لطیفے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے، کسی نے بھلائے نہ ہوں تو ماہری سلسلے میں محفوظ کر دے، ایک

لطیفہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا بھی سنایا کرتے تھے، مجھے وہ بھی یاد نہیں رہا، اور رفع حاجت والا، خود لطیفے وضع کرنے کے باوجود کہتے تھے، انگریزی میں زیادہ اچھے لطیفے ہیں، انگریز ہو گا ایک لطیفہ لیکن اپنے یہاں جو قدم قدم پر بدحواسیاں اور لطیفے سرزد ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی کیا کم ہیں، لندنی انگریز ماہر صاحب کہتے تھے، زیادہ تکلف میں نہیں پڑتا وہ اس پر بھی خوش تھے، انگریز کافی کے لئے ایک بار پوچھتا ہے، آپ نے انکار کر دیا دوبارہ ہرگز نہیں کہے گا،

ماہر کی وارفتگیٔ مزاج اور آشفتہ سری اور اِدھر اُدھر والہانہ تعلق خاطر کا پتا کسی عقیدت کیش نے چلنے ہی نہیں دیا، اور ایسا ہوتا بھی کیوں، اپنے یہاں تو ہمارا ممدوح آدمی تھوڑی ہوتا ہے، فرشتہ ہوتا ہے فرشتہ، کوئی معروف معاشقہ میرے علم میں نہیں ہے، خود مولانا نے اپنے قلم سے جگہ جگہ اشاروں کنایوں میں گفتگوئیں کی ہیں، ایک دو دن نہیں کئی کئی ہفتے مسلسل رامش و رنگ کی محفلوں اور نغمۂ مطرب کے جھمگٹوں میں گزارے، کہیں حسینوں کے ایسے جھرمٹ میں بٹھائے گئے جہاں بیٹھا ہوا دیکھ کر نوجوان رشک کریں اور اہل تقویٰ ملامت، ایسی مجبوریاں بھی پیش آتی رہیں جب طبیعت رنگین نظمیں کہنے کی طرف مائل ہوئی، صنف نازک ہی نہیں غلمان کے فتنۂ شباب کی جھلکیاں بھی بدایوں میں دیکھے بھالے ہوئے، ملوث نہ ہوئے ہوں یہ ان کی نفاست طبع کی دلیل ہے، صنف مخالف سے رغبت فطرت کا تقاضا ہے اور اس سے محفوظ رہنے کی کوئی کوشش مرحوم نے کی ہی نہیں، شادی ہوئی تب مزاج اعتدال پر آیا، مے پرستی بلکہ مے نوشی کا مزہ بھی مرحوم چکھ چکے تھے۔ راوی لوگ تو کہتے ہی رہتے ہیں، لوگوں کا کیا ہے، معتبر تو "غالباً" نہیں ہے تاہم جوش ملیح آبادی ہیں، دکن میں مدتوں ایک ہی دربار سے منسلک اور ساتھ کے "کھیلے" ہوئے، ماہر نے میدان دوسرا منتخب کر لیا، اسی زمانے میں ماہر القادری مشہور ہوئے، لیکن آگے چل کر قدرت نے ان سے خدمت دین کا کام لیا،

مرحوم سے میری کاغذی صاحب سلامت برسوں سے تھی، یہ ریاض کام آیا،

ہم کسی حد تک ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے، وہ مجھے اب جاننے پہچاننے لگے تھے، میری خاطر انہیں عزیز ہو چلی تھی، اس سے اندازہ کر لیجئے، حیرت شملوی کا غیر مطبوعہ کلام رات دن ایک کر کے دیکھا اور منتخب اشعار پر نشان لگائے تاکہ دیوان حیرت مرتب کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو آسانی ہو، وہ مجھے اپنے احباب کے ہاں ساتھ لے جانے لگے تھے، میں خط نہ لکھوں تو پوچھ لیا کرتے تھے، میاں کیوں چپ ہو، مختصر سوانحی خاکہ طلب کیا تو فرمایا، اپنے مختصر حالات کیا، آپ کو ضرورت ہو تو اپنا "ہسٹری شیٹ" بھیج سکتا ہوں، ان کے بزرگانہ رکھ رکھاؤ میں بلا کی شفقت تھی، مجھ سے یہ بھی کہا، تم بھی تو لکھا کرو لکھتے کیوں نہیں، غرض میں ان کی محبت کی زد میں آیا ہی تھا کہ وہ مخدوم تین ہفتوں کا وعدہ کر کے دیار حبیب میں حاضر ہوا، اور پھر ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو رہا، یہی وہ چاہتے بھی تھے،

ع ہم موت مانگتے ہیں دیار حبیب میں

۱۹۸۱ء

من نگر جس کی جوت سے روشن

مرنے اور جینے کی آنکھ مچولی از آدم تا ایں دم چلی آ رہی ہے، ابا مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی کی یاد میری زندگی کا ایک حصہ ہے، مرنے والے کی اپنی اولاد کے حق میں ایک خواہش ایک کوشش اور کاوش یہ تھی کہ خوب پڑھا کریں، پڑھ پڑھا کر لکھنے بھی لگیں، ادیب کہلائیں شاعر بن جائیں، یہ صلاحیتیں تو ہمارا مقدر کیا بنیں گی، ہاں! مشاہیر عصر کی خوشہ چینی کے جنون نے مجھے بزرگوں ہی کے "سایہ عاطفت" میں رکھ دیا، میرا یارانہ محمد علی صدیقی، انور شعور، سحر انصاری سے کیوں ہوتا اور شکیل عادل زادہ، جون ایلیا کو خاطر میں لانے کی تک ہی کیا تھی، میں تو رئیس الشعرا حضرت رئیس امروہوی کی گل افشانیٔ گفتار کے مزے لوٹتا رہا، وہ تو اپنا جی بہلاتے رہے اور میں نے اس "سستی تفریح" سے اور کچھ کمایا ہو یا نہ کمایا ہو، اتنا ضرور ہوا، شاعروں اور ادیبوں کا ایک خوف سا جو ذہن پر مسلط رہتا تھا وہ جاتا رہا، اسے بھرم کھلنا بھی کہہ سکتے ہیں، حضرت رئیس اپنی تمام تر آوارہ گفتگوؤں کے باوجود بے حد ذہین سیانے اور غور و فکر ہی نہیں مصلحت کے آدمی تو ہیں ہی، بزرگوں کی ہم نشینی اور دریوزہ گری میں میرا بھلا نہ ہوا، ایسی تو خیر کوئی بات نہیں بقدر ظرف و نظر استفادہ ہوتا رہا، یہ سودا اس اعتبار سے گھاٹے کا یوں رہا کہ اپنے ہم عمر ہم عصر غیر معمولی ذہین و فطین نوجوانوں سے ایک فاصلہ خود ساختہ پیدا کر لیا، یارانِ میکدہ بھی مجھے کچھ زیادہ بوجھ بجھکڑ سمجھ کر دامن کشیدہ ہی رہے، سرسری صاحب سلامت سلام دعا اور کچھ نہیں،

کوئی کتاب تھی کسی رسالے کی جستجو ایک دن مجھے جون ایلیا کے کٹیا نما کمرے میں بالآخر لے ہی گئی جو کرٹی جمی ہوئی تھی، بحث زوروں پر تو نہیں، میں نے ہی

جانا، ہو نہایت سنجیدگی سے رہی تھی، میرا کمرے میں قدم رکھنا تھا کہ سناٹا چھا گیا، سوالیہ نگاہیں بلائے بے درماں کا جائزہ لینے لگیں، مُخل تو میں ہو ہی چکا تھا، یہ خاموشی معنی خیز نظر آئی، ایک دوجے کا منہ دیکھ کر راز یہ فاش کیا گیا، مسئلہ ایک لڑکی ہے، جن کی جان پر بنی ہوئی ہے، بولو کیا کریں، مرحلہ آزمائش کا آپہنچا ہے تو پھر کیا ہوا جنسی ربط ضبط کی تحریک کر کے آزمانے میں حرج ہی کیا ہے، اس زرین اور نیک مشورے کا اعلان داغ کر میں تو چلا آیا، ردِ عمل جاننے کی میں کوشش کیوں کرتا، بے پر کی ہانک چکا اور کیا کرتا، کوئی ایسی ویسی حرکت جوان کر بھی گزرے ہوں، دل اس بات پر ٹھکتا نہیں، جوان محبتوں کی عمر کو پہنچ چکے تھے، طوفانی عشق اور وارفتہ ہنگامہ خیزیوں کا بَل بُوتا کیا تھا کیا جوان میں؟ نظر تو کہیں نہیں آیا، مدتوں بعد یہ قصہ زاہدہ کو میں نے سنایا تو صرف مسکرا کر رہ گئیں، طرح دے جانے سے بدگمانی کا حق مل ہی جاتا ہے، آپ میری تائید کریں گے،

زاہدہ عورت کا ہے کو ہیں، اچھا خاصا مردوا ہیں، بیس پچیس منٹ میں بن سنور کر ناشتے کے لئے انڈے مکھن دوپہری روٹی لینے نکل جائیں گی، بچوں کو اسکول لے جانا، کاغذات سمیٹنا اور دفتر میں صبح سے شام تک ٹکی ہوئی ہیں، پورے مردانہ جاہ و جلال کے ساتھ، شور ٹرا بیئے گا، مگر کھانا اک ذراسی ڈبیہ میں سر بمہر جاتا ہے، دفتر میں چائے کے دور چلتے دیکھ کر انگیٹھی چولہے کا یقین تو ہو جاتا ہے، اس کا کچھ علم نہیں ہے کہ سالن اور بھاجی گرم کر کے کھایا بھی جاتا ہو گا، دفتری جھمیلوں میں یہی تو ہوتا ہے، وقت ہی کی تو برکت ہوتی ہے، الٹے سیدھے پان سات نوالے زہر مار کئے، پیٹ بھرنے کو پانی بڑی مفید غذا ہے، پانی قوتِ ہاضمہ کو تیز بھی کر دیتا ہے، کھانا کھایا اور پھر جٹ گئے اسی میں شام کے پانچ بجا دیئے، برسوں کے اس معمول اور بے آرامی نے اب رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے، اوقاتِ کار کو تقسیم کرنے کا بے خیالی میں دھیان نہیں آنے دیا جاتا ورنہ دوپہر کے کھانے کے بعد اونگھے بغیر جیا تو نہیں جاتا، قویٰ مضمحل نہ تھے تو اب ہو جائیں گے، بلکہ ہو چلے، قیلولہ اعصاب کو کمزور نہیں ہونے دیتا، گھر میں

زاہدہ حنا



جون ایلیا   فنانا بنت جون، انیس جیلانی

بات بات پر جل بھن جانا، تیوری پڑھ جانا، منہ پھول جانا اور چپ سادھ لینا، یہ سب پیٹ کی خرابی کی معروف علامات ہیں، یہ خوب ہے کہ دس برسوں میں پیٹ نکلا ہوا ہم نے نہیں دیکھا، شروعات میں یونہی سی تھیں، شادی کیا ہوئی، اب تو ماشاء اللہ تین بچے بھی منہ پر تو پڑتے نہیں، کوئی کہہ دے بٹیا کے ہنوز ہاتھ ہی پیلے کہاں ہوئے ہیں تو چلیئے تخفیف سے تامل کے بعد یقین بہر حال کرنا تو پڑے گا، چھبیلی بنی ہوئی موٹر میں اڑی پھرتی ہیں، موٹر چلانا تو چلاتے چلاتے آتا ہے، زاہدہ اس فن میں بھی طاق ہیں اور مشاق بھی، اپنی گاڑھی کمائی اور نادان دوستوں یعنی اپن جانب کی پسند اور مشوروں سے خریدی گئی گاڑی صرف چلائی ہی نہیں جاتی، پہیہ بیٹھ جائے تو پوری مہارت سے زنگ آلود ساز و سامان سے اٹھا بھی لیتی ہیں، اور وہ آپ کے میاں جو ٹن کیا کرتے ہیں، بھائی شریف آدمی ہوا کھایا کرتے ہیں بات کو سمجھا کرو، جسم مشرقی انداز مغربی، پتلون شلوار قمیض ساڑھی سب چلتے اور سج جاتے ہیں، حیدر نقی کی شادی میں ساڑھی کی دھج تو میں نے بھی دل تھام کر ہی دیکھی تھی، وجاہت کا پیکر بنی بیٹھی تھیں، وہ زمانہ دوہرے جلوؤں کا تھا اور یہ حسن و عشق دھوکا ہے سب پھر بھی بیٹھے رہے اگرچہ اشارے ہوا کئے، بے ضرر صاحب سلامت، اور تو اور شرابیں تک ہوتی کی دیکھا دیکھی اڑائیں جلے ہوئے دل کو اور کوئلہ کرنے کے لئے سگریٹ بھی پھونکے، خوف اور ڈر کیسا کسی سے دبنا تو وہ جانتی ہی نہیں، پان اور پاندان کا گزر خدا جانے کیوں نہیں، خونخوار نہیں بڑی جی دار ہیں زاہدہ، پستول بندوق سے بھی بڑا لگاؤ ہے، نیر نظر سے شکار کرنے والے توپ و تفنگ پر اتر آئے یہ سانحہ خوب ہوا، ہر اچھی چیز کے لئے ترسنے اور پھر سبھی کچھ حاصل کر لینے والی زاہدہ ملنسار ایسی نکلیں، مجھے تو بارہا یہی خیال آیا مجھ میں یہ کیا شرافت ہے، مٹی جا رہی ہیں، ذرا ہمت کر لو حرج ہی کیا ہے، وہ تو میری ازلی بزدلی کام کر گئی ورنہ کیا کیا خفت نہ اٹھانا پڑتی، منہ سے منہ ملا کر بالکل پہلو میں چپک کر تو باتیں کرتی ہیں، بڑی آسانی سے سانسوں تک کا شمار ہو جائے، دل کی دھڑکنیں گن ہی کیا لو یوں کہو ایک ہو جاتی

ہیں، کوئی تحریر پڑھنا ہو کوئی بات بتانا ہو بالکل گری پڑتی ہیں، صرف باہیں ڈالنے کی کسر رہ جاتی ہے، بلکہ ایک بار تو سید قاسم محمود کے گلے میں باہیں ڈال ہی تو دی تھیں، کیا گھبرا کر پیچھے ہٹے ہیں۔ بجلی کے تار سے چھوا گیا ہو جیسے، غلط اور خوش فہمیاں پیدا نہ ہوں تو کیا ہو، میں تو جینا فریب خوردگی ہی میں پسند کرتا ہوں، بال کی کھال اتارتی رہتی ہیں، کریدتی بہت ہیں، حد ہو گئی ہماری جنسی کجرویوں کے قصے تو لطف لے لے کر گرہ میں باندھ لئے اور اس کے اُس کے کان میں بھی ڈال دیئے، اور خود سر شام منہ لپیٹ کر پڑ رہنا، ہوں نہ ہاں، جوّن ہیں کہ تڑپ رہے ہیں شعر میں سوز غم ڈھال رہے ہیں، اُس کا کہیں ذکر نہیں، میرے خورد بینی مطالعے سے بچ نکلنا خاصا مشکل ہے، زاہدہ پر جھاڑنے والوں نے آٹھ ہی برس کی عمر میں عشق جھاڑ دیا تھا اور یہ خود دسویں سال تک پہنچتے پہنچتے مبتلا ہوئیں، عمر ہی کیا تھی کیسے کہتیں کیا کہتیں، قیس کو لیلیٰ اور لیلیٰ کو مجنوں دل کے آئینہ خانے میں بجاتے بگاڑتے یہ عمر ہو گئی، درد رگِ جان بن کر رہ گیا، آنکھ سے لہو بن کر نہیں ٹپکا، اہل نظر کی یورش سے محفوظ رہنا کہاں ممکن ہے، دو چار ایک نے تو اپنی دنیا ہی تباہ کر لی، لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوئیں وہ تو خیر اہل دل تھے، جوّن کے دوستوں نے کب بخشا، خدا نظر بد سے بچائے پوری ایک فوج ظفر موج ایک سے بڑھ کر ایک من موجی ایک قطار لگی ہوئی، گھنٹوں دھرنا دے کر بیٹھ جانا معمول بن گیا، دھونی رمائے جاتے ہیں، رال ٹپکی پڑتی ہے، فرداً فرداً سبھی غرّائے، ایک ایک گھر کی کام کرتی رہی، کانٹے کی لڑکی صحیح سلامت نکل گئی، کوئی ترغیب کوئی تحریص کارگر نہ ہوئی، سبھی کا کچا چٹھا جون کے گوش گزار ہوتا رہا، وہ ایک وضعدار کسی سے کیا بگاڑتے، شکوۂ یاراں کو غبار دل میں پنہاں کر لیا، اس لئے کہ غالبؔ نے کہا ہے ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا،

تصویر کائنات میں رنگ بھرنے والی قوم، میزبان تو ہوتی ہے، مہربان بھی کہہ سکتے ہیں، یہ کیا ہے کہ مہمان نواز نہیں ہوتی، مسکراہٹ میرے آپ کے جہر دل

پر کھیل رہی ہے، یکساں اور مشترک، اس میں طنز سے زیادہ شکست خوردگی نمایاں ہے اور اسی میں ایک لطف بھی ہے، میں نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی، اپنے اور بہت سے نیک بندوں کے تجربات کی روشنی میں یہ "حکیمانہ" نکتہ بلکہ فتنہ اٹھا رہا ہوں، شوہر کے دوستوں کا بیویاں باورچی خانوں کے پانی پت میں جو حشر اور تکا بوٹی کرتی ہیں، وہ کوئی راز کی تو نہیں ڈھکی چھپی ہوئی بات کہہ لیجئے کہ ہے، کیفیت کی ذرا سی خرابی بڑے بڑے طوفان اٹھا دیتی ہے، بھونچال آجاتا ہے، ہزاروں کوسنے لعنت پھٹکار، یہ ہماری تہذیبی زندگی کا خاصہ ہے، لیکن صورتحال اس کے برعکس اور مربیانہ ہو تو استعجاب بالکل فطری ہوگا، زاہدہ کو کھانے پینے کا شوق بھی ہے اور ذوق تو ظاہر ہے، ہے ہی، ادھر ہمارا ورود مسعود کراچی میں ہوا اور کھانا کھانے کے تقاضے ہونے لگے، تنہا ہم کبھی گئے نہیں، ایک پیٹو دوست ہمیشہ ہمارے ہم رکاب رہے، امام بخش سو مرد حق نمک ادا کرنے کا گُر خوب جانتے ہیں کھا کھا کر ہلکان ہوتا صرف انہی حضرت کو دیکھا ہے، دعوتیں مسلسل ہوتی ہیں، کراچی جانا شرط ہے، صاف ستھرے اجلے قیمتی غیر ملکی برتنوں میں انواع و اقسام کے کھانے یہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ، کم نہیں زیادہ کھاؤ، کھلا کھلا کر نڈھال کر کے ہمیں گھر سے نکالا نہیں جاتا، اماں بھائی قیلولہ بھی یہیں کرلو، شام کی چائے پی کر نہ ٹلتے تو کیا کرتے ہنس مکھ خوش خلق سیر چشم دل بڑا دستر خوان وسیع کیوں نہ ہو، میں نے تو نہیں دیکھا فرماتی ہیں سالن پکا لیتی ہوں اور خوب مزے کے، اجن نے لقمہ ہاتھ میں لیتے ہی کہا یہ روٹی تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی نہیں ہے، ہاں میری طبیعت ٹھیک نہ تھی بوا نے پکائی ہیں یہ روٹیاں، دیسے گھر اور باورچی خانہ سنبھال تو امی ہی نے رکھا ہے، یہ پکاؤ، وہ انگیٹھی کیا ہوئی، یہ دیگچہ چڑھاؤ، بچوں کے پوتڑے بدل رہی ہیں، دودھ پلا دوں اسے، بوا یوں نہیں یوں صفائی کراؤ گھر کی، چلو ہٹو تم سے نہیں آتا ہم خود کر لیں گے، یہ بوا امی کو جہیز میں ملی تھیں، صابر و شاکر بوا، ماں سے زاہدہ کی چخ دقفون سے رہتی ہی ہے، جلی کٹی سنی سنائی جاتی ہے، امی نہ ہوتیں تو زاہدہ اتنے پر پرزے کیا نکالتیں،

جون کی شادی میں رئیس صاحب کو چاہیئے تھا کہ مجھے بلاتے، نہیں بلایا گیا، پھر کچھ اچانک ہوا یہ واقعہ، لڑکی والے سنی العقیدہ ہیں، لڑکا شیعہ ہے، یہ کچھ ایسا جھگڑا چلا تو تھا، وہ بھی مسئلہ تھا حل ہوا، نکاح ہو گیا لڑکی بیاہ کر سسرال آ گئی رئیس صاحب نے لکھا چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا، تمہیں بلایا ہی نہ جا سکا، جہیز میں لڑکی کتابیں لائی ہے، اس سے اچھا اور کیا ہوتا، جواب آیا میں بُرا کب کہتا ہوں لیکن تھا یہ سب کچھ مذاق ہی، میں نے سنجیدگی سے لیا تو حضرت رئیس امروہوی چپ ہو گئے، جون کا کوئی گھر گھاٹ تو تھا نہیں، گارڈن ایسٹ کے بڑے بنگلے کو دونوں بڑے بھائیوں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا، ایک ذرا سا کمرہ جون کے قبضے میں تھا، عباس کھلے برآمدوں میں زندگی کرتے چلے آ رہے ہیں، اور کیا ہوتا ان رنڈووں کے لئے، یہ تو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا، اچانک جون میں حرکت پیدا ہو گی، زاہدہ کا سسرال ہی کیا تھا، ایک طرف بیگم رئیس اور بیگم تقی میں جنگ زاہدہ سے بھی دونوں کی ٹھن گئی اور دو چار مہینوں میں جون زاہدہ کے ہاں منتقل ہو گئے، گویا گھر داماد وہاں زاہدہ کے گھر میں کون تھا ایک بہن ایک بھائی ماں اور بوا، بوا کا بیٹا بھی جون یہاں آ کر زاہدہ ہی میں کھو گئے، کھونا چاہیئے بھی تھا، لیکن یہ کھو کر پائے نہیں گئے لاکھوں اشتہار گمشدگی کے چھپے لیکن موصوف نے ہل کے نہیں دیا، شراب اب ہنگی ہوئی ہے، ہنگی سستی باقاعدگی سے ملنے لگی اور زاہدہ پر تصرف تو اب عام تھا ہی،

مفلسی اور ناداری، بے کسی اور عزت کے افسانے لکھنا اور پڑھنا اور ہے دو چار ہونا ذرا مختلف بھی ہے جان لیوا بھی، یہ سارے مزے ہماری زاہدہ چکھ چکی ہیں، چکھتی رہتی ہیں، بڑے باپ ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے جو کچھ کیا کرتے ہیں وہی کچھ زاہدہ کے ابا نے کیا، اچھے دن دیکھے ہوئے برے وقتوں کو بھی بھگت گئے، جاڑے کی طویل راتوں میں ٹھنڈی راتوں میں چار چار بجے صبح اٹھ کر زاہدہ کو پڑھاتے رہے زاہدہ پڑھتی رہیں، گرتے پڑتے میٹرک پاس کر ہی لیا اور وہیں کے وہیں اسکول کی وزارت خزانہ میں تقرر بھی ہو گیا، یہ بہت اچھا ہوا، کچھ پیٹ پالنے کا سامان

تو ہوا، ایک سو پندرہ روپے ماہانہ نعمت غیر مترقبہ سے کم تو نہ تھے، بی اے تو کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، بی اے ہی نے کہیں کلرکی تک پہنچایا، اخبار خواتین، وائس آف امریکہ اور مشرق کی کالم نگاری اور اچھی خاصی یافت سے نکل کر عالمی ڈائجسٹ کی ادارت تک پہنچیں، نہ منزل نہ مقصود، بجز اس سے میل جول کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا، زاہدہ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو عالمی ڈائجسٹ پر صرف کر دیا، ایسی لیپا پوتی کی کہ ایک بار تو دھوم ہی مچ گئی، ملنگوں کے ہاتھ کی چنیر پیکر نسوانیت کے ہاتھ لگی تو ساری کھردراہٹ جاتی رہی، یہ سب کچھ تھا، مگر اشاعت بڑھی نہیں گھٹی، عروج ایسا بھی نہ تھا کہ زوال پذیر ہو کر دم لیا جائے، لیکن خوبی وقت دیکھئے، ایک لاہوریئے سید قاسم محمود کے بھتیجے تنہا زاہدہ نہیں بھائی عباس بھی برابر کے حصہ دار تھے وہ بھی بہتر گئے، پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے، رسالے کا ہڈا ہی بگڑ گیا، تصویروں اور اوٹ پٹانگ تحریروں بناؤ سنگھار نے عالمی ڈائجسٹ کو تیسرے درجے سے بھی نکال کر تیسری جنس میں لا کھڑا کیا، اس نے تو مکمل قبضے اور ہضم کر جانے کا ڈول ڈال دیا تھا، بارے بیس پچیس ہزار ڈھیر ہو کر افتاں و خیزاں کشتی ڈوبی نہیں ساحل آشنا ہو ہی گئی، بھائی عباس بھی دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے، یہ بھی ممکن ہے کر دیئے گئے ہوں، پوچھو تو کوئی بتاتا تو ہے نہیں، آج تک دعوے سے میں تو نہیں کہہ سکتا عالمی ڈائجسٹ کا مالک کون ہے بظاہر زاہدہ ہی ہیں، اور اسی سے گھر چلتا اور پیٹ پلتا ہے، الّلے تلّلے بھی بہت ہوئے، گھربار ہے صوفے آئے قالین بچھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیسہ آیا تو رشتے دار بھی آئے، لوگوں نے بھی پہچانا،

یہ تو سب کچھ ہوا لیکن زاہدہ کا کیا ہوا، مقصود حیات نری کھری صحافت ہوتا تو افسانہ نگاری کی وادیوں میں بھٹکنا کہاں سے نکل آیا، میں سمجھتا ہوں زاہدہ افسانہ نگاری میں ممتاز ہونا چاہتی ہیں، میں نے ان کے افسانے ان کی زبانی بھی سنے ہیں اور "قیدی سانس لیتا ہے" میں پڑھے بھی ہیں، علامتی انداز نگارش کی گرفت کہیں کہیں بے حد مضبوط نظر آئی عموماً ڈھیلی ڈھالی، گہرے تجربے تو سبھی ہوتے ہیں،

P.O. Box: 11126, Gulshan-e-Iqbal, Karachi Tel: 461702 = 463609

[illegible] آداب

[illegible]

[illegible] —

آپ نے لکھا [illegible] — سب اچھا تھا —

آپ نے لکھا ہے [illegible] آپ جو تماشا [illegible]

آپ کے [illegible] آپ جو تماشا [illegible]

[illegible] — اگر [illegible]

[illegible] آپ [illegible]

[illegible] دل [illegible]

[illegible] تماشا ہے —

آپ نے [illegible] صاحب [illegible]

آپ کے [illegible] کا مسودہ [illegible] دیا تھا — اگر کبھی موقع ملے

تو پڑھیے اور دیکھیے گا —

گذشتہ دو مہینے سے [illegible]

آج کل ہسپتال میں ہوں [illegible] — گرمی [illegible]

[illegible] جاتا ہے —

اور کیا لکھوں —؟

مخلص

[illegible]

۱۲-۳-۸۳

یہ تو بہت پڑھی لکھی ہیں، بہترین مصنف، اعلیٰ درجے کی مترجم، اداریہ نگاری کا فن
بھی جانتی ہیں، اور بڑی بات چھوٹے اور عزیب لفظوں میں ادا کرنے کا سلیقہ بھی
ہے، عورتیں عام طور پر وہ جو مکھی پر مکھی مارا کرتی ہیں وہ بھی یہاں نہیں ہے، اسلوب
بیان اور انداز خط مردوں سے ملتا جلتا، انداز تحریر کاتبانہ، سطریں بالکل سیدھی،
شاعر اور نثر نویس، جونؔ اور زاہدہ کی جوڑی تو خوب ملی، لیکن عالمی ڈائجسٹ
کا زنگ بڑی حد تک زاہدہ کو لگ ہی گیا، عالمی ڈائجسٹ میں انہماک کو میں نے ہمیشہ
گہری نظر سے دیکھا، ایک دن پوچھ ہی بیٹھی تھیں، میں نے کہا، دیکھ میں یہ رہا ہوں
مردوں کے کام عورتیں کس طرح کرتی ہیں، عورت مغربی ہی کیوں نہ ہو مرد کا سہارا
تو اسے چاہیئے ایک نہ ایک دن، زاہدہ کو یہ آسودگی میسر نہیں ہے، نون تیل لکڑی
کے غم میں گھلتی رہتی ہیں، جونؔ آزاد منش لاابالی اپنی ذات میں گم، زاہدہ ان کے
ناز اٹھاتی بہت ہیں، اس کے باوجود دو چار مقام رہروان عشق کے لئے ایسے بھی
آئے، قطعی علیحدگی، طلاق ولاق، زاہدہ تو ہیں ہی کماؤ پوت، جون ڈھیلے پڑ
گئے، کس دل اور منہ سے بنا بنایا کھیل بگاڑتے، بقول زاہدہ قطع تعلق چاہا لیکن
جون کی ضد اور انا ہمیشہ آڑے آئی، شائد وہ اس خیال کو گوارہ نہیں کرسکتے کہ جو وجود
ان کی ملکیت رہا ہو وہ کسی اور کی ملکیت میں چلا جائے، دراصل یہ شادی جونؔ
کے لئے بعد از وقت اور زاہدہ نے اللٹپ کر ڈالی، شخصیتوں کی ٹکر، یہ کچھ انا کی کارستانی
عمر کا تفاوت جانگداز نکلا، ہم سن شوہر ہو تو دو چار سال تو کھیلتے کودتے چھیڑ خانیوں
اور حوصلے نکالنے ہی میں نکل جاتے ہیں، محبوبیت کا عالم رندانہ عاشقانہ اور فاسقانہ
بھی ہو سکتا ہے، میاں بیوی کا رشتہ سبھی فلسفوں کو معدوم کر دیتا ہے، اور یہاں تو ایک
طرح کی شفقت بھی شاملِ حالِ زار ہے، جونؔ زاہدہ بچوں کی زنجیر میں بندھ چکے ہیں
وہ تو ٹوٹنے سے رہی، فنانا، سہینی دو بچیوں کے بعد ولی عہد بہادر کی آمد، واللہ
بیٹیوں کے نام چونکہ وہ مجھ سے بہت مانوس ہیں تو یاد رہ جاتے ہیں، صاحبزادے
کا نام بلکہ اسم گرامی بے حد ثقیل ہے اور وہ نچلا بھی کہیں بیٹھے تو میری کھوپڑی میں

بھی بیٹھے۔

قد بڑا نہ چھوٹا، درمیانہ، درمیانے سے مراد میری ہم قد ہیں، پانچ فٹ چار انچ پاسپورٹ پر ناپ تول کے بعد ہی اندراج ہوا ہوگا۔ دہیں سے ہمیں نے اس لئے پھرایا کہ یہ دور اعداد وشمار کا ہے، لیکن یہاں بات قد سے نکل کر کمر تک پہنچنے کا چلن ہنوز عیب ہے ہنر نہیں، چہرہ کتابی متبسم بھی اور معتبر بھی، بھرا ہوا جسم جیسے گھٹنے بڑھنے سے روک لیا گیا ہے، پیشانی تنگ، دماغ کھلا ہوا، ذہن بیدار، آنکھیں غلافی، نظر کا چشمہ تصویر اترواتے وقت بھی نہیں اترتا، ناک موٹی مگر چپٹی نہیں پھلکی نہیں، ہونٹ رہ کھے نہ رسیلے البتہ باتوں میں رس گھولتے ہوئے، دانت صاف ذرا نکلتے ہوئے موٹے موٹے رنگ سانولا سلونا بے حد نمکین، لباس سادہ اور نفیس، آئے دن نئی نئی تراش خراش کے ملبوسات زیب تن چھینٹ کی باریک قمیضوں کی حد تک تو خیر ٹھیک ہے چل جاتا ہے لیکن یہاں چھینٹ کی شلواروں سے ٹانگیں جھلکتی ہوئیں، کپڑے ہوں گھر کے استعمال کی دوسری چیزیں ہر جگہ زاہدہ کی نفاست اور اعلیٰ پسند کی چھاپ نمایاں، دوسرے درجے کی چیزیں کم، کاغذ بھی عمدہ مگر قلم تیسرے درجے کے نہایت گھٹیا، بال پوائنٹ بھی کوئی لکھنے کی چیز ہے، لٹھ گھمانا پڑتا ہے، نہایت خوش خلق کامی اور انتظامی امور کی ماہر، خلائق کے ہجوم میں گھر کر چلنے کا حوصلہ اور دلولہ، اردو تحریک بھٹو دور میں چلی، زاہدہ بھی مظاہروں میں پیش پیش، قیادت کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں، میرا خیال وہی ہے، بے جوڑ شادی جھنڈی کا جھان، سارے کس بل نکل گئے، دفتر کے ساتھیوں میں خوب گھل مل کر رہنا، تیور مربیانہ اور حکیمانہ، مساویانہ سلوک، مل جل کر کھانا پینا، دکھ سکھ میں شریک عزت اور احترام کی فراوانی، کارکنوں کی ذاتی زندگی کے مسائل سلجھانے سے آنکھیں نہ چرانا، دکھ درد بانٹے حوصلہ دیا اور بڑھایا آگے پیچھے نہیں رہنے دیا، دبا کر رکھنے کا گر نہیں جانتیں، محبت ہی محبت، خلوص ہی خلوص بے ریائی وصف خاص ہے مردم شناسی کا جوہر برائے نام، غیر ضروری اعتماد مزاج کا خاصا تو شائد نہ ہو لیکن جہاں یکتائی اور تنہائی کا عذاب جاری وساری ہو وہاں اور کیا کیا جائے، منڈی سے

کاغذ خریدنا اشتہارات کا حصول اور دیتوں اور سلسلے، کہاں تک چلے گی مردانگی،
سہارے تو ڈھونڈنا ہی پڑتے ہیں، شوہر بھائی بہنوئی دست و بازو چاہا تھا کہ بن جائیں
یہی نہ ہوا، سب سے بڑا عذاب حصول معاش، اس کے باوجود خلاقی اور دراکی کے
جوہر کھلتے رہتے ہیں، گفتگو ہی نہیں قلم بھی غضب کا بیباک ہے، نشانہ جنس مخالف
ہی کو بنایا جاتا ہے، مرد کیسا کچھ خودغرض اور حرص و ہوا کا پتلا ہے یہ خاص موضوع
ہے،

پاکستان اور زاہدہ ہم عمر ہیں، ہم عمروں میں گاڑھی چھننا چاہیئے لیکن یہاں
مادر وطن سے یک گونہ، احتراز ہی پایا میں نے تو، اس ملک کے معرض وجود میں
آنے کے محرکات پر جم کر ہمارا تنگ ظرف تنگ نظر مولوی بولتا ہی کب ہے، مفروضات
میں قومی زندگی تباہ کردی، ہماری قیادت خودغرضیوں کی پوٹ رسوائے عالم چلی
آرہی ہے، مسلم لیگ اپنا کیا دھرا بھول بھال کر ایک طرف ہو بیٹھی، نوجوان نسل
کی برگشتگی، خاطر کا جائزہ لینے والے کیا ہوئے، عقیدے کے لحاظ سے زاہدہ ملحد
ہیں موحد ہوتیں تو بیل بھی جاتیں، روحانیت سے کوسوں دور خدا واسطے کا بیر،
مادیت اور روٹی کپڑا اور مکان کی علمبردار، ہندی دیومالائی تہذیب پر جان چھڑکتی
اور جھنڈے گاڑتی رہتی ہیں، مذہبی ہوں سیاسی ہوں، اپنے عقائد میں پختہ مگر
انتہا پسند نہیں ہیں، سنانے کے ساتھ ساتھ سنتی بھی ہیں، مسلمان کی خرابیوں کی تہمت
اسلام پر لگانا قرینِ انصاف تو میں سمجھتا ہوں نہیں ہے،

ہماری آر جار بڑھتے بڑھتے ڈیرے ڈالنے تک پہنچی، رات دن کا اٹھنا بیٹھنا
رہنا سونا کھانا پینا، کھلا ہوا تو ہاتھ ہے ہی زاہدہ کا، روپے پیسے کی ریل پیل ہو تو جی
چاہے گھر اجاڑ دیجئے، ذرا ہاتھ اپنی شاہ خرچیوں کے طفیل تنگ ہوا اور یہ آگئیں مکھی چوسنے
پر، دو انڈے کیوں ایک کھائیے، خدا کے لئے ابھی تو دھلوایا ہے یہ بدبخت قالین،
جوتے اتار کر بھی تو بیٹھا جا سکتا ہے، پاؤں اوپر رکھنے سے صوفوں کا یہ ہلکا رنگ ہی
بدل جائے گا، ہائے اللہ قلم کھول کے تو نہ رکھیئے اور جھٹکئے گا نہیں ادھر اُدھر

چھینٹے اور داغ دھبے پڑ گئے تو سب رنگ و روغن یہیں دھر دالوں گی، یہ سب ہنسی کھیل میں ہوتا ہے بظاہر "ذری ذری" بات پر ایسی کڑی نظر رکھنا اور خبر لینا توبہ ہے بھاڑ میں جائے یہ مفت کا کھانا اور رہنا، ہم تو مردانہ نشست و برخاست کے آدمی اور عادی ہیں، میری وہ نیم مردہ سی قبا ئلیت کیا آسودہ ہو گی یہاں، چلو ہٹاؤ زیادہ مجبتیں نہ۔ گھار وکیسی اسیری کہاں کی رہائی، بہت ہو چکا، سمیٹو اپنا بوریا اٹھاؤ اپنا بستر، یہاں تو ملین میخ نکلے گی، کیڑے ڈالے اور نکالے جائیں گے عورت ہیں نا آخر بہارن کہیں کی۔

۳/ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء

ہمارا ہم عصر کھوجو

موا کا گھر ہو دلوں پر غم کی گھٹا چھا رہی ہو برس رہی ہو دل ڈوبا ہوا ہو احساسات رنج والم میں لت پت ہوں آدمی نڈھال اور چور چور ہو ٹوٹ پھوٹ بے طرح ہو چکی ہو فضا حزن وملال کے گرد وغبار سے اٹی ہوئی ہو جبر وضبط اور وضعداری کی کرشمہ سازی دیکھئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بڑی ہی متانت سے بتایا گیا میرے بیٹے کی جدائی پر آج دوسرا یا شاید تیسرا دن ہے یہ سن کر میں تو سن سے رہ گیا بلکہ وہ جو کہتے ہیں میرا کلیجہ چھن سے ہو کر رہ گیا کچھ بھی نہ کہا گیا ہاتھ البتہ دعائے مغفرت کے لئے اٹھنا ہی تھے اور جب میں اٹھنے لگا تو ایک کمال اور ہوا مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مسودے کا وعدہ تھا آپ سے وہ تو لیتے جائیے مجھے اور چپ لگ گئی اور دل کی حالت دگرگوں ہو کر رہ گئی وہیں کے وہیں عطا کردہ مخطوطے پر لکھ بھی دیا

"حضرت سید انیس شاہ جیلانی جنہوں نے اپنے خلوص و محبت سے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے ان کی خدمت میں میں یہ مسودہ نذر کر رہا ہوں یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں پہلی بار طبع ہو چکی ہے دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے اس میں حک و اضافہ بھی کیا ہے انشاء اللہ وہ مسودہ بھی حضرت جیلانی کی نذر ہوگا

آج کا دن میرے لئے رنج واندوہ کا دن ہے حضرت موصوف میرے پاس تعزیت کی تقریب سے تشریف لائے میرا جواں سال فرزند اکبر زبیر حسن قادری اچانک ۲۸ مئی ۷۵ء مطابق ۱۶ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ بروز بدھ رحلت کر گیا اور آج اس کا سوم ہے فقط

نذر گزار محمد ایوب قادری

۳۰ مئی ۷۵ء

مطابق ۱۸ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ

بروز جمعۃ المبارک

ہمارے ذوقِ مطالعہ اور ان کے مشغلۂ تصنیف و تالیف کی عمر ایک ہی ہے' وہ (مرحوم) تو مولوی لیکچرر اور بالآخر ڈاکٹر محمد ایوب قادری بن گئے ہم سے البتہ حاشیہ نشینی کا حق بہرحال ادا ہوتا رہا۔ یہ کمال بھی ہمارا کم ان کا زیادہ تھا' معمولی مراسلت کے جواب میں وہ بہ نفسِ نفیس میرے ٹھکانے تک آپہنچے تھے' کہتے تھے میری صحت ٹھکانے لگی تمہارے چھوٹے سے کتب خانے مبارک اردو لائبریری میں دو ایک چیزیں بڑی دیکھنے کو مل گئیں' مرحوم جہاں کہیں کتابوں کی سن گن پاتے اپنی پوٹلیا بغل میں دابے نکل کھڑے ہوتے اور استفادہ کرکے ہی دم لیتے' پاکستان کے بیسیوں برسوں گم نام خانقاہوں کو نامور کرگئے' خود وہ اچھے خاصے زود نویس تو تھے ہی' اخذ و استفادے کی قوت بھی کچھ کم نہ تھی' وہ بڑی بے تکلفی سے مخطوطات تک کا مغز نکال کر الگ کرلیتے تھے اور اپنے مضامین میں کھپایا کرتے تھے' اور تو اور مجھ میں آئیں نہ آئیں سندھی سرائیکی مخطوطات کو بھی ٹٹولنے بیٹھ جاتے تھے' یہ کیا ہے یہ کیوں ہے' اِس سے اُس سے پوچھتے رہتے تھے' انگریزی عربی فارسی پر فاضلانہ گرفت تھی' فارسی سے اردو میں منتقل کرنے کا گُر وہ خوب جان گئے تھے' ناشرین اُن کے ترجمے شوق سے شائع کرنے لگے تھے' ان کے ذہن میں بھاری بھرکم کتابوں کو اردو میں منتقل کردینے کا ایک بڑا منصوبہ بن چکا تھا اور وہ ہر وقت ہر جگہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے منصوبے بناتے رہتے تھے' کبھی کبھار مجھ سے بھی کھل جاتے اور جب میرے چہرے پر خفا ہونے کے آثار بھانپ جاتے تو چپ ہو جاتے' وہ چپ ہوتے تو میں کریدنے بیٹھ جاتا' وہ بخل نہ فرماتے اور امہات کتب کی خوبیوں اور خامیوں سے میری معلومات میں اتنا اضافہ کردیتے کہ میں بھی ان کتابوں کے نام لے لے کر ادھر ادھر رعب گانٹھتا پھروں' ان سے کوئی چیز چھپائی نہیں جاتی تھی'

وہ دیوبندیوں میں دیوبندی' شیعوں میں شیعہ' اہل حدیثوں میں اہل حدیث' پرویزیوں میں بھی گھلے ملے رہتے' ندویوں میں ندوی' مرزائیوں سے بھی حسن سلوک اور گپ شپ' غرض وہ سب کے بنے رہتے تھے' لیکن یہ تھا کہ وہ تھے بریلوی مکتبِ فکر سے متعلق' ایسے ویسے نہیں مولوی نہیں داڑھی منڈے کٹر ملا' بس چہرے پر یبوست نہ تھی' بشاشت تھی' صوفیانہ مذاق بھی تھا' مزاج بھی مذہبی معاملات میں تنگ نظری چھوکر بھی نہیں گئی تھی' ہر طرح کے مسائل پر نہایت خندہ پیشانی سے گفتگو کیا کرتے تھے' تیوریاں نہیں چڑھاتے تھے' بات کو بہت کچھ آگے بڑھاتے تھے بلکہ لطف لینے کے لئے چٹکلا دیا کرتے تھے' یہ بعد میں میں نے پایا کہ اس طرح وہ اپنے ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کیا کرتے تھے' اور

ناقص مواد کی دراڑوں کو بھرا کرتے تھے، اور یہ سب چالاکیاں بڑی ہی معصومیت سے ہوا کرتی تھیں، مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، اور وہ اس عالم میں بہت ہی تو یہی کہوں گا پیارے نہ سہی اچھے ضرور لگتے تھے۔

علمی ادبی جلسوں کے علاوہ بھی وہ قد کاٹھ کے اعتبار سے معتبر لگتے تھے، اچھا خاصا قد تھا، مجھ سے تو بہرحال لمبے تھے، جب میرا شمار ٹھگنوں میں نہیں ہے تو انہیں کون بونا کہے گا، چہرہ کتابی سے ملتا جلتا اور بھرا ہوا، اس سے آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گوشت میں دھنسی ہوئی سی ذرا سی، چشمہ تو اب لکھنے والوں کے لئے لازم و ملزوم سے ہے، جو بڑا ڈبل تھا اور صحت اتنی اچھی کہ اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتے تھے، سر کے بال پچاس کے پھیر سے نکل چکے تھے پھر بھی گھنے اور سلامت، ۱۹۳۲ء میرا سال ورود، ۱۹۲۲ء ان کا سال پیدائش، مجھ سے دس برس بڑے تھے مگر دیکھنے والا برابر سرابر کا جانے بلکہ میں ہی کچھ بڑھا بڈھا لگتا تھا ان کے سامنے، رنگ البتہ میرا کھلتا ہوا ان کا سیاہی مائل، مگر ایک جاذبیت تو چہرے مہرے پر ضرور تھی، کچھ توند بھی نکل آئی تھی (یہ لفظ) ہضم میں گڑبڑ کا شاخسانہ تھا، اس پر انہیں قابو نہ تھا، کھانے پینے کا ہوکا نہ سہی نا انصافی بھی تو نہیں کرتے تھے۔

تم لکھ سکتے ہو، لکھا کرو، لکھتے کیوں نہیں، میں سنتا رہتا تھا وہ کہتے رہتے تھے اور پھر ایک دن حکم جاری کر دیا، سہ ماہی "العلم" کا غالبؒ نمبر میری نگرانی میں چھپ رہا ہے، لہٰذا اب یہ موقع نکل آیا ہے تو لکھو کوئی نہیں چھاپتا، دیکھتا ہوں کیسے چھاپتا ہوں، نہیں نہیں، ایک تو "العلم" (کراچی) دوسرے غالبؒ، دونوں بھاری بھرکم، چوم کر چھوڑنے کی اجازت نہ تھی، یاروں نے کوئی پہلو رہنے ہی کب دیا تھا، میں نے دو اچھی باتیں دیکھ کر غالبؒ کی دشنام) طرازیوں زیادہ آسان زبان میں گالیوں کا مرقع تیار کیا، جتنی گالیاں انھوں (مرحوم) نے اپنے قلم کی زبان سے بکیں تھیں سمیٹ اور حاشیہ آرائی کر، "کتنے شیریں ہیں تیرے لب" عنوان باندھ قادری صاحب کے حوالے کر دیں، اور وہ بڑے طمطراق سے چھپ بھی گئیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا کہ وہ جو غالبؒ نے کتنے انگریزی لفظ اپنی اردو میں استعمال کئے "کتنا بکا کتنا تھوکا" ہر طرح طرح کی خامہ فرسائیاں کرتے رہتے ہیں اس نئے پہلو کو خاطر میں نہ لائے، نہ لائیں ہمیں اس سے کیا، مقصود اصلی امتثال امر کے طور پر شہیدوں میں نام لکھوانا تھا سو وہ ہوا۔

میں نے جب بھی کوئی الٹی سیدھی بات لکھی، ذکر مرحوم سے بھی آیا، اب تقاضے یہ کہ فوراً بھیجو، بلا تاخیر

بھیجو؟ اب میں لاکھ کہوں حضرت وہ ہے ہی کیا؟ بس یونہی بیکار سی باتیں ہیں، لیکن وہ پڑھے بغیر مانتے نہ تھے۔ ان کا آخری پھیرا لاہور سے واپسی پر حیدرآباد کا تو تھا ہی اس لئے کہ میرا "سفرنامہ" منصوبہ ہندوستان نامکمل ہی کیوں نہ ہو پڑھ ڈالیں۔ پڑھا اور داد دی۔ میری حیثیت چونکہ طالب علمانہ ہے، اس لئے قدر شناس میں نے یہ بھی لگا دی تھی کہ رسمی نہیں سچی اور بے لاگ رائے ہو۔ اس لئے منافقت سے پاک ہی رہی ہوگی وہ رائے اور داد۔ ویسے حروف لکھنے والوں کے لئے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ لکھوا اور حوصلہ افزائی لکھو۔ بہت سی کتابوں کے اندرون سرورق آپ نے پڑھے ہی ہوں گے۔ کیا ہوتا ہے ان میں؟ یہی تو ہوتا ہندوستان کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی کہتا چلوں یہ جو بچارے "بھائی بند" کہتے رہتے ہیں، پاکستان بن کیسے گیا، پاکستان بنا کیوں گیا، ان سے بحث اور تکرار فضول ہے۔ بس ایک پندرہ واڑے کے لئے ہندوستان کی سیاحت کا انتظام کر دیا جائے ان کے لئے۔ "سب کچھ آئینہ ہو جائے گا"

علی برادران کے مولانا محمد علی کو نہ ہم نے دیکھا نہ سنا، یونہی کچھ ادھر ادھر سے پڑھ پڑھا رکھا تھا۔ قادری صاحب کا اصرار جب حد سے بڑھ چلا تو ایک ڈیڑھ صفحہ ہم نے بھی لکھا اور وہ "برگ گل" میں چھپا بھی۔ داد بھی ملی۔ وہ میرے نہیں ایوب قادری کے کھاتے میں جانی چاہیے۔ وہ نہ لکھواتے تو میں کیسے لکھتا۔ بہادر یار جنگ جیسے توپ لوگوں پر بھی لکھو۔ بس ایک رٹ لگا دی۔ میں نے کتابیں جمع کر لیں، پڑھنا شروع کر دیا۔ ہوتا یہ ہے کہ میں پھیل پھیل جاتا ہوں، ذرا سی بات ہو تو سینکڑوں ماخذ ذہن میں گھومنے لگتے ہیں، دوستوں کے کان کھا جاتا ہوں، جس کر و فر سے بات اٹھاتا ہوں پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہانپ کر رہ جاتا ہوں جھاگ کی طرح بیٹھنے لگتا ہوں۔ وہی ہوا، اور وہاں بہادر یار جنگ نمبر چھپ کر بھی آ گیا، بازار میں، مجھ تک نہیں۔ اور میں یہاں کیسے اور کیونکر میں پڑا رہا۔ قادری صاحب ملے تو شکوہ سنج۔ میں نے کہا حضور ہم اگر لکھتے تو کچھ ویسا ہی لکھتے۔ کھل اٹھے اور چہک کر کہا، یہی تو ہم چاہتے

بدھ مت، ہندو مت، عرب آئے، مغل آئے، مغلوں نے کم اور صوفیا نے اسلام کا جھنڈا زیادہ لہرایا اور عام کر دیا۔ اعتقاد کا ایک اور طرح کا مذہب ہوتا ہے، اس میں مصلحت کی در اندازی کم پایا ملتی ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں جگہ جگہ جرم ضعیفی کی سزا بن کر انگریز آیا، سرسید کی علمی عملی تگ و دو کد و کاوش، بصیرت اور حکمت رائیگاں نہیں گئی۔ کہیں سو برسوں میں انگریز ٹھکانے لگا، ہندو کے دل

میں گرہ صدیوں کی پڑی ہوئی، مسلمان ایک روادار اور بے خبر، ہندو نے انگریز کو اپنا جانا اور مانا، بولنے چالنے کا یہ موقع اچھا ہاتھ لگا، محمد علی جناح کے چودہ نکات اٹھا کر دیکھئے، ان میں رکھا ہی کیا ہے، وہاں اکثریت کی ہوا ضرورت سے زیادہ بھری ہوئی، مسلم اقلیت کے چیدہ چیدہ لوگ بھی تھے میں تھے، ایک سے بڑھ کر ایک، ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، پاچا خان، دوسرے تیسرے اور اور بہت، مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ہی کہاں رکھتی ہے، یہ سب جناح کے دماغ کا خناس ہے، رفتہ رفتہ وہ جو ایک آمیزش سی تھی آویزش میں بدل گئی، مسلمانوں کو غاصب ٹھیرا قرار دیا گیا، اجنبی اور بیگانہ سمجھا گیا، دوسرے لفظوں میں ان کے وجود کی نفی کی گئی، بات چند مطالبات سے بڑھ کر لینی جھوٹے سے محل تک پہنچی اور مسلمان نے اپنا الگ ایک ملک بنا لیا، پاکستان، مغربی پاکستان مشرقی پاکستان، بیچوں بیچ ایک ہزار میل ہندوستان، رشتہ اسلام کا تھا دوری کیونکر مانع آتی، ہم ایک تھے ہم ایک رہے، آگے چل کر جوں جوں مذہبی بیگانگی بڑھی، اقتصادی عدم توازن ناقص کارکردگی بڑھتے گئے، فاصلے نظر آنے لگے، بات چیت مفاہمت مصالحت پس پشت ڈالے گئے، تعصب تنگ نظری حق تلفی تشدد کارفرما ہوئے، جس دن ڈھاکہ امیر عبدالصمد خان نیازی کے ہاتھوں جگجیت سنگھ اروڑا کے زیر نگیں آیا محمد ایوب قادری کے منہ سے بے اختیار نکلا، میں اس دن کے لئے ہی زندہ رہا تھا،

ابا مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی نے ۱۹۳۳ء میں "نالۂ صحرا" کا ڈول ڈالا، اس سہ ماہی جریدے کا ایک ہی پرچہ نکل کر رہ گیا مگر اس کی یاد ہنوز باقی ہے، سن انیس سو اکسٹھ باسٹھ میں میں نے ابا کے جیتے جی تاریخ کو دہرانا چاہا، ابا نے کہا نالۂ صحرا پرانی باتیں ہیں اب تم "رنگ و تاک" کے نام سے اپنی راگنی چھیڑ سکتے ہو تو چھیڑو، سرکار دربار میں اجازت نامے کی تحریک کر دی، لہذا کر دی گئی، خفیہ پولیس اور ضلعی پولیس سب کی رپورٹ اچھی ہوئی، لیکن اجازت نامہ تو جیل کا نمونہ ہو کر رہا، رسید تک نہ ملی، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کیوں نہ کہوں اجازت نامہ اب سمجھے کا بھی کون، انگریز ہزار دشمن سہی، کہتے ہیں کھوٹے کھرے ایسے ویسے نہیں بڑے بڑے کام ہو جاتے تھے، اب ان باتوں کی یاد باقی رکھی جا رہی ہے، جیسا تو ہر عیب ہنر ہے اور آپ دم نہیں مار سکتے، محمد ایوب قادری اس زمانے میں بھی اتنا کچھ تھے کہ میں نے ان سے مضمون طلب کر لیا تھا، مضمون کیسا وہ تو جوا، ابا ہر طرح کا ساتھ دیتے پیر تل گئے تھے، ہم سے کچھ بن ہی نہ پڑا

تو وہ کیا کرتے؟ بعض مقاصد سے مسلسل اور دلچسپی بھی اتنی بے پناہ تھی کہ بالکل غث ہو کر رہ گئے تھے۔
اس لیے ان کی چھاپ نہ بن پائی کہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے ان کا کوئی اسلوب نہ تھا۔ بس سیدھے سادے
شریف آدمی کی طرح چلے جا رہے ہیں، کام سے کام۔ گٹھلیاں گننے میں وقت برباد ہی تو ہوتا ہے۔ موضوع انہوں
نے مخصوص کر لیا تھا "تذکرہ و سوانح" اور وہ اس میں کسی سے پیچھے تو یقیناً نہیں رہے تھے۔ کسی کا نام لینے کی
دیر تھی، معروف اور نیم معروف کی قید کہیں نہیں، وہ صفحات پیشتر گن گن کر رکھ دیتے تھے اور کہیں کہیں کبھی کبھی
ذاتی گفتگوؤں میں یہ گن کر بھی دو چار نام ہوں تو گن کے بتا بھی دوں چالیس پچاس تذکرے تو ہوں گے
ہی، ماخذ ان کے دماغ میں بھرے رہتے تھے۔ گہرائی اور جستجو کا سلسلہ لامتناہی ہونے کے باوجود بڑا
دلکش تھا ان کے لیے، وہ تحقیق ہی کیوں تنقید کا حق ادا کرنے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے۔ "تحقیق"
کے نام سے ایک رسالے کا اجرا بھی ایک منصوبہ کاغذات پر تو وجود میں آ گیا تھا۔ بے تکلف دوستوں سے
سالانہ چندے بھی طلب کیے گئے، میں سمجھتا ہوں کسی بڑے دفتر کے سرخ فیتے میں بات اٹکی ہوگی۔ قاضی
عبدالودود ہمارے قادری صاحب کے محبوب ترین اور مثالی محقق تھے۔ ایک مجموعہ "غالب اور عصر غالب"
کے نام سے بھی چھپا۔ اردو لکھنے والا غالب سے بچ کر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ "کاروانِ رفتہ" خاکوں
کا مجموعہ ہے، لیکن مزاج وہی تذکرہ و سوانح سے ملتا جلتا۔ لوگ باگ تو ایک آدھ کتاب چھپوا کر زندہ
جاوید ہو جاتے ہیں جب تک اردو ہے قادری نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

ابا مرحوم نے ورثے میں ایک تو مجھ نکما اور شادی شدہ صاحب اولاد چھوڑا، اس کے علاوہ
زرعی جائداد اور خاصے کی چیز ایک کتب خانہ۔ میری خانہ ویرانی دیکھ کر قادری مرحوم ہنسا کرتے تھے اور
کہتے تھے "شاہ جی بس موٹر اور پیری فقیری رہ گئے ہیں آپ کے پاس، باقی اللہ اللہ خیر سلا"۔ وہ خود ساختہ
آدمی تھے، اپنی کمائی محنت اور مشقت سے ذاتی دو منزلہ مکان ناظم آباد میں بنا لیا تھا بلکہ میں نے
یہ بھی تو سنا ہے نہایت قلیل آمدنی کے باوجود حیدر آباد سندھ کے دوران قیام میں ایک چھوٹا سا مکان کھڑا کر
لیا تھا۔ ناظم آباد میں اوپر کی منزل میں خود رہتے تھے اور کتابیں آباد تھیں، نیچے کا حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا۔
نمود و نمائش سے کوسوں دور رہتے تھے، وہ اپنے چھوٹے موٹے بستر اور سفری ساز و سامان کو معمولی رسیوں
سے باندھ کر بغل میں داب لیتے اور کندھے پر اٹھائے لیے لیے پھرنے میں کسی قسم کی توہین اور ذلت محسوس

نہیں کرتے تھے۔ بغیر کسی امتیاز کے اپنے امیر ہوں غریب ہوں بھی رشتے داروں ہی نہیں عام قاریوں سے بھی ملتے رہتے تھے اور ٹوٹ کر نہ دن دیکھتے نہ رات نہ سردی نہ گرمی، موٹر، ریل، بس، پیدل ہر طرح کے سفر کر لینے میں عار نہ تھا گھر در بھی نہیں تھے بھلے مانس اور عجز و انکسار میں گندھا ہوا مزاج، بڑی حد تک متوکل بھی ان کی جمع پونجی اہل و عیال کی راحت اور آسائش اور چونکہ کتابوں کے دیباچے محصول کتب پر خرچ ہوتی رہتی تھی، ایک بار کراچی میں مجھے ضرورت پڑی تھی تو چھ سو روپے ان کی جیب سے نکلوانے میں ناکام رہا تھا، کتابوں کا چھاپنا بچپن اور طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا اپنی کتابوں کی نمائش بھی طالب علمی کے زمانے میں لگانے کا تجربہ کر چکے تھے، ان کا پیشہ بالآخر معلمی قرار پایا، اردو کالج اور پی ایچ ڈی کے بعد جامعہ کراچی سے متعلق ہو گئے تھے، پرخاش طالب علموں کو ان سے بھی ہو جاتی تھی، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے، پی ایچ ڈی میں ان کے مقالے کا عنوان تھا "اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ" قادری مرحوم کا قلم میرے سامنے دیکھتے دیکھتے جوان ہو گیا تھا،

خط ان کا کاتبانہ منشیانہ نہیں تھا، کچا بھی نہیں تھا، پختہ پختہ سا تھا، یہ علامت اگلے وقتوں میں تو پڑھے لکھوں کی ہی تھی، اب وہ زمانے نہیں رہے، دانشور لکھتا کیا رہے، بولے چلا جاتا ہے، بولے چلا جاتا ہے، مختلف آلات کے منہ کھلے رہتے ہیں، آوازیں قید ہوتی رہتی ہیں، جس کا جب جی چاہے کان مروڑے اور بار بار سنے چاہے تو نقل کرے، قادری مرحوم یوں تو راہ چلتے کتابیں پڑھا اور بسوں میں بیٹھ کر عام خط وغیرہ لکھ کر وقت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کیا کرتے تھے اور ضرورت پڑے تو پوری پوری کتابیں نقل کر لیتے تھے لیکن ٹھوس علمی کاموں کے لیے یکسوئی اور دلجمعی چاہیے تھی، قلم برداشتہ لکھنے پر دسترس ضرور رہی ہو گی لیکن میری بیاض وہ اپنے بھائی ابو معاویہ سے یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں لے گئے کہ یار تم شور بہت مچاؤ گے اور مجھ سے لکھا نہ جائے گا، وہ دو چار سطریں میری تحریروں میں ہیں بس اتنا بتا دینا کافی ہے، مرحوم بے کار کے اختلافی اور سماجی دباؤ سے آزاد رہ کر لکھنے کو ترجیح دیا کرتے تھے، مصلحت اور تخویف سے دور رہنے میں عافیت ہے یہ ان کا انداز فکر تھا، میری خاکہ نگاری کو بہت اچھالتے تھے، مس فاطمہ جناح کے سلسلے میں میرے معذرت خواہانہ لہجے پر مجھے جھڑکتے ہوئے کچھ یوں لکھا تھا، یار تم بڑے دبو ہو گئے بات پر کیا گھبرانا اور کاہے کا ڈر ماننا، لکھنے پڑھنے کے شوق نے اتنی قوت بھر دی تھی کہ سرکاری نوکری پر لات

مارکر پاکستان پیسٹار ریلیل سوسائٹی سے منسلک ہو گئے۔ قادری مرحوم کی خداداد صلاحیتوں کو مزید ابھارنے اور زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے میں ڈاکٹر معین الحق اور سید الطاف علی بریلوی کا بڑا ہاتھ تھا۔ مولوی عبدالحق کے کتب خانے تک بھی بچارے قادری صاحب کی رسائی تھی۔ اچھے لوگوں کی پیشوائی کے لئے اچھے ہی لوگ ہر جگہ تیار رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں اور خردوں سے قادری مرحوم کا معاملہ بھی یہی تھا۔ نئے لکھنے والوں کو سر پر چڑھانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ میرا حوصلہ انہوں نے طرح طرح سے بڑھایا۔ اردو دنیا میں آپ کی تحریروں کا بانکپن چھین لینا بہتوں کو آتا ہے اور یہ عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔ قادری مرحوم پر بھی ڈاکے پڑتے رہے۔ لکھا انہوں نے اور چھپا کسی اور کے نام سے۔ وہ مجھ پر زور ڈالتے رہے کہ ایک کتاب یار تم لکھو جس کا نام ہو "یہ کون ہے مصنف"۔ قادری مرحوم اچھے محقق تھے۔ بہر حال اور آگے چل کر سو فیصدی کھرے ہونے کے موٹے موٹے جراثیم ان میں موجود تھے۔ ان کی طالب علمانہ زندگی نے طالب علموں کے لئے بہت سے راستے کھول دیئے ہیں۔ وہ بہت زور دے کر کہتے تھے۔ محقق کے لئے بنیادی طور پر طالب علم اور متشکک ہونا چاہئے۔ اسی طرح اگر آپ غزل یا مثنوی کا کوئی قدیم نسخہ مرتب کر رہے ہیں تو عروض یعنی قافیہ، ردیف، علم بیان، صنائع بدائع پر مکمل عبور ہونا چاہیے۔

آنولہ ضلع بریلی، بدایوں، دادو سندھ، حیدرآباد سندھ سے ہوتے ہوئے کراچی آ پہنچے۔ کراچی کی معاشرتی زندگی میں وہ نمایاں ہو چلے تھے۔ مختلف تقریبات میں بلایا جاتا۔ اسی بات کی علامت بھی موضوعات پر اظہار خیال کرنے کے مواقع بھی فراہم ہونے لگے تھے۔ ویسے ان کی تقریر نہیں سنی۔ کسی نے لکھا ہے۔ برجستہ کہتے تھے برملا کہتے تھے برمحل اور مدلل کہتے تھے۔ البتہ خطیبانہ جوش و خروش ناپید تھا۔ آواز ان کے حلق سے کسی کسی وقت ایک طرح سے اٹک کر ڈوب کر اور دب کر نکلتی اور لطف دے جاتی تھی۔ وہ مجھے بے حد اپنا جانتے تھے اور بعض فرمائشیں بڑی بے تکلف کر ڈالتے۔ مثلاً لکڑی بھجوا دو، کرسیاں بنوا ڈالوں گا۔ میں نے کچھ گنے ان کے ہاں۔ کبھی کبھار تعمیل ارشاد بھی ہوئی۔ وہ خود تو آتے ہی رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی ہمارے گاؤں سعید آباد کی سیر دیکھ چکے ہیں۔ چار چار سو میل کا سفر کر کے کون یونہی کسی کے پاس ایسے ویرانوں میں جاتا ہے۔ ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ میں نے نادر مخطوطات بغرض اخذ و استفادہ ان کے حوالے کرنے میں کبھی کوئی گڑبڑ کسی الجھن کا سامنا نہیں کیا۔ مرحوم کا ایک بچہ ذہنی اعتبار سے بے انتہا معصوم اور

ہم سخن تھا ہفتوں کی خاموشی کو ایک بار اُس نے یہ کہہ کر توڑا کہ "بابا میری شادی کرا دو" یہ بات مجھ سے چھپائی نہیں، بچے کی ذہنی کیفیت بحال ہو جائے یہ مشورے کرتے رہے، بیٹی کی شادی پر بھی میرا بلایا جانا ان کو یاد رہا بابت تعلق خاطر کی ہوا کرتی ہے، وہ جو مجھ پر "رنگ تاک" جاری کرنے اور گویا نیاز فتحپوری سے مسند ادارت چھین لینے کا خبط سوار ہوا تھا، قادری مرحوم نے میری کیا کیا ہمت افزائیاں کی تھیں بہت یاد آتی ہیں، انہوں نے یہ بھی نہیں کہا چھوڑو میاں یہ کھیل کوئی بچوں کا تھوڑے ہی ہے،

کوئی عاشقانہ افتاد بھی پڑی ہو ان پر یہ پوچھنے کا خیال ہی نہ رہا، فاسقانہ کی ان سے امید نہیں کی جا سکتی، آدمی تو معقول تھے، زخم جگر کھائے بیٹھے، کیونکہ یہ کسی محرم راز سے پوچھا ہوگا، شادی کا مرحلہ میں سمجھتا ہوں نو عمری میں طے ہوا ہوگا، میرے بچوں کے ہم عمر ہی نکلیں گے ان کے بچے، میرے تجربات تو نو عمری ہی میں اسیر زلف جاناں ہو جانا لگا تھا یہ اوروں کے ساتھ بھی ہوا ہو تو کوئی نئی بات تو نہیں ہوگی، فرشتہ آدمی بیویوں سے بھی تو عشق کیا کرتے ہیں اور بچوں سے اور زیادہ، قادری مرحوم کوچہ جاناں کی خاک اڑانے میں خدانخواستہ اگر گور رہے تو یہ تو کچھ اچھا نہ ہوا،

پالی، سنسکرت، عربی، فارسی جاننا اردو جاننے کے لئے ان کا خیال تھا کہ ضروری ہیں، اقبال نے لکھا ہے لسانی تعصب مذہبی تعصب سے کم نہیں ہوا کرتا برابر سرابر ہی رہتا ہے، کراچی کی اردو تحریک قادری مرحوم بھی رنگیلا چوک کے مظاہروں میں تحفظ اردو میں پیش پیش تھے اس تحریک میں ان کے برادر نسبتی کا مکان بھی جلا اور عام اردو والوں پر ایک خاص افتاد بھی پڑی مگر ایسی نہیں جیسی قیامت افغانیوں نے پچھلے دنوں اورنگی، علیگڑھ کالونی اور دوسرے مقامات پر توڑی، بیچارے ابو سلمان شاہجہانپوری کا پورا کتب خانہ جلا کر خاکستر کر دیا گیا، میری سمجھ میں نہیں آتا کتابوں کے بغیر وہ زندہ کیونکر رہیں گے، قادری مرحوم چاہتے تھے "اردو دنیا بحیثیت قوم تسلیم کرلی جائے" ایک استقبالیہ تحریر میں نے اپنے رنگ کی بھجوائی تو بہت خوش ہوئے اور داد دی، "میں نمایاں ہوتا ہوں تو کیوں نہ یہاں نقل بھی کر دوں" دل لگی ہی سہی۔

شاہجہاں آباد   دہلی   دلی

ایک ہی سہاگن کے تین نام

اس کی مانگ کا سیندور، دور دور بہت دور، رنگوں میں زیارت گاہ فکر و نظر

اور پناہ گاہِ اہلِ دل ہے

وہ کلیسا اب ہمارے لئے کعبۂ دلی سے کم نہیں

لکھنؤ

اک نگارِ آتشیں رخ کی فتنہ سامانیاں اور حشر خیزیاں

ایک ہی تصویر کا دوسرا رخ

ایک اور تصویر

اس کی ضوفشانی کا عالم دیدنی ہے

یو پی — سمٹا کراچی کہلایا اس کی بہار دائمی ہے

سندھ — روزِ ازل سے صوفیوں اور سرمستوں کی جولانگاہ رہا ہے

پنجاب — نے ہمیشہ اپنی زرخیز کوکھ سے بہت بڑی تعداد میں جوہر

قابل پیدا کئے

قحط الرجال کی شکایت کبھی نہیں سنی گئی

سرحد — خوش حال خان کی خوش حالیاں اور خوش نوائیاں

روح میں ہر گھڑی اپنا افسوں پھونکتی رہتی ہیں

بلوچستان — کی شجاعت حمیت اور شرافت زبان زدِ عام ہے

ایک نام اور رہ گیا اُسے رہنا ہی چاہئیے تھا — بہاولپور

آہ — بہاولپور

مرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

خستہ و زبوں پژمردہ رنگ رسیدہ بو اس کی

تہذیب اس کا تمدن اس کی زبان اس کی روایات

اس کے شاعر، اس کے صوفی، اس کے رند، اس کے رہزن اور لٹیرے
اس کے عاشق، اس کے معشوق، اپنا ایک علیحدہ اور مستحکم وجود
رکھتے تھے، رکھتے ہیں مگر زمانے کی ستم رانی نے زندہ درگور کر دیا

نقشِ ہستی پر ان کا نام رہ جائے اس میں بھی
شک ہے، اس خاکستر میں ایسی کوئی چنگاری بظاہر
نہیں رہی جو دلوں کو گرما اور برما سکے، روحوں کو
تڑپا سکے، روتی اداس اور اس کے دامنِ دل
میں خوابیدہ آگ کی روح بے قرار ہے، بہاول پور کے
حیوانِ ناطق نامرادی، حزن و ملال کی ایک
بے رنگ اور فرسودہ کہانی بنے جاتے ہیں، اپنے حال
پر نوحہ کناں اور مرثیہ خواں

یہ جملہ گو معترضہ تھا مگر اس سے صرفِ نظر
بھی گوارا نہ ہوا

کہنا یہ تھا
دہلی، لکھنؤ اور ان کے اطراف و جوانب لولی
کراچی، سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان — بہاولپور
اس مرقعے کا نام آپ کو معلوم ہی ہے — پاکستان
اس دبستانِ رنگ و بو، اس چمنستانِ کیف و سرور
کی بہار — سرزمینِ
محمد آباد
کا مقدر بن جائے، خدا ساز بات ہے

رئیس الشعرا ـــــ رئیس امروہوی

عالم پناہ ـــــ سراج الدین ظفر

ابو المزاح ـــــ سید محمد جعفری

سراپا غزل ـــــ ثریا ذبیا

غنچۂ دل کھلا جاتا ہے اور اس عالم

سرمستی میں اے ہم نشیں

وصالِ یار کی مسعود ساعتیں مت پوچھ

مست و سرشار

انیس

۱۹/اکتوبر ۱۹۷۱ء

سراج الدین ظفر مرحوم نے اِس استقبالیے کو بڑے غور سے پڑھا، بولے کچھ نہیں، اور اب تو بات بہاولپور سے نکل کر سرائیکی صوبے تک پہنچی ہے

ع دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

قد کاٹھ چھوٹا سا تھا، اسی رعایت سے حیرت شملوی کی بیشتر غزلیں چھوٹی بحر میں زیادہ ہیں

ایک غزل بہت پسند کی گئی تھی، یہ چھوٹی بحر میں بہرحال نہیں ہے

غزل

کیوں ہوں نہ مغفرت کا طلب گار بھی بہت
بیمار بھی بہت ہوں گنہگار بھی بہت

سنگیں ہے سزا تو کسی سے کہیں بھی کیا
یہ دیکھ کر کہ ہم ہیں خطاکار بھی بہت

اچھا ہوا کہ آپ الگ ہم سے ہو گئے
الفت کی ورنہ راہ تھی دشوار بھی بہت

ہم پر غرورِ عشق کی تہمت بجا مگر
ہے بے نیازِ حسن کی سرکار بھی بہت

ہے یہ بھی واقعہ کہ صداقت کے نام پر
باندھے گئے ہیں جھوٹ کے طومار بھی بہت

کچھ اہلِ قافلہ ہی نہیں مست و بے خبر
بہکے ہوئے ہیں قافلہ سالار بھی بہت

حیرت نیاز مند تو ہے آپ کا ضرور
لیکن نہ بھولیے کہ ہے خوددار بھی بہت

لکھنؤ کے جناب افقر موہانی نے اس پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے اپنے شاگرد زہیر کنجاہی کے نام لکھا

"حیرت کی غزل مجھے بالکل پسند نہ آئی، اولاً اغلاط کا مجموعہ اس پر طرہ معانی و مطالب کا فقدان، بس غزل ہے اور خوب ہے"

میں نے غزل اور افقر صاحب کی رائے دونوں اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر کے پوچھ گچھ کی تو قادری صاحب نے لکھا

"حضرت حیرت مرحوم کی غزل میرے خیال سے ہر نقص اور سقم سے پاک ہے"

قادری مرحوم کی شاعرانہ بصیرت کا اندازہ آپ اس مختصر جملے سے کر سکتے ہیں

میرا ان کا ساتھ ہفتوں مہینوں برسوں کا نہیں تھا، یوں تو ہم جب بھی طویل وقفوں کے بعد ملتے تو خوب گھل مل کر ملتے تھے، میرا قلم بات بے بات چلتا رہتا ہے، خط نویسی کی چھیڑ نے مجھے خاصا بدنام کر رکھا ہے، لکھتے رہنے سے فاصلے ذرا سے سمٹ جاتے ہیں، یہ میرا خیال ہے، محمد ایوب قادری اپنی ہی گوں کے آدمی تھے ہمارے ہی قافلے کے لوگ تھے، ان کے جانے سے ہم نے یہ جانا موت اب ہماری صفوں میں بھی چیرہ دستیوں پر اتر آئی ہے، اب ہماری باری ہے، وہ تو آکر رہے گی، ٹلنے کی نہیں، سب جانتے ہیں، سبھی سمجھتے ہیں، ہر شخص جانتا ہے، بڑا چھوٹا سیٹھ کا اور وقت کا، ہم اپنے پیاروں کا ماتم بھی جی بھر کے نہیں کر سکتے، گڑھا گھٹتا تو رہتا ہے آدمی یہ بچھڑنا دو چار برسوں کی بات نہیں، روزِ جزا کا انتظار قیامت سے کم تو نہیں، قلم اور کاغذ جب تک ہاتھوں میں ہیں ذی علم پیاروں کی کمی جگہ جگہ محسوس ہوتی رہے گی، قادری صاحب موٹر نشین نہیں تھے، رکشہ ٹیکسی بھی بہت مہنگے پڑتے ہیں، بسوں سے کام چلاتے تھے، سوزوکی ویگن کے بدحواس ناخدا نے کشمکشِ انتظار اور کشاکشِ روزگار سے ٹکر مار کر آزاد کر دیا، یوں بھی کراچی کے سارے راستے عدم ہی کو جاتے ہیں،

۱۹۸۷ء

"آدمی غنیمت ہے"

دیوان حیرت شملوی   والسلام والاکرام

کے بعد

حضرت رئیس امروہوی کی معیت میں دلی کے پھیرے کا ذکر پڑھیے گا

عنوان ہے

"سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان"

صرف کشمیر ہی کیوں پورے کا پورا ہندوستان مقبوضہ کہیئے

اس کے علاوہ

خودنوشت

حضرت امیر حمزہ شنواری

اور

روزنامچہ رئیس امروہوی

بھی آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرنے

کے ارادے کچے نہیں پکے ہیں



بسم اللہ

اک ذرا سی تحریک پہ یوں ہی محض خوش گپیوں میں، اُٹھا کر دس ہزار روپے میرے حوالے کر دیئے اور کہا، تم تو اپنی کتاب چھاپو، ہمارا کیا ہے پیسہ ہاتھ کا میل ہے، آتا رہتا ہے جاتا رہتا ہے، روپے پیسے کی دھول اُڑانا کچھ ہنسی دل لگی تو نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ

خان افضل خاں میتلا

(بستی شیر خان میتلا تحصیل صادق آباد)

کا دل گردہ یہی ہے، میں لاکھ کہتا ہوں، بھائی! عشق کو احتیاط لازم ہے مگر وہاں کون سنتا ہے، جو کچھ ہے بس لٹائے چلے جاتے ہیں، انہی سخاوتوں میں ہمارے تحریر کردہ خاکے چھپ رہے ہیں، برسوں سے پڑے سڑ رہے تھے۔

۱۹۹۳